اُردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، فیکلٹی آف لینگویجز میں پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) اُردو

2018

مقالہ نگار

Tabassum

تبسم بانو شاہ

نگران

ڈاکٹر محمد جمیل

پروفیسر و صدر

شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (پنجاب)

CANDIDATE DECLARATION

I, Tabassum Banoo Shah certify that the work embodied in this Ph.D thesis is my own bonafide work carried out by me under the supervision of Dr.Mohammad Jameel from August 2015 to December 2018 at Department of Persian, Urdu & Arabic, Punjabi University, Patiala. The matter represented in this Ph.D. Thesis has not been submitted for the award of any other Degree or Diploma in any other institute.

I declare that I have faithfully acknowledged, given credit to and referred to the research workers wherever their works have been cited in the text and the body of the thesis. I further certify that I have not wilfully lifted up some other's work, paragraphs, text, data, results etc. reported in the journals, books, magazines, reports, dissertation, thesis etc. or available at websites and included them in this Ph.D thesis and cited as my own work. I also declared that I have adhered to all principles of academic honesty and integrity and have not misrepresented or fabricated or falsified any idea/data/fact/source in my submission. I understand that any violation of the above will be cause for disciplinary action by University.

Tabassum

Date. 28-12-18

Place : Patiala

Tabassum Banoo Shah

Research Scholar

This is to certify that the above statement made by the candidate is correct to the best of my knowledge.

Dr.Mohammad Jameel
Professor & Head
Deptt. Of Persian, Urdu & Arabic
Punjabi University, Patiala, Punjab

انتساب.........

اپنے والدین اور شفیق نگران ڈاکٹر محمد جمیل کے نام
جن کی کوششوں اور دعاؤں سے مجھے کچھ لکھنے کا شعور مِلا

ترتیب

پیش لفظ

پنجاب ہندوستان کے شمالی مشرق میں واقع ہے۔لفظ ''پنجاب'' جو کہ فارسی زبان کے دو الفاظ ''پنج'' اور ''آب'' کا مرکب ہے جس کا مطلب ہے ''پانچ پانیوں کی دھرتی''۔ پنجاب ایک مشترکہ تہذیب و کلچر کی علامت ہے اور اس مشترکہ کلچر میں صوفیوں، سنتوں اور سِکھ گورو صاحبان نے اہم کردار نبھایا ہے جیسے بابا فرید، بُھلے شاہ، شاہ حسین وغیرہ تھے۔ اِس خطہ میں آباد ہندو، مسلم، سِکھ اور عیسائی سب مل جل کر پنجاب کے مشترکہ کلچر کو آپسی رواداری اور آپسی بھائی چارگی کے ساتھ پروان چڑھا رہے ہیں۔ پنجاب کے مشترکہ کلچر نے ہندوستان کو پنجابی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان سے بھی مالا مال کیا۔ جس کے متعلق اکثر ماہرینِ لسانیات کا قول ہے کہ اُردو کی اصل جائے پیدائش پنجاب ہی ہے یہاں تک کہ محمود شیرانی کے نظریے کے مطابق ''اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی'' ۔پنجابی اور اُردو زبان میں کثیر الفاظ مشترکہ پائے جاتے ہیں۔

پنجابی زبان و ادب میں ناول نگاری کا آغاز پنجاب سنگھ سبھا تحریک کے زیرِ اثر ۱۸۹۹ء میں ہوا۔ پنجاب کے پہلے ناول نگار بھائی ویر سنگھ ہیں جن کے ناول ''سندری'' کو پنجابی ناول کا نقشِ اوّل قرار دیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں کئی ناول مختلف زبانوں سے درآمد یا ترجمہ ہوئے ہیں جیسے فارسی، عربی، انگریزی، پنجابی، کشمیری وغیرہ زبانوں سے۔ اسی طرح سے پنجابی سے بھی کئی ناول اردو زبان میں ترجمہ کئے گئے ہیں جیسے سفید خون (نانک سنگھ)، گوری (اجیت کور)، پنجر (امریتا پریتم) وغیرہ۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ 'اردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ' لیا جائے۔ ان کا تنقیدی جائزہ زبان و اسلوب، تاریخی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی پسِ منظر کے حوالے سے پیش کیا جائے تا کہ ہمیں اس بات کو سمجھنے کا بھی موقع ملے کہ ان پنجابی ناول

نگاروں نے اپنے ناولوں میں کس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ میں نے اس موضوع کو بخوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے۔موضوع کومدِنظر رکھتے ہوئے میرا یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اُردو ناول کا پس منظر میں اُردو ناول کے فن اور اُردو ناول کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصے میں پنجابی ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں جو ناول اُردو سے پنجابی میں ترجمے ہوئے ہیں ان ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ان ناولوں میں قراۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی'' اور پریم چند کا گئودان پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

تیسرے باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا جس میں پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ تین شاہکار پنجابی ناول جن میں نانک سنگھ کا سفید خون' امرتا پریتم کا پنجر اور اجیت کور کا گوری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارناموں پر ذکر کیا گیا ہے جن میں پنجابی کے تین ناول نگاروں جن میں نانک سنگھ' امرتا پریتم اور اجیت کور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ترجمہ شدہ ناولوں کے موضوعات کے حوالے کے ساتھ ساتھ ناولوں کا تہذیبی وثقافتی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے اور آخری حصے میں زبان و بیان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں حاصل مطالعہ کے تحت سارے مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور کتابیات میں کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جو راقمہ نے دوران تحقیق جن کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

بہرحال اس تحقیقی مقالے کو پایہ تکمیل تک پہچانے کے لیے میں سب سے پہلے ربِ کائنات کا شُکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے اس راستے کی طرف گامزن کیا اور اس تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں میری مدد فرمائی ۔اس کے

ساتھ محمد ﷺ کی بارگاہ میں شکر گُزار ہوں جس کی اُمت کا میں حصہ ہوں۔اس کے بعد میں اپنے شفیق نگراں جناب ڈاکٹر مُحمد جمیل پروفیسر وصدر شعبہ فارسی' اُردو اور عربی کی تہہ دل سے شُکر گذار ہوں جن کی رہبری میں تحقیق کا یہ سفر طے کیا علاوہ ازیں قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔اس کے ساتھ اپنے شعبہ کے اُستاد جناب ڈاکٹر رحمٰن اختر اور محترمہ ڈاکٹر روبینہ شبنم کی بھی شُکر گذار ہوں جنہوں نے ہمیشہ قیمتی مشوروں سے نوازہ۔

اس تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہچانے کے لیے میں نے جن تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں کی لائبریریوں سے مواد حاصل کیا ان میں بھائی کاہن سنگھ نابھہ لائبریری پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔راجندر سنگھ بیدی لائبریری شعبہ فارسی' اُردو عربی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ' جموں یونیورسٹی' کشمیر یونیورسٹی' نواب شیر خان انسٹی ٹیوٹ مالیر کوٹلہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ان تمام اداروں کے جملہ اراکین کی بھی شکر گُزار ہوں اور خصوصی طور پر ڈاکٹر روبینہ شبنم کی شُکر گذار ہوں جنہوں نے ہمیشہ مجھے قیمتی مشوروں سے نوازہ۔

اس کام کو پایہ تکمیل تک پہچانے میں سب سے پہلے میرے والدین محترم بشیر احمد شاہ و آمینہ بیگم کی شکر گزار ہوں جن کی دُعاوں اور محبتوں کے ساتھ میرا یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔اس کے علاوہ میرے چچا جان انجینئر لیاقت علی شاہ جن کی ہر وقت کی حوصلہ افزائی سے میں یہ کام مکمل کر سکی۔اس کے علاوہ میرے بھائی ایڈوکیٹ شاہ منظور' ساقب بشیر' مدثر لیاقت' مزمل لیاقت اور شاہد حُسین سروڑی کی شُکر گزار ہوں خصوصاً میری بہنیں خالدہ' مہرین' صاحبہ' فرحت کے ساتھ ساتھ ننھی کلیاں زیان سروڑی اور زیّت فاطمہ ان سبھی افراد خانہ کی محبتوں کو سلام کرتی ہوں اور ان کے تعاون کا اقرار کرتی ہوں۔

تحقیق کے مراحل میں جن اسکالروں اور ادیب دوستوں نے تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں تعاون کیا ان میں جناب سالک جمیل براڑ' ڈاکٹر اوصاف قریشی' منظور احمد' عرفان احمد' عابد اقبال' مدثر رشید' فردوس احمد وغیرہ کی شُکر

گذارہوں۔آخر میں میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سبھی اراکین کاشُکر یہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میری تحقیق کے دوران تمام معاملات کوخوش اسلوبی اورافکار کے ساتھ پورا کیا۔

میں اپنے اس تحقیقی کام کواپنے داداجان مرحوم عبدالغنی شاہ اورناناجان مرحوم غلام رسول وانی کے نام موسوم کررہی ہوں جن کی زندگانی میں اگر یہ کام کرنے کی حسارت کرلیتی تو سب سے زیادہ خوشی اُن کو ہوتی لہذا اس ادبی سفرمیں ان کا نام فراموش نہیں کرسکتی

مقالہ نگار

تبسم بانوشاہ

Abstract

اُردو اور پنجابی کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق اردو کا جنم پنجابی زبان سے ہی ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو نے پنجاب کی ہی پُرسکون فضا میں پرورش پائی ہے۔ جس کی مثال اردو اور پنجابی کے بے شمار الفاظ، تراکیب اور محاورے ہیں جو مشترکہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اردو اور پنجابی کے آپسی میل جول کی ایک اہم مثال شاہ مکھی ہے۔ پاکستان میں آج بھی کروڑوں لوگ پنجابی اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں جسے شاہ مکھی کہا جاتا ہے۔ آزادی سے پہلے پنجاب اردو زبان و ادب کا گہوارہ تھا۔ لیکن آزادی کے بعد پنجاب کی تقسیم نے اس خطّے کا سماجی، معاشی اور ثقافتی نظام ہی درہم برہم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اردو اور پنجابی کا رشتہ بھی کمزور ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن آج پنجابی والوں کے لئے اردو اور اردو والوں کے لئے پنجابی غیر زبان نہیں ہے۔ اُردو اور پنجابی کو مقبولِ عام کرنے کے لئے ترجمہ نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی اردو کی شاہکار کتب کا پنجابی اور پنجابی کی شاہکار کتب کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ نگاری کا یہ کام کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ دونوں زبانوں کی ہر صنف کی شاہکار کتابوں کا ترجمہ ہو رہا ہے۔

راقم الحروف نے ''اردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''اردو پنجابی ناول کا ارتقائی پس منظر'' ہے اس باب میں اُردو اور پنجابی ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ''اُردو سے پنجابی میں درآمد اہم ناول'' ہے۔ اس باب میں اردو سے پنجابی میں ترجمہ شدہ تین شاہکار ناول جن میں قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی اور پریم چند کا گئو دان کا تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ کا تیسرا باب ''پنجابی سے اُردو میں درآمد اہم ناول'' ہے۔ جس میں پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ تین شاہکار پنجابی ناول جن میں نانک سنگھ کا سفید خون، امرتا پریتم کا پنجر اور اجیت کور کیا گوری کا تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم کا عنوان ''مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارنامے'' ہے جس میں پنجابی ناول کے تین اہم ناول نگاروں مثلاً نانک سنگھ، امرتا پریتم اور اجیت کور کا تفصیلی طور پر سوانح خاکہ اور ان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب کا عنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ جسے تین مختلف عنوانات کے تحت ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ضمنی باب بعنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ: موضوعات کے حوالے سے'' ہے۔ دوسرے ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخری ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے زبان و بیان پر گفتگو کی گئی ہے۔

کہانی داستان، ناول، افسانے سے ہوتے ہوئے افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ناول نگاری کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ناول آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ جہاں تک پنجابی ناول کی بات ہے تو یہ حقیقت ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ دِن

بہ دِن بڑھتا جارہا ہے۔ ماضی میں پنجابی ناول پنجاب تک محدود تھا لیکن آج ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ وغیرہ تک پھیل گیا ہے۔

امید ہے کہ میرے اس مقالے سے جہاں ناول نگاری کی صنف کو تقویت ملے گی۔ اردو اور پنجابی ترجمہ نگاروں نے اردو سے پنجابی اور پنجابی سے اردو میں شاہکار کتب کو ترجمہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہندوستان کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے مسائل، جذبات اور احساسات سے واقفیت بھی ہوگی۔

کی نوٹ(Key Note): اردو، پنجابی، مقالہ، ناول، ترجمہ نگاروں۔ ☆☆☆

باب اوّل:

اُردو پنجابی ناول کا پس منظر

۱۔ اُردو ناول کا پس منظر

۲۔ پنجابی ناول کا پس منظر

اُردو ناول کا پس منظر

اُردو ناول کا پس منظر

قصہ جب خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں گُم تھا تو داستان کہلایا اور پھر جب خوابوں اور خیالوں کی طلسماتی دنیا سے نکل کر حقیقت نگاری کی طرف آیا تو ناول کہلایا، گویا ناول داستان ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اِس کے بعد داستان کی طوالت اور مافوق الفطرت عناصر کو خیر باد کہہ دیا لیکن بہرحال اس کا بنیادی عنصر قصّہ باقی رہا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ قصّے کے بغیر فکشن کا تصّور ممکن نہیں البتہ ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ یہی حقیقت کی ترجمانی کے لئے استعمال ہونے لگا اور اس کا بدلا ہوا روپ ناول کہلایا۔ بقول ڈاکٹر اسلم آزاد:

> ''حالانکہ ناول کے ارتقاء کی ابتدائی کڑیاں داستان گوئی سے وابستہ ہیں۔ لیکن وہ دنیا کے سیاسی، سماجی اور معاشی انقلابات ہی تھے جنہوں نے انسانی ادب کی تقویت گریز وفرار اور تفریح وعشق کے عناصر کے حصار سے نکل کر اسے جدو جہد حقیقت پسندی اور عملی تحریک کے دائرے میں داخل کیا۔''
>
> (اُردو ناول آزادی کے بعد، از ڈاکٹر اسلم آزاد، صفحہ ۶۰)

ناول ایک ایسا نثری قصّہ ہے جس میں ہماری حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری اُمنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے سامنے کیا مشکلیں درپیش ہیں اور ان پر کس طرح سے قابو پایا جاتا ہے۔ گویا ناول زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔

لفظ ''ناول'' اطالوی زبان ''ناویلا'' سے نکلا ہے جس کے معنی نیا کے ہیں۔ یہ نام اس لئے دیا گیا کہ یہ فکشن میں ایک نئی صنف تھی۔ اُردو میں ناول انگریزی کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔ انگریزی میں رچرڈسن اور فیلڈنگ کو ناول کا موجد مانا جاتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ناول کو A Fictitious Prose یعنی من گڑ

ھت بیانیہ کہا جاتا ہے جس کے مناسب کردار ہوتے ہیں جو کم یا زیادہ پیچیدگی کے ساتھ کسی پلاٹ کی تنظیم میں حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں ناول کی تعریف یوں کرتے ہیں:

Novel is a fictitious prose,narrative of considerable length in which character and actions are representative of real life of the past or present times are portraited in more or less complexity.

(Oxford Dictionary Encyclopedia Britannica vol,16 p,673-74)

یعنی ''ناول ایک بیانیہ یا بڑی کہانی نما' خیالی ادب پارہ ہے' جس میں کردار اور عمل سچّی زندگی کی ترجمانی کرتے وہ چاہے ماضی کی ہو یا حال کی یا کسی پلاٹ میں کم و بیش پیچیدگی کے ساتھ تصویر کشی کی گئی ہو''

ناول کی بے شمار اقسام ہیں مثلاً رومانی، اخلاقی، سیاسی اور نفسیاتی ناول۔ناول کے مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی ہیں۔

۱۔قصّہ	۲۔پلاٹ	۳۔کردار نگاری
۴۔منظر نگاری	۵۔جذبات نگاری	۶۔نظریۂ حیات
۷۔اصول بیان	۸۔زماں و مکاں وغیرہ	

مندرجہ بالا ان اجزاء کی بنا پر کسی بھی ناول کی کامیابی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔اب ہم اُردو ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے

جس طرح انگریزی میں رچرڈ رسن فیلڈنگ کو ناول کا موجد قرار دیا جاتا ہے اسی طرح اُردو ادب میں

مولوی نذیر احمد کو ناول کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر سیّد نے اصلاحی تحریک چلائی اس وقت کے تمام فنکار شعراء واد باء نے اس میں حصّہ لیا اور اپنے اپنے طریقے سے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کام شروع کیا۔نذیر احمد کا ذکر بطور خاص کیا جاتا ہے جنہوں نے معاشرے کی اصلاح کا کام اپنے گھر سے شروع کیا۔نذیر احمد کا پہلا ناول ''مراۃ العروس''۱۸۶۹ء میں شائع ہوا اور یہ ناول نذیر احمد نے اپنی بیٹیوں کے لئے لکھا اور جہیز کے طور پر عطا کیا۔مراۃ العروس کے شائع ہونے کے چند سال بعد یعنی ۱۸۷۷ء میں اعظم گڑھ کے قیام کے دوران توبتہ النوح،ابن الوقت،فسانہ مبتلا،ایامی،رویائے صادقہ وغیرہ ناول تحریر گئے

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں والدین کی اطاعت،خدا پرستی،اخلاق پرستی جیسے موضوعات کو اپنایا۔ان کے ناولوں کے کردار کافی جاندار نظر آتے ہیں جن میں اصغری،اکبری،فہمیدہ، عاقل،ظاہر دار بیگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔نذیر احمد کے ہاں حقیقت نگاری اس قدر غالب ہے کہ پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سارا منظر ہمارے سامنے رونما ہو رہا ہے۔مراۃ العروس میں اس قدر حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے کہ اُس زمانے میں بعض لوگ دہلی میں اصغری،اکبری کا مکان ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے تھے۔ان کے کردار فرشتہ صفت ہیں نا کہ شیطان۔نذیر احمد اُردو ناول کے بانی اور موجد قرار دیئے جاتے ہیں۔اس ضمن میں اعجاز علی ارشد رقم طراز ہیں:

> ''نذیر احمد اُردو کے پہلے کامیاب ناول نگار ہیں انہیں کہانیاں کہنا آتا ہے اور انکی کہانیاں زندگی سے براہِ راست چُنی گئی ہیں ان میں کوئی شک نہیں کہ پند ونصائح کے پہاڑ ان کے قصّوں میں ایسے کھڑے ہیں جنہیں نفس قصّہ سے کوئی سروکار نہیں اور جو قصّے کی دلچسپی میں بُری طرح مزاحم ہیں لیکن اگر بالغرض اس پند و عظمت کے طومار کو کتاب سے نکال دیا جائے تو ایک صاف سیدھا سا قصّہ باقی رہ جاتا ہے جس

میں انتہائی ظاہری و خارجی تفصیل کے ساتھ زندگی کی سچّی تصویر نظر کے سامنے پھر

جاتی ہے۔''

(نذیر احمد کی ناول نگاری: اعجاز علی ارشد، صفحہ ۵۸)

نذیر احمد کے بعد اُردو ناول نگاری میں دوسرا نام رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ سرشار کو قصّہ لکھنے کی تحریک اودھ پنچ کے تفریحی مضامین سے ہوئی۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد کو لکھ کر اُردو ادب میں خاص کر اُردو ناول میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ فسانہ آزاد میں لکھنو کی جاگیردارانہ نظام کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ آزاد اور میاں خوجی کے دل چسپ کردار اس ناول کی مقبولیت کا باعث بنے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کے بعد ایک بہت سے قصّے لکھے جن میں جام سرشار، سیر کہسار، پی کہاں، طوفانِ بدتمیزی وغیرہ کافی شہرت کے حامل ہیں۔

سرشار کو لکھنو اور گردو نواح کی سوسائٹی سے کافی لگاؤ تھا وہ بمبئی میں ہوں یا دوسرے مما لک میں لکھنو کی فضا کو پیدا کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سرشار کو بیگماتی زبان و معاشرت اور رسم و رواج پر خاصا عبور حاصل تھا۔ وہ ان کے مزاج اور طور طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتے تھے اس کی مرقع کشی کیا کرتے تھے۔ اسی حقیقت نگاری کے سلسلے میں وہ مکالمے بھی ایسے لکھے ہیں جو مختلف پیشہ وروں اور مختلف طبقوں کے افراد کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں۔

اُردو ناول نگاری کا اگلا دور تاریخی ناولوں کا دور ہے۔ عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب نے تاریخی ناول لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کو دہرایا ہے۔ تاریخی ناول لکھنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی اور ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آیا تو انگریزوں نے جنگ کو غدر کا نام دیا اور مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں پر بے انتہا ظلم و جبر ڈھائے گئے اور ظلم سہتے سہتے مسلمانوں کے اندر ذہنی قوت ختم ہوگئی اور قوت بازو بھی ٹھنڈی پڑگئی۔ تاریخ گواہی دے رہی ہے جب بھی کسی قوم کو کوئی مشکل

درپیش آئی تو ادیبوں اورفن کاروں نے اپنی قوم کے اسلاف اور بزرگوں کے بہادرانہ واقعات کو پیش کر کے مردہ قوم کے اندر جان ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب قوم کے اندر اسلام کی بہادری اور شوکت وعظمت کا احساس دِلایا تو قوم کی سوئی ہوئی طاقت بیدار ہوئی۔ عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب نے تاریخی ناول لکھ کر اسی کام کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔ان کے ناول فردوس بریں، ملک العزیز ورجینا، زہرِ عشق اُردو دنیا میں بہت مقبول ہیں۔ شرر کو اُردو کا والٹر اسکاٹ کہا جاتا ہے۔ وہ اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جس نے ناول کی سطح بلند کی اور ایک ربط و تسلسل کے ساتھ ناول کے فن کو آگے بڑھایا۔ فردوس بریں میں حسن ایک ایسا کردار ہے جو باطل کی طاقتوں کے پیچ داخل ہو کر اس دور کے دو بڑے عالموں کو قتل کر دیتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے ساتھ محمد علی طبیب تاریخی ناول نگاری میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے ناول نیل کا سانپ، عبرت، خضر خاں' قابل ذکر ہیں۔ شرر کے ساتھ ساتھ اودھ پنچ اسکول کے ناول نگار قابل ذکر ہیں ان میں سجاد حسین، مرزا عباس حسین اور جوالا پرشاد برق وغیرہ مقبول ناول نگار ہیں۔ سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے مشہور ناولوں میں کایا پلٹ، حاجی بغلول، احمق الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین نے اپنے اخبار اودھ پنچ کے ذریعہ ظریفانہ طرز تحریر کو فروغ دیا ہے۔

اِن کے علاوہ علامہ راشد الخیری کے نام کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح ان کے ناولوں کا خاص موضوع ہے۔ زندگی کے غموں کا بیان انھوں نے بڑے دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس لئے راشد الخیری کو مصّورِ غم اور لڑکیوں کا سرسید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا نے بہت سے ناول تحریر کئے ہیں۔ جن میں بنت الوقت، عروس کربلا، نوحہ زندگی، سیدہ کا لال، آمنہ کا لال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اُردو ناول کا اگلا دور اُردو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار دور ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان

ادا'' وجود میں آیا تو اردو ناول نگاری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ رسوا کے دوسرے ناولوں میں شریف زادہ، ذاتِ شریف، اختری بیگم وغیرہ جدید دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ رسوا نے تاریخی ناول چھوڑ کر حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں روز مرّہ کی زندگی سے پلاٹ اخذ کئے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' ۱۸۹۹ء اُردو کا پہلا ناول ہے جو فن کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ امراؤ جان کا موضوع لکھنئو کی معاشرت میں ایک طوائف کا ذکر کیا ہے جو پیدائشی طوائف نہیں بلکہ حالات نے اُسے طوائف بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ امراؤ جان ادا آپ بیتی طرز پر لکھا ہوا ناول ہے۔ جس میں ایک طوائف کی آپ بیتی ہے۔ ناول کا پلاٹ نہایت مربوط اور گھٹا ہوا ہے اور ہر واقعہ سچّا اور اصلی معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول میں دوہرا پلاٹ ہے ایک کہانی امیرن کی اور ایک رام دئی پیش کی گئی ہے۔

> "Ruswa can well be taken as the founder of the realistic school in fiction coming much for the special requirements of the form and writing to improve upon that techniques employed by the forerunners.

(A History of Urdu Literature, Ali Ijawad Zaidi, P.255, Sahitya Academy Delhi 1993)

رسؔوا کے ہم عصروں میں نیاز فتح پوری کا نام سرِ فہرست ہے۔ نیاز کے ناول ''ایک شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' وغیرہ کافی دلچسپ ناول ہیں۔ ایک شاعر کا انجام رومانی تحریک کے شکوہ اسلوب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس قصّے میں فارسی تراکیب کا استعمال اور پُر فضا ماحول کی تخلیق پر قوت صرف کی گئی

ہے۔شہاب کی سرگزشت فنی طور پر متوازن ہے۔اس کے تمام کردار عقل وہوش کے تابع ہیں۔علاوہ ازیں مجنوں گورکھپوری اور یلدرم نے رومانی ناول لکھے حالانکہ مجنوں کے ناولوں میں رومانیت' جذبات اور حقیقت پسندی موجود ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں صنعتی ترقی کا دورشروع ہوا ملک کے منظر نامے پر مزدوروں ،کسانوں کی تحریکات نے ایسی فضا پیدا کردی کہ اُردو ناول بالخصوص انقلاب روس کے بعد ایک نئ عصری ہیئت اور حقیقت نگاری اختیار ہوگئی۔ اِس تحریک نے محنت کشوں کے مسائل کو ادب میں داخل کیا۔اس دور کی اُردو ناول نگاری کے رہنما بلاشبہ پریم چند کو کہا جاتا ہے۔ پریم چند کو جدید اُردو ناول کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے دور میں جتنے مسائل درپیش تھے خاص کر دیہاتی علاقوں کے مسائل ان سب کو پریم چند نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ۔ان کے مشہور ناولوں میں گئو دان ،میدانِ عمل ، بازارِحسن ،گوشۂ عافیت ، چوگانِ ہستی اور غبن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گوشۂ عافیت اور گئو دان سب سے بہترین ناول تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گوشہ عافیت جس کو پریم چند نے پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مکمل کیا گوشہ عافیت کو پریم چند کی ناول نگاری میں اہم مقام حاصل ہے فنی نقطہ نظر سے ایک کامیاب ناول ہے۔ اِس ناول میں پریم چند نے محنت کشوں کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اُبھارا ہے۔ چوگانِ ہستی پریم چند کا ایک شاہکار ناول ہے یہ ضخیم ناول ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ چوگان ہستی کو خود پریم چند نے اپنا شاہکار ناول قرار دیا ہے۔ یہ ناول سچائی کی ایک زندہ مثال قائم کرتا ہے چوگانِ ہستی کے بعد ان کا اہم ناول میدانِ عمل ہے یہ ناول اِس دور میں لکھا گیا جب سائمن کمیشن کے بائیکاٹ سے آزادی کی تحریک میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

اِس ناول کو لکھتے وقت پریم چند کے خیالات میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ اِس ناول میں پریم چند نے

کسانوں کے ساتھ مزدوروں کو بھی اپنے قلم میں قید کرلیا تھا اور دونوں کو کندھے سے کندھا ملا کر منزل کی طرف بڑھتے پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اپنے کرداروں کے ارتقاء کو پیش کرتے ہوئے ان کے خارجی اور نفسیاتی عوامل کو خصوصی طور پر مدِ نظر رکھتے ہیں۔ان کے کردار حقیقی اور گوشت پوست کے انسان ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر سماجی ناہمواریوں اور معاشرے کو ہدف طنز بنایا ہے۔وزیر آغا کا خیال ہے:

''پریم چند حقائق سے زیادہ قریب ہونے کے باعث اس مرض کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔جو معاشرے کے رگ و پا میں بلا کی تیزی اور شدت سے پھیلتا جا رہا ہے۔''

(اُردو ناول میں طنز و مزاح، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، صفحہ ۲۱۵)

گئو دان پریم چند کا آخری ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس ناول کو پریم چند نے سب سے زیادہ عرصے ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء میں لکھا۔انہوں نے ایک حقیقت پسند ادیب کی طرح اس ناول میں ہندوستانی تہذیب کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے ہوری جیسے مظلوم اور جاہل کسان کو ہیرو بنا کر اُردو فکشن میں پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں ہر طرح کے کردار اور واقعات پیش کئے ہیں۔ اِس میں عمر رسیدہ کردار بھی ہیں جیسے ہوری اور دھنیا۔نوجوان کردار بھی جیسے گوبر، جھنیا اور متوسط طبقے کے تفریح پسند پروفیسر مہتہ اور مس مالتی لوگ بھی ہیں۔اس ناول میں کسان بھی ہیں اور ساہوکار بھی۔حاکم بھی ہیں محکوم بھی، برہمن بھی ہیں اور اچھوت بھی۔ پریم چند نے ہوری کے ذریعہ ایک کسان کی اُمنگوں اور اس کے ارمانوں کی تصویر پیش کی ہے۔ مختصر طور پر منشی پریم چند اُردو ادب میں بطور بلند فکشن نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ پریم چند کی ابتدائی تربیت اور ذہن کی تعمیر اصلاح پسندی اور قوم پرستانہ تحریک کے زیر اثر ہوئی تھی۔اِس لیے ان کا ذہن روحانیت، متوسط طبقے کی اخلاقیات اور مارکسزم سے بڑی حد تک متاثر تھا۔آخری دور میں گاندھی فلسفے سے بیزار ہو چکے تھے۔

پریم چند کے بعد نئی نسل کے ناول نگارں نے ناول کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ جدید علوم وسائنس پر مبنی فکر سے متاثر تھے۔ انھوں نے فرد اور سماج کے بدلتے ہوئے رشتے کو سمجھتے ہوئے سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کے کردار اور اس کے تجربات پر زور دیا ان میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گوش وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات' اِس دور کا ایک اہم ناول ہے۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مشہور ناول نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ قاضی عبدالغفار کا نام بھی ناول نگاری کی دُنیا میں اہمیت کا حامل ہے ان کے دو ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' منظر عام پر آئے

کرشن چندر کو ترقی پسند تحریک کے اہم ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے ناول سڑک واپس جاتی ہے، چاندی کا گھاؤ، درد کی نہر، ایک وائلن سمندر کے کنارے، دل کی وادیاں سوگئیں، گدھے کی واپسی، ایک عورت ہزار دیوانے، جب کھیت جاگے، طوفان کی کلیاں وغیرہ ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔ کرشن چندر نے کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ موصوف نے بہت سارے ناولوں میں کشمیریوں کی غریبی اور معاشی استحصال کو پیش کیا ہے لیکن ان کا فن پارہ زیادہ تر کشمیر کے گاؤں کی زندگی پر مبنی ہے۔ کرشن چندر کا اولین ناول شکست ہے جس کا موضوع روایتی جاگیردارانہ سماج کی کشمکش ہے۔ گدھے کی واپسی ایک سیاسی قسم کا ناول ہے جس میں موصوف نے ہمارے سیاسی نظام پر خوب طنز کیا ہے۔

کرشن چندر کے بعد ترقی پسند ناول نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کا نام قابل ذکر ہے۔ دراصل وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن انہوں نے ایک واحد ناول ''ایک چادر میلی سی'' لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ بیدی نے اس ناول میں پنجاب کے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی کی تصویر کشی کی ہے جس میں ایک طرف

نفرت اور رقابت کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے تو دوسری طرف محبت، ایثار اور ہمدردی کی باہمی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اِس ناول میں پنجاب کی دیہاتی فضا، منظر نگاری، سماجی رشتوں کو اِس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے پنجاب اور پنجابیت کی تصویر اُبھر کر آ جاتی ہے۔ بقول دیوند اسّر :

''ایک چادر میلی سی میں بیدی نے انسانی کرداروں کی پیچ در پیچ شخصیت، جذبات اور زندگی کی اقدار کی شکست و ریخت اور لاشعور کی قوت کو زندہ کردار نگاری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا مرقع ہے۔ روز مرّہ کے معمولی واقعات اور احساسات کو فن کی بلندی تک سے جانا انسانی دُکھ درد کی منھ بولتی تصویر پیش کرنا بیدی کے فن کا کمال ہے۔''

(اُردو ناول میں طنز و مزاح، ص ۲۳۷)

بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' مختصر قسم کا ناول ہے۔ بیدی کا یہ ناول اُردو ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں پنجاب کے علاقائی رسم و رواج کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں کم عمر میں عورت کے بیوہ ہونے کے بعد اس کو سہارا دینے کے لیے چادر ڈالنے کی روایت ہے۔ اسی رسم و رواج کو بنیاد بنا کر بیدی نے یہ ناول لکھا۔ چادر ڈالنے کا مطلب ایسی شادی جس میں عورت کے شوہر کی موت ہونے کے بعد اُس عورت کی شادی شوہر کے بھائی سے کر دی جاتی ہے۔ چادر ڈالنے کی رسم پنجاب میں پہلے عام تھی بیدی نے اس رسم کو سماجی ضرورت بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار رانو ہے اور پوری کہانی رانو کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہی بیدی کے فن کا کمال ہے۔ اِس ناول کی کہانی یہ ہے کہ جب رانو کے شوہر کا انتقال ہوتا ہے تو پھر اس کا دیور اُس پر چادر ڈالتا ہے اور اس طرح اِن کی شادی ہو جاتی ہے۔

عصمت چغتائی بھی ترقی پسند تحریک کی ایک اہم ناول نگار ہے۔ عصمت نے اُردو میں پہلی بار عورت کی

جنسی گھٹن اور مردوں کی بدعنوانیوں پر قلم اُٹھایا۔ انھوں نے کبھی بھی سماجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا میدان عورتیں اور زمیندار گھرانوں کی بگڑی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں ہیں جن کی جنسی نفسیات سے عصمت کو خاص دلچسپی ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''جنسی کج روی انہیں خاص طور پر متوجہ کرتی ہے۔ اس لیے ان کا قدم کبھی کبھی فحش نگاری کے دلدل میں جا پھنستا ہے مگر ان کی فنی بصیرت اور فنکارانہ مہارت اس میں بھی حسن پیدا کر دیتی ہے۔''

(تفہیم ادب، شائستہ نوشین، ص ۱۶۶)

عصمت کے مشہور ناول ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، ایک قطرۂ خون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''ضدّی'' ۱۹۶۱ء میں لکھا پھر انہوں نے ۱۹۶۶ء میں اپنا شاہکار ناول ''ٹیڑھی لکیر'' لکھا۔ جو ان کا سب سے کامیاب ناول قرار دیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے نفسیاتی و جنسی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن اِن جنسی ،نفسیاتی ، معاشی ناولوں کے ساتھ ساتھ اس دور میں ناول نگاری کی ایک اور روش عام رہی جس میں ایم اسلم اور عظیم بیگ چغتائی کے نام نمایاں ہیں۔ ان دو معروف ناول نگاروں نے اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا کہ ناول زندگی کا مصّور، ترجمان، نقاد اور علمبردار ہونے کے باوجود کہانی کی ایک قسم ہے۔

عصمت چغتائی کے ہم عصر سعادت حسن منٹو جس کو اُردو افسانہ نگاری کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے وہ انتہائی اور بے باک قلم کار ہیں انھوں نے ایک ہی ناول ''بغیر عنوان کے'' لکھا جو اچھا اور بلند پایہ کا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔

اِسی دور میں عزیز احمد بھی ناول لکھنے لگے ان کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا ۔اِس ناول میں آزادی سے قبل حیدر آباد کے رئیسوں اور امیروں کی جنسی بے راہ روی اور اُن کے ہاتھوں کمزور

طبقے کے استحصال کو پیش کیا گیا۔عزیز احمد کا دوسرا ناول ''شبنم'' رومانوی ناول ہے۔موصوف نے اس ناول میں شبنم اور ارشد کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔عزیز احمد کے دوسرے ناولوں میں آگ، ہوس، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔عزیز احمد کے ساتھ احسن فاروقی کا نام سرِ فہرست ہے انھوں نے شام اودھ، آبلہ دل کا جیسے شاہکار ناول لکھے۔

قرۃ العین کا نام بھی اُردو ناول نگاری کی دنیا میں قابل ذکر ہے۔قرۃ العین نے اپنے ناولوں میں سماجی پسماندگی، اعلیٰ سوسائٹی کے لوگوں اور فسادات پر ناول لکھے تھے۔''میرے بھی صنم خانے'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اس ناول میں ایک مخصوص تکنیک کو ذہن میں رکھتے ہوئے فنی باریکیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے یہ تقسیم ہند کے بعد شائع ہوا۔اس ناول میں لکھنو کی معاشرتی زندگی، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے درباری ماحول، ادبی محفلوں کی پُرکشش تصاویر ملتی ہیں۔

ناول'' آگ کا دریا'' ۱۹۵۹ء قرۃ العین کا شاہکار ناول ہے۔اس ناول میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو سمیٹ کر ناول کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے۔جو ہندوستان کی تہذیبی تاریک کے دس ہزار سالوں پر مشتمل ہے۔ناول'' آگ کا دریا'' ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے وہ وقت کی علامت ہے کہ جس طرح وقت رواں دواں رہتا ہے اسی طرح دریا رواں دواں رہتا ہے۔اس ناول کے متعلق شہناز مرزا کا خیال ہے:

> ''۱۹۵۹ء میں ان (قرۃ العین) کے ناول آگ کا دریا کی اشاعت عمل میں آئی اور اس ناول کے ذریعہ انھوں نے اپنے پچھلے کارناموں پر حیرت انگریز سبقت حاصل کرلی۔دریا کو وقت کی علامت بنا کر انھوں نے ہندوستان کی تین ہزار برسوں کی بے حد الجھی ہوئی تاریخ کے پس منظر میں ہندوستانی شخصیت کو زندہ حیثیت سے پیش

کیا ہے اپنے وسیع تر کینوس کی وجہ سے اس ناول کو اُردو ناولوں میں بے حد اہم اور

منفرد مقام ہے۔''

(آگ کا دریا: تفہیم و تجزیہ، ڈاکٹر ایوب خان' صفحہ ۱۷)

اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ایک نئی تکنیک کی بنیاد ڈالی اس تکنیک کو شعور کی رو "Stream of Consciousness" سے موسوم کیا گیا ہے۔ شعور کی رو دراصل اس قسم کے ناول ہیں جس میں فرد کے خارجی (باہر) احساسات کے بجائے داخلی (اندرونی) احساسات پر زور دیا جاتا ہے اس میں سب سے زیادہ توجہ کردار کے نفس پر دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے ناولٹ سیتا ہرن، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو، ہاؤسنگ سوسائٹی، فصلِ گل آئی یا اجل آئی مشہور ہیں۔

انتظار حسین کو بھی ناول نگاری کی دنیا میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے ناولوں نے بھی اُردو دنیا میں دھوم مچادی۔ ان کے ناول بستی، گہن، چاند، آگے سمندر ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انتظار حسین اُن فنکاروں میں سے ہیں جو تقسیم سے قبل ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کی دم توڑتی ہوئی تہذیبی اقدار سے وابستہ تھے لیکن ہجرت کے عمل میں اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے باعث زمین اور زمانے کے سابقہ رشتوں سے وہ محروم ہو گئے۔ انتظار حسین کی سبھی تصنیفات قدیم اقدار سے جڑی نظر آتی ہیں۔ ان کی مثال اِن کا ناول تذکرہ ہے۔ ناول چاند گہن تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا۔ اِن کی تحریروں میں کہیں کہیں سیاست بھی نظر آتی ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ناول بستی میں مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کے نوجوانوں، دانشوروں، شاعروں اور فنکاروں کی ذہنی بیماری گی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

عبداللہ حسین بھی جدیدیت کے حامی تھے۔ انھوں نے ایسے ناول لکھے جو ادبی حلقوں میں بلند مقام

رکھتے ہیں۔ان کے ناولوں میں اُداس نسلیں، باگھ، گدھ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔عبداللہ حسین نے ناول نگاری کی دنیا میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔انہوں نے برطانوی سامراج کی سازشوں اورتحریک آزادی کے مختلف مرحلوں اور اِس تحریک میں پنجاب کے گاؤں کے کسانوں نے حصّہ لے کر جو قیمت ادا کی ہے اس کے اثرات کی نشاندہی وسیع پیمانے پر کی گئی ہے۔ترقی پسند ناول نگاروں میں حیات اللہ انصاری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ان کے ناول لہو کے پھول، گھروندا، مرزا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔لہو کے پھول میں اچھوتوں کے مسائل جو گاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں کوموضوع بنایا گیا ہے۔

اُردو ناول نگاری کی دنیا کا ایک اور اہم نام جیلانی بانو کا ہے۔ جیلانی بانو نے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ایوان غزل ان کا پہلا ناول ہے جوحیدرآباد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔''بارش سنگ'' جیلانی بانو کا دوسرا ناول ہے اس میں موصوفہ نے زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

جیلانی بانو کے ساتھ خواتین ناول نگاروں میں خدیجہ مستور کا نام قابل ذکر ہے ان کے ناولوں میں سیاسی، سماجی اور معاشی اونچ نیچ کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ناول''آنگن'' میں اتر پردیش کے ایک جاگیردارانہ خاندان کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ناول''زمین'' خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ہے۔اس ناول کا آغاز مہاجرین کے کیمپ سے ہوتا ہے۔ساجدہ، کاظم اور مالک اس کے اہم کردار ہیں۔

ان ناول نگاروں کے قبل لکھنے والے ترقی پسند ناول نگاروں میں اُپیندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ اور سہیل عظیم آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔اُپیندر ناتھ اشک کے ناول ستاروں سے کھیل، سورت ریت اور گناہ، گرتی دیوار وغیرہ ہیں۔انور عظیم کے ناول پر پرچھائیوں کی وادی اور دھواں دھواں سویرا اور سہیل عظیم آبادی کا ناولٹ

''بے جڑ کے پودے'' وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

قاضی عبدالستار کے ناولوں میں شب گزیدہ، داراشکوہ، صلاح الدین ایوبی، غالب وغیرہ اہم ناول ہیں۔ 'شکست کی آواز' ان کا پہلا ناول ہے جو ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر پر لکھا گیا ہے

جدیدیت کے لکھنے والوں میں جوگیندر پال کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا پہلا ناول 'ایک بوند لہو کی' ہے۔ جس میں موصوف نے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذریعہ سماجی مسائل سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے ناول آمدرفت، خوب رو، کچھوا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بلونت سنگھ کا شمار بھی جدیدیت کے حامی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں رات چوراور چاند، کالے کوس، راوی اور چک پیراں کا جسّا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں پنجاب کی زندگی کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ناولوں میں پنجاب کی شہری اور دیہاتی زندگی کا ایک خاص لب ولہجہ نظر آتا ہے۔ ان کے ناول ''چک پیراں کا جسّا'' میں پنجابی گاؤں کی زندگی کے روزمرّہ کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ رات چور اور چاند پالا سنگھ کی محبت کی کہانی ہے۔ کالے کوس آزادی سے قبل سے ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ ناول راوی پار اپنے عنوان سے ہی پنجاب اور پنجابیت کے ساتھ جڑے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ راوی پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک دریا کا نام ہے۔ راوی پار کے بارے میں ڈاکٹر سوہندر سنگھ ونجارا بیدی لکھتے ہیں:

> ''راوی پنجاب کا مشہور دریا، جو کلّو کے پہاڑوں میں سے نکل کر، چمبا، مادھو پور
> ، ڈیرہ بابا نانک، لاہور، شیخو پورہ، منٹ گمری اور ملتان سے گزرتا ہوا ۴۵۰ میل کا سفر
> طے کر کے احمد پور کے نزدیک جھنا اور جہلم کے پانیوں میں مل جاتا ہے۔''

(پنجابی لوک دھاراوِشوکوش، ڈاکٹر ایس ایس ونجارا بیدی، صفحہ۹۲)

الطاف فاطمہ کا ناول نشان محل پاکستان کے قیام سے پہلے اور بعد کے چند سالوں کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں گھریلو قسم کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے ان کا دوسرا ناول 'دستک نہ دو' بھی قیام پاکستان کے دور کا ناول ہے ۔اِس دور کے لکھنے والوں میں اگلا نام سائرہ ہاشمی کا ہے۔ان کا ناول 'درد کی رُت' کافی مقبول ناول ہے۔اِس میں ایک کمزور نوجوان راشد اور ایک باہمت لڑکی کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

اُردو ادب وقت کے دھارے میں بہتا ہوا زندگی کے متوازی چلتا رہا ہے۔انسانی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے بھی متاثر ہوتا رہا ہے۔آزادی کے بعد اردو ادب میں جدیدیت کا دور شروع ہوا۔اس دور کے لکھنے والوں نے اردو ناول میں نئے نئے تجربات کئے۔ غالبًا بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اردو ادب میں مابعد جدیدیت کا نعرہ بلند ہوا۔اس رجحان کو بھی بہت سے اُردو ناول نگاروں نے قبول کیا۔ نتیجے کے طور پر ایک بار پھر اُردو ناول نے ایک اور کروٹ لی ۔مابعد جدیدیت سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں الیاس احمد گدی، عبدالصمد، ابن کنول، پیغام آفاقی، واجدہ تبسّم، اقبال مجید، ترنم ریاض وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مابعد جدید ناول نگاروں میں عبدالصمد کا نام قابل ذکر ہے۔ان کے ناول 'دوگز زمین' کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔اس کا دوسرا ناول 'مہاتما' ہے۔اِن کے ہم عصر ناول نگاروں میں ایک اہم نام حسین الحق ہے۔ان کا ناول آڈینٹی کارڈ (Identity Card) بھی قابل ذکر ہے۔اس میں ماضی کے ڈیڑھ ہزار سال کا Retro Travel پیش کیا گیا ہے۔غضنفر کا ناول 'پانی' بھی اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے کہانی میں Trony کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے۔شموئل احمد کا ناول ندی اپنی مثال آپ ہے۔اس ناول کا موضوع آفاقی ہے جو جدید سے مابعد جدیدیت کا احاطہ کرتا ہے۔

صلاح الدین پرویز نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعے اُردو ناول نگاری کے باب میں اہم اضافہ کیا ہے۔ ان کا ناول تھکا ہوا پُرش، سارا دن بیت گیا اور نمرتا اہمیت کے حامل ہیں۔ اسلوب اور طرزِ نگارش کی وجہ سے ان کا انوکھا پن ہمیں کافی متاثر کرتا ہے۔

آج ہم اکیسویں صدی کی ڈیڑھ دہائی گزار چکے ہیں یہ صدی سائینس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار کی صدی ہے جس میں انٹرنیٹ، موبائل فون، کمپوٹر وغیرہ کے تمام اسباب میسر ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے پوری اکیسویں صدی کے حوالے سے یہ الفاظ بیان کئے ہیں:

> ''اکسیسویں صدی اپنے ساتھ نئی زندگی لے کر آئی ہے کمپیوٹر کے بل بوتے آئی ٹی نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اب قلم کی جگہ انگلی استعمال ہونے لگی ایک کلک سے جو چاہو حاضر۔ ہر طرح کی معلومات ایک چھوٹے سے بکس میں سمٹ گئی۔ جب چاہیں جو چاہیں مل جائے گا نئی صدی میں اسے knowledge of explosion معلومات کا دھما کا نام دیا گیا۔۔۔انسان مشین اور کمپیوٹر بن گیا۔''

(فکر و تحقیق، پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) ص،۲۰۶)

اس نئی صدی میں زندگی کی بہت سی آسائش اور آرام طلبی ہمیں میسر ہوئیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود نئی نسل رشتوں اور محبت کو بھول چکے ہیں ہر طرف مکاری، فریب کاری کا بازار گرم ہے نئی نسل کے لکھنے والوں نے ان ہی موضوعات پر قلم اُٹھایا آج اُردو ناول نگاری کی دنیا کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ آج بے شمار قلم کار نئے اسلوب میں اُردو ناول لکھ رہے ہیں۔ جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ متذکرہ بالا لکھنے والوں کے علاوہ جدید دور کے لکھنے والوں میں بانو قدسیہ، شکیلہ اختر، رضیہ فصیح احمد، رضیہ فرحت الطاف،

ہربنس سنگھ دوست، وسیم بانو قدوائی، آمنہ ابوالحسن، رام لعل، محمد حسن، اقبال متین، فضل احمد کریم فضلی، مستنصر حسین تارڑ، صغرا مہدی، عفت موہانی، شفق، ظفر پیامی، عباس خان، شمس الرحمان فاروقی، علی امام نقوی، فہیم اعظمی، نجمہ محمود، رتن سنگھ، یعقوب یاور، عشرت ظہیر، مظہر الزماں خاں، انور سجاد، ہارون ایوب، زلیخا حسین کیرالہ(۲۷ ناول)، سلیم شہزاد، ثریا محمود ندرت، بلراج ورما، رامانند ساگر، فاطمہ مبین، انور خان، ساجدہ زیدی، اقبال مجید، کشمیری لال ذاکر، سید محمد اشرف، آشا پر بھارت، کبریٰ بیگم، گیان سنگھ شاطر، زاہدہ زیدی، مقصود الٰہی شیخ، انیس ناگی، مشرف عالم ذوقی، انل ٹھکر، نند کشور وکرم، فریدہ رحمت اللہ، احمد داؤد، نثار عزیز بٹ، احمد صغیر، ظفر عدیم، آچاریہ شوکت خلیل، آنند لہر، افسانہ خاتون، کوثر مظہری، شبر امام، اقبال نظامی، قیام نیر، اشرف شاد، نور الحسنین، ثروت خان، صادقہ نواب سحر، شاہد اختر، فاطمہ تاج، رفیعہ منظور الامین، نذیر فتح پوری، مشتاق انجم، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، صدیق عالم، رحمٰن عباس، محمد غیاث الدین، خالد جاوید، علی امجد، مرزا اطہر بیگ، ایم مبین، سرور غزالی، اختر آزاد، دیپا سلیم عرفان، نسرین ترنم، امراؤ طارق، خالد اختر، نسترن احسن فتیحی، حبیب حق، ذکیہ مشہدی، شاہجہاں جعفری حجاب، فرخندہ لودھی، رشیدہ رضویہ، سلمیٰ اعوان، طارق محمود، غلام الثقلین نقوی، سید شبیر حسن، قدرت اللہ شہاب، صدیق سالک، فاروق خالد، اکرام اللہ، خوشنودہ نیلوفر، نجم الحسن رضوی وغیرہ نے ناول لکھ کر اُردو ناول کی ترقی میں اپنا حصّہ ڈالا۔

شائستہ فاخری کے ناول 'صدائے عندلیپ بر شاخ شب' اور 'نادیدہ بہاروں کے نشان' میں عورت کے جزبات واحساسات اور اس کے استحصال کا ایک نیا رخ سامنے آیا ہے انہوں نے عورت کے جنسی مسائل کے موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ اس کے علاوہ ثروت خان کا ناول 'اندھیرا پگ' میں راجسھتانی سماج اور اور وہاں کی رسم ورواج کا ذکر کیا ہے کہ راجستھان کے کچھ علاقوں میں آج بھی عورت مرد کے ظلم وزیاتی کی شکار ہے۔ اس کے

علاوہ جموں کشمیر کے ناول نگاروں میں ترنم ریاض، کشمیری لال ذاکر، حامدی کشمیری، آنند لہر وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے ترنم ریاض کے دو ناول 'مورتی' اور 'برف آشنا پرندے' قابل ذکر ہیں۔ مورتی میں عورت کے تخلیقی کرب کو پیش کیا ہے برف آشنا میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کو پیش کیا گیا ہے۔ کشمیری لال کا ناول 'لال چوک' ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا اس ناول میں ذاکر نے کشمیری پنڈتوں کی ہجرت اور کشمیر کے تہذیب پر قلم اُٹھایا ہے آنند لہر کا ناول 'نامدیو' میں عصری سماج کی جھلک کو پیش کیا ہے۔

المختصر اگر ہم اُردو ناول کے مستقبل کی بات کریں تو اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اُردو ناول کا مستقبل درخشاں ہے۔ علم روز بروز عام فہم ہوتا جارہا ہے۔ نئے قلم کاروں کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے جس سے اُردو ناول کے موضوعات میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ان کا قلم بے خوف ہے، جو کسی قسم کی پابندی کا قائل نہیں۔ ان کے دماغ میں ندرت اور مزاج میں جرت پسندی ہے اور نئے ناول نگار نئے ڈھنگ اور نئے اسلوب سے اپنی بات کو پیش کررہے ہیں۔

پنجابی ناول کا پس منظر

پنجابی ناول کا پس منظر

پنجابی ناول کا آغاز وارتقاء:

پنجابی ناول کے آغاز وارتقاءکو لے کر محققین کے یہاں تضاد پایا جاتا ہے۔ عام طور پر پنجابی ناول کے آغاز کے بارے میں دونظریے سامنے آئے ہیں۔ پہلے نظریے کے مطابق پنجابی ناول بھی پنجابی ادب کی دوسری اصناف کی طرح یورپ کی دین سمجھا جاتا ہے۔ گورپال سنگھ سندھو اپنی کتاب ''پنجابی ناول کا اتہاس'' میں اس نظریے کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''پنجابی ناول کے جنم کے بارے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ اس کا آغاز انگریزوں کے پنجاب پر قبضہ کرنے اور یہاں اپنا نظام قائم کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لئے پنجابی ناول کے آغاز کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ اس کا مغرب یورپ میں جنم لینے والے ناول کے روپ اور شکل کے ساتھ رشتہ قائم ہوتا ہے۔''
>
> (پنجابی ناول کا اتہاس، گوردیال سنگھ سندھو، صفحہ۱۲)

پنجابی ناول کے آغاز کے متعلق دوسرے نظریے کے مطابق پنجابی ناول پنجابی ادب میں صدیوں سے رائج قصّہ، وار، جنگ نامہ اور ساکھیوں کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ جو صدیوں کا ابتدائی سفر طے کر کے اس شکل میں پہنچا ہے۔ بلاشبہ قصّوں، جنگ ناموں اور جنم ساکھوں میں کہانی اور ناول کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ لیکن موجودہ پنجابی ناول یورپی ناول کے متوازی چلتا نظر آتا ہے۔

ان دونوں نظریے کو لے کر پنجابی محققین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ پنجابی ناول کسی نہ کسی روپ میں یورپ کے ادب سے متاثر ہو کر وجود میں آیا ہے۔ انگریزی ناول کے اثرات پنجابی ناول پر سیدھے طور پر مرتب نہیں ہوئے بلکہ بنگالی، اُردو اور ہندی ناولوں کے ذریعے براہ راست پڑے ہیں۔ ابتدائی دور میں پنجابی ناول مختلف راہوں سے گزرا۔ ابتداء سے ہی یہاں کے باشندے مختلف حالات کے شکار رہے ہیں یہاں کے قلم کاروں نے اپنی زندگی کے ان واقعات و حادثات کو اپنے ناولوں میں قید کر دیا ہے۔

ناول لکھنے کے لئے قلم کار کیلئے زندگی کا وسیع مطالعہ ہونا ضروری ہے۔ ہر سماج میں ناول اُس وقت لکھے جاتے ہیں جب سماج میں انقلاب آتا ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سماج میں سرمایہ کاروں اور سماجی مشکلات کی وجہ سے آتا ہے۔ اس لئے عام طور پر ناول کو سرمایہ کار سماج کی ہی دین مانا جاتا ہے۔ پنجابی ناول نگاروں نے بھی انگریزوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

پنجابی ناول کا جنم:

عیسائی مشنریوں کی جانب سے شائع کیا گیا پنجابی کا پہلا ناول ''جیوتر دیؤ'' ہے۔ یہ ناول 1882ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے 1859ء میں ایک ناول نما ترجمہ کردہ تخلیق ''مسیحی مسافر دی یاترا'' شائع کروا چکے تھے۔ یہ ناول انگریزی کے مشہور و معروف ناول نگار ''جان بُنی آن'' (John Bunyan) کا تحریر کردہ تھا۔

''جیوتر دیو'' ایک سماجک قسم کا ناول ہے۔جس میں ہندوستانی سماج کو پیش کیا گیا ہے۔لیکن اس ناول کا لب لباب ہندوستانی سماج کی کاٹ ہے اور عیسائیت کو سماج کے لئے بہترین مذہب قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی کی آخری دہائیوں میں پنجابی ناول کا جنم عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں ہوا۔عیسائی مشنریاں نے 1863ء میں ''بائبل اور ٹریکٹ سوسائٹی'' اور ''پنجاب ریلیجیس بُک سوسائٹی'' قائم کی۔جس کا مقصد پنجابی ادب کی مختلف اصناف کے ذریعے اپنے مذہب کی تبلیغ تھی۔لیکن یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ابتدائی پنجابی ناول رومانسک اور تاریخی قسم کے تھے۔

پنجابی ناول کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔جس وقت پنجابی ناول نے آنکھ کھولی اس زمانے میں پنجاب میں والٹر سکاٹ کے تاریخی ناول، دیوکی نندن کھتری کی رومانس کتھا ''چندر کانتا'' رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم کے رومانٹک ناول بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

پنجابی کے ابتدائی ناول نگاروں میں ڈاکٹر چرن سنگھ (1908ء ۔1853ء) کا نام قابل ذکر ہے انہوں نے ''شراب کور'' اور ''جنڈ منڈولی'' جیسے ناول لکھے اور بھائی ویر سنگھ (1872ء۔1957ء) نے اپنے تاریخی و رومانوی ناولوں کے ذریعے سکھ کرداروں کا عکس پیش کیا۔ان کے ناولوں کا مقصد سماجی اور معاشی برائیوں کا خاتمہ تھا۔ان کے علاوہ بھائی موہن سنگھ وید (1936ء۔1881ء) نے بھی چھوٹے چھوٹے سماجی قسم کے ناول تحریر کئے۔چرن سنگھ شہید (1935ء۔1891ء) نے بھی سماجی قسم کے ناول لکھے۔نانک سنگھ پنجابی کا وہ ناول نگار ہے جس نے پنجابی ناول کو دنیائے ادب کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔

پنجابی ناول کا ابتدائی دور (دورِ اوّل):

اصل پنجابی ناول کا آغاز بھائی ویر سنگھ کے ناولوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ان کے ناولوں کو سمجھنے کے لئے اُس دور کے سیاسی، مذہبی اور تہذیبی عناصر کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد انگریز حکمرانوں نے سکھ دھرم اور پنجابی تہذیب وثقافت کو نیچا دکھانے اور عیسائی دھرم اور مغربی تہذیب کو اونچا دکھانے کی کوشش کی۔ عیسائی مشنریوں نے اپنے دھرم کے پرچار کے لئے کتابیں چھاپنا شروع کئیں۔ جس کے مقابلے میں 1893ء میں خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی قائم ہوئی۔ بھائی ویر سنگھ اور دوسرے ناول نگاروں کے ناول اسی سوسائٹی کی دین ہیں۔ان ناول نگاروں کے ناول عیسائی مت کے پرچار والے ناولوں کا جواب تھے۔

بھائی ویر سنگھ کے ناول لکھنے کا مقصد عیسائی مت اور مغربی تہذیب وثقافت کے مقابلے میں سکھ دھرم اور پنجابی تہذیب وثقافت کو پیش کرنا تھا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بھائی ویر سنگھ نے 17ویں اور 18ویں صدی کے سکھ اتہاس کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے سکھ مذہب کے رہنماؤں کو بطور ہیرو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ بھائی ویر سنگھ کے ناولوں میں قدیم پنجابی قصّہ، وار اور جنگ نامہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔

بھائی موہن سنگھ وید پنجابی ناول کے ابتدائی دور کا دوسرا اہم ناول نگار ہے۔ان کے ناولوں میں سکھ دھرم کی جگہ سماجی برائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ موہن سنگھ پنجاب کے زمینی حقائق اور قدروں قیمتوں سے وابستہ ناول نگار ہیں۔ ڈاکٹر مان سنگھ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''وید کے ہاتھوں میں پنجابی ناول دھرم میدان سے سکھ سماج کے ذریعے سماجک مسائل میں داخل ہوتا ہے۔کرداروں کے روپ میں بھی تبدیلی نمودار ہوتی ہے

کیونکہ وید کے کردار عام سکھ اور سماجک کمزوریوں والے کردار ہیں۔ یہ ناول کہانی کی
جانب سے رومانس کتھا والے اور پیغام دینے والے ہیں۔''

(جیت سنگھ سیتل، آدھونک پنجابی ساہت دا آلوچناتمک
اتہاس، صفحہ ۲۷۸)

ہرچرن سنگھ شہید ایک مزاحیہ شاعر، کہانی کار اور ناول نگار کے طور پر پنجابی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔موصوف نے تاریخی حقائق کو پیش کرتے ہوئے ہندوستان کو انگریزوں کے ہاتھوں میں جاتے ہوئے دکھایا ہے۔ ہرچرن سنگھ شہید کے ناولوں کے بارے میں گرپال سنگھ سندھو لکھتے ہیں

''چرن سنگھ کے ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ ان ناولوں میں پُرانی قدروں قیمتوں اور
پرانی رسموں میں دبی عورت نئے روپ میں پیش ہوئی ہے۔اس نے ناولوں میں
پیش کیے گئے مسائل کا حل موجودہ دور میں تلاش کرنے کی بجائے سکھ دھرم میں
تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان ناولوں کے ذریعے قوم کی ترقی کا کام بھی بخوبی
ہوا ہے۔''

(پنجابی ناول کا اتہاس، گرپال سنگھ سندھو، صفحہ ۴۹)

اس دور کے اور بھی بہت سے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے اکّا دُکا ناولوں کے ذریعے پنجابی ناول کی ترقی میں اپنا رول ادا کیا۔جن کا ذکر کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ یہاں پر صرف پنجابی ناول کے ابتدائی دور کے اہم ناول نگاروں کی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

پنجابی ناول کا دوسرا دور:

یہ دور پنجابی ناول کا سنہرا دور تھا۔ پنجابی ناول اپنے ابتدائی مراحل طے کر چکا تھا۔ اس نے روایتی موضوعات کو چھوڑ کر دنیائے ادب کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا تھا۔ دنیا بھر میں تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھی۔ پوری دنیا میں سرمایہ کاروں اور مزدوروں میں ایک جنگ شروع ہو گئی تھی۔ یورپ کے ممالک ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ جس کے نتیجے میں عالمی جنگیں ہوئیں اور لاکھوں انسان موت کا لقمہ بن گئے۔ پنجابی ناول نگار بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں کی طرح ان واقعات اور انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جس کے نتیجے میں پنجابی ناول روایتی تاریخی دنیا سے باہر نکل کر زندگی کے ہمراہ چلنے لگا۔ اس دور کے پنجابی ناول نگاروں نے اپنے دور کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ انہوں نے مذہبی ہیروؤں کو درکنار کرتے ہوئے اپنے دور کے نئے کردار تلاش کئے جو عام کسان اور کمزور تھے۔

پنجابی ناول کا دوسرا اور اہم دور نانک سنگھ کے ناولوں سے شروع ہوتا ہے۔ نانک سنگھ پنجابی ناول کے پہلے حقیقی ناول نگار تھے۔ جنھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کو جگہ دی۔ انہوں نے پنجابی ناول کو تاریخ اور مذہب کی زنجیروں سے آزاد کروا کر حقیقت نگاری کی دنیا میں لا کھڑا کیا اور زندگی کے عصری مسائل سے آشنا کروایا۔ نانک سنگھ نے اپنے ناولوں میں عصری مسائل بیوہ کی شادی، چھوت چھات، سماج کی تقسیم، بے روزگاری، نشوں کی لعنت، بال شادی، مقدمے بازی اور حسن بازار وغیرہ سماجی مسائل کو پنجابی ناول کا حصّہ بنایا۔

اُردو، ہندی اور بنگالی ناول کی طرح پنجابی ناول پر بھی تقسیم کے اثرات مرتب ہوئے۔ پنجاب کا دو حصّوں میں تقسیم ہو جانا اور پنجابیوں کا دھرم کی بنیاد پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُجڑ کے دوبارہ آباد ہونا۔ تقسیم کے اس خونی سانحہ نے عام انسان سے زیادہ حسّاس قلم کاروں کو خون کے آنسو رلا دیا اور یہ آنسو آج بھی پنجابی ناول کے دامن پر پڑے نظر آتے ہیں۔ نانک سنگھ نے اپنے اس دکھ کو ''آگ کی کھیڈ''، ''منجدھار'' اور

''آدم خور'' وغیرہ ناولوں کے ذریعے ظاہر کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے ''ناسور''، ''کٹّی ہوئی پتنگ''، ''چھلاوا''
وغیرہ ناولوں کے ذریعے پنجابیوں کے معاشی حالات کو پیش کیا ہے۔انہوں نے غدری لہر کی تاریخ کو پیش کرنے کے لئے ناول ''ایک تلوار دو میان'' تحریر کئے ہیں۔

نانک سنگھ نے لگ بھگ ۳۸ ناول لکھے ہیں جن کے ذریعے وہ مسائل پیش ہوئے ہیں جو سماجی نظام میں انسانی رشتوں کے توازن کو بگاڑتے ہیں۔

پرنسپل سنت سنگھ سیکھوں (1997ء۔1908ء) اس دور کے دوسرے اہم ناول نگار ہیں۔ پرنسپل سنت نے آنکھ کھولی تو دنیا میں سماجی اونچ نیچ، سرمایہ کاروں اور جاگیرداروں کے خلاف پوری دنیا میں انقلاب برپا ہو چکا تھا۔موصوف بھی اسی دھارے میں بہہ گئے اور کسانوں کے مسائل کو لے کر آواز بلند کی اور ''لہومٹّی''، ''بابا آسمان'' جیسے ناول لکھے۔

سریندر سنگھ نرولہ نے ''پیو پُتر''، ''رنگ محل''، ''سیل الونا''، ''دین تے دُنیا''، ''لوک دشمن''، ''جگ راتا''، ''نیلی وار''، ''دِل دریا''، ''راہے کوراہے''، راتاں ہویاں وڈیاں'' اور ''اپنے پرائے'' وغیرہ ناول لکھے۔ نرولہ کے ناول مذہبی اور سماجی مسائل پیش کرنے کی جگہ زندگی کے حقائق پیش کرتے ہیں۔ بقول گرپال سنگھ سندھو:

> ''سریندر سنگھ نرولہ کا اپنے پہلے ناول ''پیو پُتر'' میں نہ صرف امرتسر کے جیون کے پہلو پیش کرتا ہے بلکہ ایسے حالات بھی پیش کرتا ہے، جو ایک عام انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر کے نبھانے پڑتے ہیں۔''
>
> (پنجابی ناول کا اتہاس، گرپال سنگھ سندھو، صفحہ ۵۹)

جسونت سنگھ کنول بھی اس دور کا مقبول ناول نگار ہے۔جس نے پنجاب کے دیہاتی کلچر کی عکاسی کی

ہے۔جسونت سنگھ نے ۱۹۴۷ء سے پہلے ناول کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ وہ سماج وادی نقطۂ نظر کو اپنا کر کسانوں کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔

کنول نے اپنے ناولوں میں مالوے کے دیہاتوں کی زندگی کو بنیاد بنایا ہے۔اس دور میں جہاں نانک سنگھ نے شہری زندگی کو اپنایا وہیں کنول نے دیہاتی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔موصوف کسی ایک دور کے ترجمان نہیں ہیں وہ ایک طرف مارکسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں وہیں دوسری طرف ویدوں کے نمونے بھی ان کے ناولوں میں نظر آتے ہیں۔کنول اپنے ناولوں میں غریبوں اور دبے کچلے لوگوں کی بات کرتا ہے۔اپنے آخری ناولوں میں وہ سکھ دھرم کا انقلابی روپ پیش کرتا ہے۔

کرنل نریندر پال سنگھ بھی اس دور کا ایک اہم ناول نگار ہے۔انہوں نے زندگی کے سبھی شعبوں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ان کے ہاں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔موصوف نے تاریخی،سماجی،رومانس اور جنسیات جیسے موضوعات کو اپنایا ہے۔لیکن کرنل کے تحریر کردہ تاریخی ناولوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔

کرنل نے ناول ''ملاح''،''سیناپتی'' اور ''امتالی ورے'' کے ذریعے سکھ تاریخ کے مختلف ادوار سے ہمیں روشناس کروایا ہے۔اسی طرح ''شکتی'' ناول میں عورت کو بڑی طاقت وراور کمزوری ثابت کیا ہے۔

اس دور کے ان اہم ناول نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول نگار تھے جنہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے پنجابی ناول کو ترقی کی راہوں پر گامزن کیا ہے۔ان کے ناولوں کی اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عام انسان کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے جس کی وجہ سے ان کے ناول قارئین کو اپنے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہوئے۔اس دور کے چند اور ناول نگار مندرجہ ذیل ہیں۔

گورچرن سنگھ کا ناول ''وگدی سی راوی'' قابل ذکر ہے۔اس ناول میں انہوں نے راوی کو علامت بنا کر

پیش کرتے ہوئے پنجابی تہذیب کی اہم کڑی مشترکہ خاندان کا خاکہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے دکھایا ہے کہ ترقی کی راہوں پر چل رہے انسان نے اپنی زندگی کی قدروں قیمتوں کو بھلا دیا ہے اور بڑے بڑے پریواروں میں مل جُل کر رہنے والے لوگ چھوٹے چھوٹے کنبوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے ناول نگار نے انگریزی سماج اور انگریزی تعلیم کے نظام پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔

گوربخش سنگھ کے دو ناول ''ان بیاہی ماں'' اور ''رُخاں دی جی راند'' عصری مسائل سے پُر ہیں۔ ناول نگار نے انسانی زندگی میں بڑھ رہی بے حیائی اور جنسی راہ روی کو ان ناولوں میں موضوع بنایا ہے۔

ایشور چندر نندہ بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں، لیکن ان کے دو ناول ''تیز کور'' اور ''مراد'' قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح پریتم سنگھ بھاٹیہ نے بھی آزادی سے پہلے چند روایتی قسم کے تاریخی ناول تحریر کئے ہیں۔ جن میں ''اشوک'' اور ''تک شیلا'' ناول اہم ہیں۔ ان ناولوں میں موصوف نے قدیم ہندوستان کے تاریخی ہیروں کے کارناموں کو اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ترلوک سنگھ نے اپنے رومانوی ناولوں کے ذریعے پنجابی ناول کی تاریخ میں اپنا نام درج کروایا ہے۔ ان کے ناولوں میں ''دِل دھڑکے میرا''، ''لگیاں توڑ نبھیاں''، ''صبر دا گھٹ''، ''مہارانی جندا''، سکھ راج دِیاں سمیاں'' اور گرداس ننگل دے شہید'' وغیرہ شامل ہیں۔ سنت اپندر سنگھ چکرورتی نے اپنے ناولوں کے ذریعے ''نام دھاری لہر'' کا پیغام اور گو کا لہر کے مقاصد کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے تین ناول ''بیت راگ''، ''اڑبنگی'' اور ''جے'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور شاعر درشن سنگھ آوارہ اور کہانی کار نرنگ سنگھ نے بھی اس دور کے ناول نگاروں کی فہرست کو شامل کروایا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے دور کے پنجابی ناول میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ دوسرے دور کے پنجابی ناول نگاروں نے روایتی تاریخی و مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری موضوعات کو بھی

اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ مذہبی ہیروں کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے کرداروں کو اپنے ناولوں میں بسایا ہے۔

تیسرا دور (ترقی یافتہ دور):

پنجابی ناول کے تیسرے دور کو ترقی یافتہ دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان اور سماج کے آپسی رشتے کی ساری سرگرمیوں کو اس طریقے سے پیش کیا گیا ہے جیسے ہم اپنی کھلی آنکھ سے کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ اسی وجہ سے اس میں مصنوعی کرداروں کی جگہ اصلی اور زندہ جاوید کردار پائے جاتے ہیں۔ اس دور کا پنجابی ناول مذہبی درس دیتا ہوا بھی دکھائی نہیں دیتا

یہ بات مُصدقہ کہ فنکار اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ جو دیکھتا ہے، جیسے ماحول میں جیتا ہے، انہی خیالات و واقعات کو اپنی تحریروں میں پرو دیتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانیوں کی زندگی، اُن کا سماج، ملکی نظام سب کچھ بدل گیا۔ بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کا خاتمہ ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سورج ڈوب گیا۔ ہندوستان میں جمہوری نظام قائم ہوگیا اونچ نیچ، چھوت چھات جیسی سماجی برائیوں کا کافی حد تک خاتمہ ہوگیا۔ ملک کے سامنے نئے چیلنج تھے یعنی ہندوستان کو نئے سرے سے، نئے اصولوں کے تحت ترقی کی راہوں پر گامزن ہونا تھا۔ یہ سبھی اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ ادیبوں نے بھی ملک کو ترقی کی راہوں پر ڈالنے اور ہندوستانیوں کو ایک جٹ کرنے کے لئے کمر کس لی۔ نتیجے کے طور پر ادبی اصناف کا رُخ بھی بدل گیا۔

پنجابی ناول جس پر اب تک تاریخی اور مذہبی رنگ غالب تھا۔ ایک نئے روپ میں ابھر کر سامنے آیا۔ پنجابی ناول میں روایتی مذہبی واقعات اور تاریخی ہیروں کا دور ختم ہوگیا۔ پنجابی ناول نے حقیقی دنیا میں سانس لینی شروع کی۔ تیسرے دور کا پنجابی ناول پہلے دو ادوار بلکہ مختلف اور نئے پیرائے میں رنگا ہوا ہے۔

اس دور کا سب سے اہم ناول نگار سوہن سنگھ سیتل ہے۔سوہن سنگھ پنجابی کا پہلا ناول نگار ہے جس نے اپنے ناولوں میں ماجھے کی دیہاتی زندگی سے جڑے مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔اس پیرائے میں اس نے ''پت بنتے قاتل''،''دیوے دی لو'' وغیرہ ناول تخلیق کئے ہیں۔ 1947 میں ہوئی پنجاب کی تقسیم کے درد کو اُس نے ''تو تاں والا کھوہ'' اور ''ایچوگیل نہر تک'' جیسے ناولوں میں پیش کیا ہے۔

سوہن سنگھ سیتل کو اُس کے ناول ''جُگ بدل گیا'' پر بھارتیہ ساہتیہ اکادمی کا انعام حاصل ہوا۔ یہ ناول حقیقی رنگ میں لکھا گیا ایک مشہور ناول ہے۔اس ناول میں موصوف نے بدلتی ہوئی انسانی قدروں قیمتوں کا ذکر کیا ہے۔

کرتار سنگھ دوگل ترقی یافتہ پنجابی ناول کا بانی مانا جاتا ہے۔اُس نے پہلی بار پنجابی ناول میں فرائڈ کے نظریات پیش کئے ہیں۔ان کے پہلے دو ناولوں کو چھوڑ کر باقی کے سبھی ناول ۱۹۶۰ء کے بعد منظر عام پر آئے۔ دوگل کے ناولوں کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت سے جڑے مسائل ہیں۔انسانوں کے علاوہ موصوف چرند و پرند کے جذبات کو پیش کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

کرتار سنگھ دوگل کے ناولوں میں ''آندراں'' ''اُس دِیاں چوڑیاں''، ''ایک دل بکاؤ ہے''، ''دِل دریا''، ''حال مریداں دا''، ''من پردیسی''، ''ماں پیو جائے''، ''امّی نوں کی ہو گیا؟''، ''درد نہ جانے کوئی''، ''میں توں پریم دیوانی''، ''پھولاں دا ساتھ''، ''نانک نام چڑھدی کلا''، ''تیرے بھانے سربت دا بھلا'' وغیرہ ناول شامل ہیں۔

گردیال سنگھ پنجابی ناول کا ایک اہم نام ہے۔اُس نے پنجاب کے جاگیرداری نظام سے لے کر سرمایہ داری نظام کو اپنے ناولوں میں موضوع بنایا ہے۔اُس نے ملوئی بھائی چارے میں آرہی گراوٹ پر بھی چوٹ کی

ہے۔گردیال سنگھ نے پنجابی ناول میں پہلی بار نچلے درجے کے دیہاتی سماج کو پنجابی ناول میں جگہ دی ہے اور اُن کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔

گردیال سنگھ کے ناول پنجابی ناول کا عظیم ورثہ ہے۔ ان کے چند مشہور ناولوں میں ''مڑہی دا دیوا''، ''ان ہونی''، ''ریتے دی اِک مٹھی''، ''ادھی چانِنی رات''، ''انھے گھوڑے دا دان''، ''پوہ پھٹالے توں پہلاں'' اور ''پرسا'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سرجیت سنگھ سیٹھی اصل میں ڈرامہ نگار ہیں۔ ڈراموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سیٹھی کے ناولوں کے کردار اُس کے ناولوں کے جان ہیں۔ موصوف کے مشہور ناولوں میں ''ریت دا پہاڑ''، ''اِک شہر دی گل''، ''سیل پتّھر''، ''ایک خالی پیالا''، ''کل بھی سورج نہیں چڑھے گا'' اور ڈوبدے سورج نوں سلام'' وغیرہ شامل ہیں۔

سیٹھی کا ناول ''کل سورج نہیں چڑھے گا'' پنجابی کا ایک شاہکار ناول ہے۔ موصوف نے اس ناول میں جلیانوالے باغ کے خونی سانحہ کا دل خراش نقشہ کھینچا ہے۔ اس ناول میں انگریز ظالم جنرل ڈائر کے کردار کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔

موہن کاہلے اس دور کا ایک منفرد انداز کا ناول نگار ہے۔ اس نے ''مچھلی ایک دریا دی''، ''بیڑی تے بریتاں''، ''پردیسی رُکھ''، ''گوری ندی دا گیت''، ''بارہ دری دی رانی''، ''میں کنواری نہیں رہی''، ''وگدے پانی'' جیسے ناول تخلیق کئے ہیں۔ موہن کاہلے کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے پہلی بار پنجابی ناول میں راوی دریا کے کنارے بسے مشرقی پنجاب کے ضلع گرداسپور کے ملاحوں، گوجروں اور دوسری جاتیوں کے واقعات، حادثات اور مسائل کو پیش کیا ہے۔

سکھ ویر پنجاب کے مہانگروں کے تیز رفتار زندگی کو بیان کرنے والا ناول نگار ہے۔سکھ ویر نے اپنے ناولوں میں پنجاب کے مہانگروں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو پیش کیا ہے۔موصوف پنجابی کا واحد ناول نگار ہے جس نے اپنے ناولوں میں مہانگروں کو سمویا ہے۔موصوف کے قابل ذکر ناولوں میں ''پانی کا پُل''،''رات دا چہرہ''،''سڑکاں تے کمرے''،''اکھڑے ہوئے پیر''،''ادّے پونے''اور''گردش''وغیرہ شامل ہیں۔

بلاشبہ امریتا پریتم پنجابی ناول کا سب سے بڑا نام ہے۔موصوفہ کو ہندوستان بھر میں ادب کے شعبے میں ملنے والے سبھی اعزازت سے نوازا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ امریتا پریتم کے ناولوں کو دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔بلاشبہ امریتا پریتم پنجابی ناول کا سب سے بڑا اور مشہور نام ہے۔

امریتا پریتم جہاں اپنے شروعاتی دور کے ناولوں میں ۱۹۴۷ء کے دکھ کو بیان کرتی ہیں وہیں اپنے بعد کے ناولوں میں عورت کے سماجی، روحانی اور جسمانی مسائل کو موضوع بناتی ہے۔موصوفہ کے مشہور ناولوں میں ''جے شری''،''ڈاکٹر وید''،''پنجر''، ''آلنھا''،''آنسو''،''دھرتی ساگر اور سیپیاں''،''دلّی دِیاں گلیاں''،''جیب کترے''،''پکّی حویلی''،''اک دا بوٹا''،''اگ دی لکیر''،''کچّی سڑک''،''کوئی نہیں جانتا''،''انہاں دی کہانی''،''ایہہ سچ ہے''،''کورے کاغذ''،''نہ رادھا نہ رکمنی''،''رتنا''وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

امریتا پریتم پنجابی کی پہلی خاتون قلم کار ہے۔جس نے اپنے ناولوں میں عورت کے جذبات، احساسات کو بیان کیا ہے۔امریتا پریتم ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔اس کی شاعری کے نمونے اس کے ناولوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔جس سے اُن کے ناول پنجابی ناول میں انفرادیت کا مقام رکھتے ہیں۔انگریزی کے اخبار''the tribune''میں لکھتے ہیں

Always amrita ,always pritam she put punjabi literature

on the world map .no one writer is as synonymous with punjabi literature as amrita pritam (1919_2005)a familiar name even for those not acquainted with punjabi.she cocked a snook at convention and defied social norms.there were no splitbetween life and literature for amrita pritam because literature was her work

(the tribune ,saturday november, 2005)

دلیپ کور ٹوانہ لگ بھگ پچھلی پانچ دہائیوں سے ناول تخلیق کر رہی ہیں ۔موصوفہ نے بھی امریتا پریتم کی طرح اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کے یہاں عورت دو روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ پہلے روپ میں وہ غلامی کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے اور دوسرے روپ میں وہ پڑھی لکھی ہے جو سماج کی بندوشوں سے آزادی حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ دلیپ کور ٹوانہ کے تحریر کردہ ناولوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ پھر بھی ان کے چند نمائندہ ناولوں میں ''اگنی پرکھیا''،''ایہو ہمارا جیونا ''،''پیلی دا نشان''،''دوسری گیتا''،''ہستاخر''،''لنگ گئے دریا'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اجیت کور بھی پنجابی کی نامور خاتون قلم کار ہے۔ناولوں کے علاوہ موصوفہ نے مختصر کہانی میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ پنجابی کی دوسری خواتین قلمکاروں کی مانند اجیت کور نے بھی عورت کے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اس کے مشہور ناولوں میں ''پوسٹ مارٹم''،''فالتو عورت''،''دھوپ والا شہر''،'' کٹیاں لکیران'' کے نام لئے جاسکتے ہیں۔اجیت کور ناول نگاری میں بھی اختصار کی قائل نظر آتی ہے۔موصوفہ کے ناول

سائز میں چھوٹے ہیں اسی وجہ سے کچھ نقاد موصوفہ کے ناولوں کو ناولٹ کا نام دیتے ہیں۔ اجیت کور نے شہری اور مہا نگروں کی پڑھی لکھی عورتوں کے مسائل سے ہمیں روبرو کروایا ہے۔

بلجیت کور بلّی بھی اس دور کا ایک اہم ناول نگار ہیں اس کا ناول ''ٹھری رات'' بہت زیادہ مقبول ناول ہے۔ حقیقت نگاری پر مبنی اپنے اس ناول میں موصوف نے پنجاب کے کسانوں کی آپسی دشمن کو دکھایا ہے۔ اس کے دوسرے ناولوں میں ''اپنے چھاویں''، ''دھوپ کی باٹ'' اور ''گوآچے سورج'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہرنام داس صحرائی روایتی قسم کا ناول نگار ہے۔ اس کے تحریر کردہ ناولوں کی تعدا بہت زیادہ ہے۔ موصوف کے زیادہ تر ناول تاریخی نوعیت کے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ''لوہ گڑھ''، ''سفید پوش''، ''انوپ کور''، ''گلی محلّے دے لوگ''، ''ڈاچی''، ''ترشنکو''، ''گل موہر''، ''زر جورو زمین''، ''ادھی گھڑی''، ''شہادت''، ''بیگم حضور''، ''بابا صاحب سنگھ بیدی''، ''ستلج''، ''میری پیری''، ''بھگت نامدیو'بی بی بھانی''، ''لاڈلیاں فوجاں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہری سنگھ دلبر نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی، قدیم سکھ سماج کے علاوہ کچھ اور تاریخی موضوعات کو اپنایا ہے۔ ان کے ناولوں میں ''باری آپواپنی''، ''سانوں بھل نہ جانا''، ''حلوارا'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کیسر سنگھ پنجابی کا واحد ناول نگار ہے جس نے پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب اور ہندوستان سے باہر لے جا کر انٹرنیشنل حادثات اور واقعات کو اپنے ناولوں کا حصّہ بنایا ہے۔

اس دور کے دوسرے اہم ناول نگاروں میں رام سروپ، مہیندر سنگھ سرنا، نرنجن سنگھ تسنیم، کرم جیت سنگھ کوسا، اوم پرکاش گاسو، سنتوکھ سنگھ دھیر، جسونت سنگھ وری، بوٹا سنگھ، بوٹا سنگھ شاد، کے۔ ایل گرگ، بھوپیندر سنگھ، اوم پرکاش شرما، اجیت سینی، امر سنگھ سیتل، ایس. ساقی، پریتم سینی، گیانی بھجن سنگھ، سریندر سنگھ جوہر، گرمکھ سنگھ

جیت، جسبیر بھولر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سیندر، ہری سنگھ بھارتی، گردیال سنگھ پُھل، ترلوک سنگھ طوفان گیانی، درشن متوا، ڈاکٹر نریش، پرگٹ سنگھ، ہرمیت ڈھلوں نے بھی اس دور میں پنجابی ناول تخلیق کئے ہیں۔

پنجابی ناول تقریباً ڈیڑھ صدی کا سفر کرنے کے بعد آج دنیائے ادب کے مدِ مقابل کھڑا ہے۔ پنجابی ناول کا آغاز تاریخی اور مذہبی ناولوں سے ہوا۔ شروعاتی دور میں زیادہ تر ناول نگار سکھ مذہب کا درس اور اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے پنجابی ناول کے ذریعہ سکھ مذہب کی دعوت وتبلیغ کا کام کیا۔ اس کے علاوہ پنجابی ناول کے شروعاتی دور میں ناولوں کے کردار سکھ مذہب کے گورو، سپہ سالار اور دوسرے بہادر جنگ جو تھے جن کو ناول نگاروں نے ڈرامائی اور کرشمائی انداز میں تخلیق کیا تھا۔ جیسے ہی پنجابی ناول اپنے ابتدائی دور سے باہر آیا تو اس پر دنیا بھر میں چل رہی تحریکات اور انقلابات کے اثرات مرتب ہوئے۔ پنجابی ناول نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سمو لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجابی ناول کا دائرہ تاریخ اور مذہب کی زنجیریں توڑ کر سماجی، معاشی، سیاسی اور انقلابی رنگ میں رنگ گیا۔ اس کے علاوہ دنیا کے عظیم فلاسفروں فرائڈ اور مارکس کے نظریات سے بھی پنجابی ناول متاثر ہوا۔ آزادی کے بعد پنجابی ناول نے ایک اور اہم موڑ لیا۔ اس دور کو ترقی یافتہ پنجابی ناول کے دور سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں پنجابی ناول نگاروں نے حقیقت نگاری کو اپنے ناولوں میں استعمال کیا۔

اس مختصر سے مضمون میں پنجابی ناول کے آغاز سے لے کر پنجابی ناول کی ترقی کی مختلف منازل کا سرسری طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆☆☆

پرواسی پنجابی ناول

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں پنجابیوں نے بہتر روزگار کی تلاش میں دنیا بھر کے مما لک کو اپنا مسکن بنایا۔جس کے نتیجے میں آج پوری دنیا خاص طور پر کینیڈا، انگلینڈ اور امریکہ میں لاکھوں کی تعداد میں پنجابی آباد ہیں۔انہوں نے یہاں پر رہتے ہوئے بھی اپنی ماں بولی پنجابی زبان کو سینے سے لگائے رکھا اور اپنی نئی نسل کو پنجابی میں تعلیم دلوانے کے وسائل بھی دستیاب کئے ہیں۔جس کے نتیجے میں ان دیشوں میں آباد پنجابی، پنجابی بولتے ہی نہیں ہیں بلکہ پنجابی میں لکھتے بھی ہیں۔ان پرواسی قلم کاروں نے پنجابی ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور پنجابی زبان و ادب کو نئے موضوعات سے مالا مال کیا ہے۔

ان پرواسی قلم کاروں میں کیلاش پوری کا نام سرِ فہرست ہے۔ موصوف نے اپنے ناولوں میں انگلینڈ کے مرد اور عورت کے رشتوں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ''میں ایک عورت ہاں''، ''کٹہرے میں کھڑی عورت''، ''سوجی روتی رہی'' وغیرہ ان کے پرواسی زندگی سے جڑے اہم ناول ہیں۔ کیلاش پوری کی خصوصیت ہے کہ اُس نے مختلف مما لک کی پرواسی عورتوں کی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی زندگی کے مختلف نشیب وفراز کو اپنے ناولوں میں قلم بند کیا ہے۔

رگھویر ڈھنڈ کا ناول ''رشتیاں دی یاترا'' انسانی رشتوں کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بہتر مستقبل کی تلاش میں ہجرت کر کے گئے پرواسیوں کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ ڈھنڈ نے بڑی باریک بینی سے ان دیشوں کے حالات پیش کئے ہیں۔

درشن سنگھ دھیر پرواسی پنجابی ناول کا ایک اہم نام ہے۔ جنھوں نے اپنے ناولوں میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا موازنہ کیا ہے۔ ناول ''گھرتے کمرے'' اور ''پیڑاں دے آر پار'' میں دھیر نے پرواسی بھائی چارے کا نیا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ یہ دونوں ناول پرواسیوں کی نئی نسل کے جذبات، احساسات اور خواہشات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے ناول ''اے لوک''، ''لکیراں تے منخ''، ''اجنبی چہرے'' اور ''رن بھومی'' ہیں۔ جن میں موصوف نے اپنے آبائی وطن کی یادوں کو دہرایا ہے۔

سورن چندر بھی پرواسی پنجابی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ سورن چندر نے اپنے ناولوں میں مارکس وادی نظریے کو پیش کیا ہے۔ ناول ''کچّے گھر'' میں انہوں نے پرواسی زندگی کی دفتری مصروفیت کو بیان کیا ہے۔ ناول ''قدراں قیمتاں'' میں اُس نے پنجابی تہذیب اور مغربی تہذیب کی انسانی قدروں قیمتوں میں بڑی خوبصورت سے فرق واضح کیا ہے۔

باب دوم:

اُردو سے پنجابی میں درآمد ناول

ا۔	آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
۲۔	ایک چادر میلی	راجندر سنگھ بیدی
۳۔	گئودان	پریم چند

۱۔ آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر۔تعارف

قراۃ العین حیدر کا نام اُردو ادب میں ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہے جو آسمان ادب پر ہمیشہ روشن رہے گا۔اُردو فکشن میں قراۃ العین کا نام اہمیت کا حامل ہے۔موصوفہ نے بطور ناول نگار و افسانہ نگاری کے طور پر اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔

عینی آپا۔مختصر تعارف:

قراۃ العین ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ کو علی گڑھ اتر پردیش میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد کا نام سجاد حیدر یلدرم اور والدہ کا نام نذر سجاد حیدر تھا۔سجاد حیدر یلدرم کا تعلق ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ان کے خاندان میں علم کی وراثت ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی اور ان کے گھرانے کی عورتیں پڑھی لکھی تھیں۔یلدرم کی نانی سیدہ ام مریم نے قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔قراۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر شادی سے پہلے بنت الباقر کے نام سے ''تہذیب نسواں''، ''پھول'' اور دیگر رسائل میں مضامین لکھا کرتی تھیں شادی کے بعد وہ نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھنے لگیں۔

قراۃ العین حیدر کا ابتدائی نام نیلوفر تھا۔لیکن بعد میں ان کے ماموں جان سید افضل علی نے نیلوفر بدل کر قراۃ العین حیدر عرف عینی رکھا۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''قراۃ العین حیدر کو میں نے پہلی بار جب اس کی عمر ڈھلنے والی تھی یا ڈھل چکی تھی۔بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت افسانہ نگار کی جو تصویر میرے لڑکپن میں رسالوں میں چھپتی تھی۔اب وہ تصویر سے بالکل مختلف تھی۔ہم دونوں کی پہلی ملاقات سے پہلے وہ انگریزی صحافت میں بھی اپنا نام روشن کر چکی تھی اور ممبئی کے دو بڑے

انگریزی رسالوں ایک ہفتہ وار اور ایک ماہوار کے اسٹاف میں وہ باقاعدگی سے کام
کرتی تھی ان کے معاصرین انھیں ''عینی'' آپا کہتے ہیں اور بعض لوگ عموماً عینی آپا
کہہ کر انھیں مخاطب کرتے ہیں۔ میں انھیں عینی آپا کبھی نہ کہتا تھا لیکن کبھی کبھی عینی
ضرور کہہ دیتا تھا جو شاید انھیں ناگوار گزرتا تھا۔''

(نیا دور، سنیل کمار، ص۴)

قراۃ العین حیدر نے اپنی ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں حاصل کی پھر وہ لکھنو کے مشہور ازبیلا تھوبرن کالج سے بی۔اے پاس کیا۔اس کے بعد لکھنو یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔قرۃ العین حیدر کو ادبی ماحول ورثے میں ملا۔انہوں نے کم عمری ہی میں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ان کی پہلی کاوش ''چوھیا کی کہانی''، بچوں کے اخبار ''پھول'' لاہور میں اشاعت پذیر ہوئی۔اس کے علاوہ اس زمانے میں ان کی کہانی ''یہ باتیں''، اردو کے مشہور رسالے ''ہمایوں'' میں شائع ہوئی۔

تقسیم ملک کے بعد کچھ مدت پاکستان میں سکونت پذیر رہیں۔وہاں بہت بڑے بڑے عہدوں پر تعینات رہیں ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات میں انفرمیشن آفیسر مقرر ہوئیں۔انہوں نے ڈاکومنٹری فلموں کے پروڈیوسر کے علاوہ پاکستانی ایر لائنز میں بھی کام کیا۔۔اسی اثناء میں ان کا شہرت یافتہ ناول ''آگ کا دریا'' شائع ''ہوا جس پر پاکستان میں تنازعہ شروع ہوگیا۔قرۃ العین حیدر اس سے گھبرا گئیں اور وہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلی آئی ۱۹۶۴ء کے دوران وہ ممبئی میں کیریئر ایڈیٹر رہیں۔وہ سنٹرل بورڈ آف فلمز سے بھی منسلک رہیں۔۱۹۶۷ء میں انھیں افسانوں کے مجموعے ''پت جھڑ کی آواز'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں اُنھیں تراجم پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ عطا کیا گیا۔۱۹۸۴ء میں وہ شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وزیٹنگ پروفیسر رہیں۔۱۹۸۴ء میں پدم شری اور غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔۱۹۹۰ء میں

انھیں اُن کی ادبی خدمات پر ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا ۱۹۹۴ء میں ساہتیہ اکادمی فیلوشپ سے نوازا گیا۔

قراۃ العین حیدر نے بہت سے افسانے، ناول اور ناولٹ لکھے جن کی وجہ سے انہوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ قرۃ العین حیدر اُردو ناول نگاری کا ایک روشن باب ہے۔ موصوفہ نے اپنے منفرد انداز سے اُردو ناول نگاری کو ایک نیا رخ دیا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل سات ناول لکھے۔

۱۔	میرے بھی صنم خانے	۱۹۴۹ء
۲۔	سفینۂ غم دل	۱۹۵۳ء
۳۔	آگ کا دریا	۱۹۵۹ء
۴۔	آخر شب کے ہم سفر	۱۹۷۱ء
۵۔	گردش رنگ چمن	۱۹۸۸ء
۶۔	کار جہاں دراز ہے	۱۹۹۰ء
۷۔	چاندنی بیگم	۱۹۹۰

ناولوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار افسانے بھی لکھے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' ۱۹۴۷ء میں، ۱۹۵۴ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ ''شیشے کا گھر'' میں اور ۱۹۶۵ء میں تیسرا افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز''، ۱۹۸۲ء میں چوتھا افسانوی مجموعہ ''روشنی کی رفتار'' اور ۱۹۹۰ء میں پانچواں اور آخری مجموعہ ''جگنوؤں کی دُنیا شائع ہوا۔

ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے علاوہ ترجمہ نگاری بھی قرۃ العین کا پسندیدہ میدان تھا۔ موصوفہ نے بہت سی مختلف زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ہمیں چراغ ہیں ہمیں پروانے

۲۔ الپس کے گیت

۳۔ ماں کی کیتھی

۴۔ آدمی کا مقدر

۵۔ کلیسا میں قتل

۶۔ تلاش

۷۔ یوودکیہ

افسانے، تراجم اور ناولوں کے علاوہ مس حیدر نے ناولٹ نگاری میں اپنے جوہر دکھائے جن میں ''دل رُبا''، ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' اور ''فصل گل آئی یا اجل آئی''، وغیرہ اہم ناولٹ ہیں۔

آگ کا دریا

’’آگ کا دریا‘‘ قراۃ العین حیدر کا شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ۶۴۲ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں قراۃ العین حیدر نے انگریزی میں The river of fire کے نام سے ترجمہ کیا پنجابی میں اس کا ترجمہ سُکھ بیر جس کا اصلی نام الیاس بلبیر سنگھ تھا۔ ناول کا آغاز ٹی۔ ایس۔ ایلٹ کی نظم سے کیا گیا ہے۔ ناول میں مس حیدر نے ایک نئے انداز ’’شعور کی رو‘‘ کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ تکنیک سجاد ظہیر نے اپنے ناول ’’لندن کی ایک رات‘‘ میں اور حیدر نے ’’میرے بھی صنم خانے‘‘ میں بھی اس تکنیک کا تجربہ کیا تھا۔ ناول آگ کا دریا پونے آٹھ سو سال کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے گوتم بدھ کے زمانے سے شروع ہو کر تقسیم ہند کے المیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر خود لکھتی ہیں:

> ’’ملک کیوں تقسیم ہوا؟ کیا تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی؟ اس سوال نے مجھے فلسفہ تاریخ کی سمت کھینچا۔ اس کا جواب ان کی کوشش میں ایک ناول ’’آگ کا دریا‘‘ لکھا۔ دریا کو کوزے کا symbol بنا کر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور اُلجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔‘‘

(بیسویں صدی میں اُردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست، ص ۱۰)

۱۹۴۷ء میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ آزادی ملتے ہی پورے ملک میں فرقہ پرستی فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوستان کے لوگ الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے۔ ہر طرف انتقام اور نفرت کی آگ پھیل گئی ان تمام مناظر کا قراۃ العین حیدر نے بڑے اچھے انداز میں پیش کیا لکھتی ہیں:

''اگست کی بارش اب کے ایسے ٹوٹ کر برسی کہ زمین آسمان میں ڈوب گئی۔ بارش کا
پانی جو شفاف تھا۔ شرون کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی اس میں خون
تھا۔خون کی برکھارت خون کی کیچڑ برسانے والے بال گھومتی ندی جو بہہ رہی
تھی۔حالانکہ یہ صرف ڈوبتے ہوئے سورج کا عکس تھا پھولوں پر خون تھا۔انسانوں
کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔''

(آگ کا دریا،ص ۴۶۶)

قراۃ العین حیدر تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلی گئی۔ناول ''آگ کے دریا'' پر تنازعہ ہوا تو واپس ہندوستان چلی آئی۔اس طرح انہیں ہندوستان اور پاکستان کے حالات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔انہوں نے پاکستانی معاشرت اور حکومت کی سخت مذمت کرتے ہوئے اُس پر تنقید کی۔لیکن اس کے باوجود'' آگ کا دریا ''،تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا بہترین ناول ہے۔رضیہ سجاد ظہیر کا قول ہے:

''آگ کا دریا میں ایسا بین الاقوامی رنگ ہے جو اُردو کے دوسرے ناول میں نظر نہیں
آتا۔اس پر یہ رنگ چھایا ہے کہ اب انسان اگر دُنیا کے کونے میں کوئی درد محسوس
کرے تو یقیناً اس درد کا رشتہ تمام دنیا سے جڑا ہوگا۔''

(ناول کا فن اور نظریہ، ڈاکٹر محمد یاسین،ص ۳۰)

موصوفہ نے ناول کے آغاز میں ٹی۔ایس۔ایلٹ کی نظم پیش کی ہے۔جس میں ایلٹ نے وقت کو دریا کہا ہے کہ جس طرح دریا رواں دواں رہتا ہے اسی طرح وقت بھی چلتا رہتا ہے اور وقت کا خاتمہ نہیں ہوتا ہے جو مسلسل چلتا رہتا ہے۔ایلٹ وقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا

ایک طاقت ور مٹیلا دیوتا ہے۔تندمزاج غصیلا

اپنے موسموں اوراپنے غیض وغضب کا مالک' تباہ کُن

ان چیزوں کی یاد دِلاتا رہتا ہے جنھیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں

وہ منتظر ہےاور دیکھتا ہےاور منتظر ہے

دریا ہمارے اندر ہے سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے

اس ناول میں قراۃ العین حیدر نے ہندوستانی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کو چار کہانیوں میں پیش کیا ہے۔

پہلا حصہ قدیم ہندوستانی تاریخ کو دوہراتا ہے۔

دوسرے دور میں مسلم دورِحکومت کا ذکر کیا ہے۔

تیسرے حصّہ میں اودھ کے حکمرانوں کے زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔

اورآخری حصے میں تقسیم وطن کے حالات وواقعات کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔

ناول میں موضوع بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ان کے ناولوں میں ہمیشہ ایک واضح موضوع ملتا ہے۔انہوں نے ہندوستان کی سیاسی ،سماجی ،تاریخی اور معاشی پس منظر کو سامنے رکھ کر اپنے ناولوں کے موضوع منتخب کیئے ہیں۔مس حیدر کا ناول''آگ کا دریا''ایک جدید ترین ذہن کی نمائندگی کرتا ہے ۔اس ناول کا پلاٹ قدیم ہندوستان کی تہذیب کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔اس تہذیب کے پس منظر میں ویداور گیتا کے حکیمانہ اقوال اورمنتر ملتے ہیں۔ یہاں علم کے دریا بہتے ہیں۔ناچ' رنگ' موسیقی کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ڈاکٹر ایوب خان لکھتے ہیں:

''قراۃ العین حیدر نے ناول '' آگ کا دریا''، تقسیم ہند کے ناگفتہ حالات سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اپنے دلی جذبات واحساسات کو نہایت سلیقہ شعاری سے ایک ناول کی ہیئت میں قلم بند کیا اور تاریخ کے جھروکوں سے وقت کے بہتے دریا میں اذیت ناک لمحوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جن کی جھلک تقسیم ملک سے متاثرہ لوگوں کے لیے مرہم کا کام انجام دیتی ہے۔''

(آگ کا دریا' تفہیم و تجزیہ۔محمد ایوب خان' ص۔۳۰)

اس ناول میں گوتم نیلمبر کا ہندوستان، ابوالمنصور کمال الدین کی آمد، قبل از تقسیم اور تقسیم کے بعد کا دور پیش کیا گیا ہے۔ آگ کا دریا میں حیدر نے ناول کے پلاٹ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہر عہد میں نوجوان نسل کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پہلے دور میں ویدک عہد کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس دور میں ایک نوجوان طالب علم نیلمبر جو برہمن ہے اور جدید ذہن رکھتا ہے اور پانچ سال کی عمر میں حصول تعلیم کے لئے گھر سے شراوستی کے جنگلوں میں گورو پرسوتم کی کٹیا میں بھیجا۔ جب وہ اودھیا سے شرواستی کو جا رہا تھا تو سرجو ندی کے کنارے اسے دو لڑکیاں چمپا اور نرملا نظر آتی ہے۔ گوتم چمپا سے متاثر ہوتا ہے۔ چمپک ایودھیا کے راج گرو کی بیٹی ہے۔ اُسے رقص کا شوق تھا۔ وہ نرم دل رکھنے والی لڑکی تھی۔ گوتم نیلمبر اور چمپا ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ لیکن اس کا برہم چاری جیون تھا۔ جس میں کسی لڑکی کے بارے میں سوچنا گناہ تھا۔ لیکن وہ چمپا کے خیال کو دماغ سے دور نہیں کر پاتا ہے۔ وہ اس کے متعلق نظمیں لکھتا ہے، تصویریں بناتا ہے۔ آشرم میں اُس کی ملاقات ہری شنکر سے ہوتی ہے دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کچھ عرصے کے بعد شراوستی چندر گپت موریہ کا حملہ ہوتا ہے۔ جس میں لڑتے لڑتے گوتم کی انگلیاں کٹ جاتی ہیں۔ چمپا کی شادی ایک فوجی افسر سے ہوتی ہے جو پچاس سال کا موٹا چالاک برہمن تھا۔ چمپا اس بچے کی ماں بن کر امیر گھرانے کی گرہست عورت کی زندگی گزارنے لگتی ہے۔

گوتم نیلمبر کی انگلیاں خراب ہونے کے بعد وہ ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ وہ چمپا کی یاد دل سے نہیں نکال سکا۔ اسی دوران اُن کی مُلاقات کاشی کی نائکہ سے ہوتی ہے۔ وہ ناٹک منڈلی میں گوتم کو شامل کر لیتی ہے۔ وہاں گوتم ناٹک کے دوران گوتم چمپا بھی عورتوں کے درمیان ناٹک دیکھ رہی ہے۔ دونوں کی آنکھیں ملتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ چمپا کی ازدواجی زندگی دیکھ کر گوتم چمپا کا پیغام ملنے پر اس سے ملنے سے انکار کرتا ہے اور گوتم ناٹک منڈلی چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے اور پھر ناول نگار سرجوندی کی طرف رخ کرتی ہے اور شنکر اس کو آوازیں دیتا ہے اور اپنے طرف بلاتا ہے۔ لیکن گوتم نیلمبر سرجو کی خطرناک لہروں کا مقابلہ نہیں کر پاتا ہے اور سرجو کی تیز لہروں تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہندوستان میں مسلمان داخل ہوتے ہیں۔

ناول کا دوسرا حصہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب افغان سندھ اور پنجاب سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان افغان مسلمانوں میں ایک شخص ابوالمنصور کمال الدین ہے جو کہ جونپور کے حسین شرقی کے دربار میں کتب خانے کا نگراں بن کر آیا ہے۔ بحیثیت محقق وہ ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتا ہے۔ اس دوران ایودھیا میں ایک برہمن لڑکی چمپا سے اُس کی جان پہچان ہوتی ہے اور چمپا بھی کمال سے بے پناہ محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن جنگ کے دوران دونوں جُدا ہو جاتے ہیں۔ کبیر چمپا کو نہ پا کر کاشی کا رُخ کرتا ہے اور کبیر کا بھگت بن جاتا ہے۔ اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بھگتی کی زندگی گزارنے کے بعد آخری وقت میں جب وہ دوبارہ واپس آیا جہاں وہ حسین شرقی کو چھوڑ کر کاشی کی طرف نکل گیا تھا واپس آنے پر وہاں پہلے جیسا دور نہیں رہا تھا وقت اور حکومتیں بدل چکی تھیں۔ دوبارہ بنگال آنے کے بعد ابوالمنصور وہاں کی ایک لڑکی شنیلا سے شادی کرتا ہے۔ اور اس کا نام آمنہ رکھتا ہے۔ جس کے بطن سے دولڑ کے

پیدا ہوتے ہیں ۔ابوالمنصو ر اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے کھیتی کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔اور یہیں شیر خان کے سپاہیوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن جاتا ہے اور بنگال کی مٹی میں مدفن ہو جاتا ہے۔

ناول کا تیسرا حصہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔تیسرے دور میں نواب کمال الدین رضا عرف نواب کمسن اور پروفیسر نیلمبر دت کا دور ہے۔اس دور میں سرل ہارو ڈ ایشلے کو انگریزی تہذیب کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے ضمنی طور پر پیش کیا ہے۔اس عہد میں ابوالمنصو ر کمال الدین جو شرفی دور میں شاہی شان وشوکت سے ہندوستان آیا تھا وہ مرا نہیں بلکہ ابوالمنصو ر کی صورت میں زندہ جاوید ہے۔ابوالمنصو ر کمال الدین مسلم تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔مسلم قوم ہندوستان پر وارد ہوئی تھی ۔لیکن بعد میں اس تہذیب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک حصے میں فیڈرل طبقہ اور دوسرا حصہ مسلم طبقہ پہلے حصے میں نواب کمال رضا منسلک ہیں اور دوسرے حصے میں ابوالمنصو ر ہیں۔اس زمانے کا گوتم نیلمبر جو سرل کے یہاں ایک کلرک بن کر آتا ہے ترقی کرتے ہوئے پروفیسر نیلمبر بن جاتا ہے۔

ایک دن گوتم لکھنو آتا ہے یہاں اس کی ملاقات چمپا بائی مشہور طوائف سے ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے پر مر مٹتے ہیں۔لیکن ایک روز گوتم اس طوائف کو چھوڑ کر کلکتہ چلا جاتا ہے۔کافی عرصے بعد جب گوتم لکھنو اپنے بیٹے نرنجن سے ملنے چلا جاتا ہے جو لکھنو کے کنگ کالج میں پروفیسر ہوتا ہے۔گوتم وہاں ایک فقیر عورت سے ملتا ہے یہ وہی عورت ہے جو ایک زمانے میں لکھنو کی بہت مشہور طوائف رہ چکی تھی۔اب وہ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔جب گوتم کا بیٹا اپنے والد سے مل کر اپنے کمرے میں واپس آجاتا ہے تو پروفیسر گوتم نیلمبر کوٹھی کے برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر ندی کے کنارے چل پڑتا ہے اور صبح ہونے تک یہ دور اپنے اختتام تک پہنچتا ہے۔

یہ دور قرۃ العین کا اپنا دور ہے ۔ناول کے چوتھے دور میں ''میرے بھی صنم خانے'''' اور سفینۂ غم دل

''شروع ہوتا ہے۔اس حصے میں نواب کمسن اور پروفیسر نیلمبر دت کی اولادیں یوپی کے اونچے طبقے کی تعلیم یافتہ بن کر اُبھرتی ہے۔جو ذہنی حساس کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں۔ان میں گوتم ،کمال، ہری شنکر، چمپا، احمد،طلعت ،نرملا اور ساجدہ ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی حد تک جذباتی اور اصول پرست ہیں جو ہندوستانی تہذیب اور روایات سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ان کے سپنوں میں سارے جہاں کا درد ہے۔

مختصر ''آگ کا دریا'' اُردو ناول نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔آگ کا دریا کے پلاٹ کی کہانی کا تانا بانا ہندوستان کی تہذیبی تاریخ سے مرتب کیا گیا ہے۔ پلاٹ بے حد پختہ ہے اس میں کسی قسم کا جھول نظر نہیں آتا ہے اس ناول میں مس حیدر کے کہانی کہنے کا کمال یہ ہے کہ جہاں ناول نگار نے ہندوستانی تہذیب کی نمایاں خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہیں بدلتی تہذیب اور تاریخی حالات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے۔اس ناول کا پلاٹ ہندوستانی تاریخ کے پس منظر میں اس کے کرداروں کی ذہنی وفکری کیفیات اور عمل کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ناول کا پلاٹ قدیم ہندوستانی تہذیب کو بیان کرتا ہے۔اس تہذیب میں ناچ اور موسیقی کے عناصر ملتے ہیں۔اس تہذیب میں مسلمان آتے ہیں۔لکھنو کی تہذیب اُبھرتی ہے اور پھر انگریز آجاتے ہیں اور نیا ہندوستان سامنے آتا ہے۔اور پھر ہندوستان تقسیم ہوجاتا ہے۔اس طرح یہ ناول ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے دس ہزار سالوں پر مشتمل ایک بہترین ناول تسلیم کیا گیا ہے۔

کردار نگاری اس ناول کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ناول کا ہر کردار کئی روپ لیے ہمارے سامنے آتا ہے مس حیدر نے ہر کردار کو ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنے ماحول،تہذیب اور دائرے کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔آیئے ہم اس ناول کے کرداروں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گوتم نیلمبر اس ناول کا سب سے اہم کردار ہے۔ جو تاریخی وتہذیبی ادوار کے اعتبار سے مختلف ناموں گوتم

نیلمبر (ویدک دور)، گوتم نیلمبر دت (انگریزوں کا ملازم)، پروفیسر نیلمبر دت (سرمایہ دار اور صاحب حیثیت) اور آخری دور کا گوتم (لکھنو کے ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا علمبردار)۔ ناول کے ابتدائی دور کا گوتم ویدک عہد کا کا طالب علم جو برہمچاری آشرم میں زندگی گُزارتا ہے۔ اور زندگی کی سب عیش وعشرت چھوڑ کر شراوستی کے گُرو پرشوتم کی کُٹیا میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ رُوح کا سکون حاصل کرنے کے لئے جنگلوں میں گھومتا ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات ہری شنکر بُدھ سے ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کا گوتم جنگلوں، شہروں اور دریاؤں کا سفر کرتا ہے۔ آیئے ابتدائی دور کے گوتم نیلمبر سے روبرو ہوتے ہیں:

> ''گوتم نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہوچکی تھی۔ گو اس کے پاؤں مٹی سے اُٹھے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے اشوک کی نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھنڈ میں ایک اکیلا مور پر پھیلا کے کھڑا تھا۔''

(آگ کا دریا، ص۱۳)

ایک روز گوتم کی ملاقات سرجو ندی کے کنارے چمپا سے ہوتی ہے تو گوتم اس پر فدا ہو جاتا ہے اور اس کی یاد میں تصویریں بناتا ہے لیکن چندر گپت موریہ کی فوجوں سے لڑتے لڑتے اس کی انگلیاں کٹ جاتی ہیں تو گوتم مصوری کو چھوڑ کر ایک ناٹک منڈلی میں شامل ہو جاتا ہے اور اداکاری کو اپنا پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسی دوران چمپا کی شادی ہو جاتی ہے اور ایک بچے کو بھی جنم دیتی ہے۔ جب چمپا دوبارہ گوتم کو دیکھتی ہے تو اس سے ملنے پر

اصرار کرتی ہے لیکن گوتم نہیں مانتا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ہندو مذہب میں شادی شدہ عورت کے لئے دوسرے مرد کا سایہ بھی حرام ہے۔ لیکن وہ گوتم کو بھول نہیں پاتی ہے۔ گوتم کے اس کردار سے ویدک عہد کے اس وقت کا طریقہ کار، تعلیم حاصل کرنے کے اصول سب کچھ پتا چلتا ہے کیونکہ برہمچاری زندگی کے بہت سے عیش وعشرت کو تیاگ دینا پڑتا ہے۔ جیسے عشق ومحبت، سراب ماس کی اجازت ہرگز نہ تھی۔ ننگے پاؤں پیدل سفر کرنا، کھانا بھیک مانگ کر اپنے گرو کے لئے پکانا۔ گوتم اپنے گرو کا فرماں بردار طالب علم تھا۔ مس حیدر ناول میں گوتم کی فرماں برداری کے بارے میں لکھتی ہیں:

''لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرماں برداراور عقیدت مند چیلا تھااور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا۔ لہذا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھریا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔''

(آگ کا دریا، ص ۳۴)

اس زندگی میں گوتم کے چوبیس سال گُزر چکے تھے۔ اور ایک دن گوتم کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ جب ایک روز جنگل میں کیمپ لگتا ہے جب ناٹک منڈلی لگتی ہے تو گوتم چمپا کے ساتھ خوب ناچتا ہے اور شراب کا استعمال بھی کرتا ہے پھر وہ سرجوندی کی تیز لہروں میں خود کو بچا نہیں پاتا اور ان لہروں میں گُم ہوجاتا ہے۔ اسطرح ناول کے دوسرے دور میں مسلمانوں کا عہد شروع ہوجاتا ہے اور اس طرح گوتم نیلمبر سرجوندی میں بہہ کر عرب کے ابوالمنصور کی شکل میں نمودار ہوجاتا ہے۔ لیکن گوتم نیلمبر کا فلسفۂ حیات زندہ رہتا ہے۔ دوسرے دور کا گوتم نیلمبر دت ناول میں انگریزوں کی کمپنی میں ایک کلرک کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ جب گوتم کمپنی کے کام سے لکھنو جاتا ہے تو وہاں چمپا بائی سے ملتا ہے دونوں ایک دوسرے پر مر مٹتے ہیں اور گوتم اس طوائف کو چھوڑ کر کلکتہ چلا

جاتا ہے جب گوتم کافی عرصے بعد لکھنو واپس آتا ہے تو یہ طوائف ایک فقیرنی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔اس کے بعد جب ملک تقسیم ہو جاتا ہے تو وہ دیگر ممالک مثلاً انگلینڈ،امریکہ اور ماسکو کا سفر کرتا ہے اسی دوران جب ان مصروفیات کے بعد اپنے ملک واپس آتا ہے تو ماضی کے نقوش اس کے دل میں اُبھر آتے ہیں۔اس طرح گوتم ہر دور میں پڑھے لکھے طبقے کا نمائندہ کردار بن کر ابھرتا ہے۔

چمپا بھی اس ناول کا ایک دلچسپ نسوانی کردار ہے۔ناول میں چمپک کے کردار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور گوتم اور کمال کے کردار کی طرح یہ کردار بھی ہر دور کی نمائندگی کرتی ہے۔قدیم دور میں اس کا نام چمپک تھا گوتم اس کو سرجوندی کے کنارے ملتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے۔گوتم کہتا ہے کہ:

''گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔گوتم نے سوچا لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں گوتم نے سوچا انہیں بھلا کون سے مسئلے حل کرنا ہے۔اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انھیں دیکھ لے۔خصوصاً اس کیسری ساڑھی والی لڑکی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول رکھا ہے۔اس کے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اس کے گنگھرالے بال تھے کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھویں۔قریب پہنچ کر گوتم نے ان دونوں کو لحظ بھر کے لئے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

(آگ کا دریا۔ص ۱۳)

وہ ہندوستانی عورت کی علامت ہے اور گوتم جیسے فلسفی سے بحث کرنے کی ہمت رکھتی ہے اور چندر گپت موریہ کی گرفتاری کے بعد پاٹلی پتر جاتی ہے اور یہاں اس کی شادی ایک افسر سے ہو جاتی ہے۔اس کے بعد چمپا ایک پنڈت لڑکی کی شکل میں چمپاوتی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے اس کی ملاقات ابوالمنصور سے ہوتی

ہے دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔کمال جب اس سے شادی کرنے کی بات سامنے رکھتا ہےتو وہ کہتی ہے ''ہم تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں'' اس طرح وہ صرف محبت کرنا جانتی ہے۔اس کے بعد تیسری مرتبہ وہ لکھنو کی مشہور ومعروف طوائف چمپا بائی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے ۔یہاں اس کی ملاقات گوتم نیلمبر ،سرل ایشلے سے ہوتی ہے۔ناول کے اکثر کردار چمپابائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور جب لکھنو کا زوال ہوتا ہےتو چمپا ایک بھکارن کا روپ اختیار کر لیتی ہے وہ ایک ایک روپے کے لئے ترستی ہے۔گوتم سے چمپا کی ملاقات ہر عہد میں ہوتی ہےلیکن وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی نہیں بن پاتے ہیں۔تقسیم ہند کے بعد وہ مراد آباد میں ایک چچا زاد بھائی کے یہاں لگتی ہے۔چمپا اپنی زندگی میں کبھی مایوس نظر نہیں آتی اس کردار کو مس حیدر نے دراصل ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی ہےاوراس کے ذریعے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی جدوجہد کو پیش کیا ہے۔

کمال کا کردار بھی گوتم اور چمپا کی طرح مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔پہلے دور کا ابوالمنصور کمال الدین ایرانی ماں کا بیٹا بغدار سے وارد ہوتا ہے اور مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔دوسرے دور میں ابوالمنصور کمال الدین سرجو ندی کے کنارے گوتم سے کمال کے روپ میں ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے اور صوفیوں اور پنڈتوں کی منڈلی ، میں اس شمار کیا جاتا ہے۔تیسری بار سورنا گاؤں کی ایک لڑکی سے اس کی شادی ہوجاتی ہےاوراس کی اولاد پیدا ہوتی ہےاور وہ ہندوستان کو اپنا وطن بنالیتا ہے ہر ایک دن قحط بنگال میں مرجاتا ہے۔اس کے بعد ناول میں نواب کمسن بن کر اُبھر کر سامنے آتا ہےاور کمال رضا بن کر موجودہ دور کی نمائندگی کرتا ہےلندن سے ڈگریاں حاصل کرتا ہےلیکن اس کے باوجوداس کو ہندوستان میں ملازمت نہیں ملتی ہےاور تنگ آکر واپس پاکستان چلا جاتا ہے۔

ڈالیشے بھی ''آگ کے دریا'' کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ کردار سرل ہاروڈ ایشلے انگریزی تہذیب و معاشرت کی نمائندے کی حیثیت سے ناول کے تیسرے دور میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ سرل دراصل ہندوستان سیر وتفریح کی غرض سے آیا تھا اور اپنی ہوشیاری و چالاکی سے یہاں حاکم بن گیا اور ہندوستان پر اپنا قبضہ جمالیا اور ظلم وستم کا بازار گرم کرتا ہے ۔لکھنو میں طوائفوں سے عشق لڑاتا۔ کچھ عرصے میں سرل کی فالج سے موت ہوجاتی ہے۔ لاڈ سرل لیڈون ایشلے پورے ہندوستان کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے آگے کئ روپ ہیں جو اس کہانی کو آگے بڑھانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

شنکر بھی اس ناول کا قابل ذکر کردار ہے۔ ہری شنکر ناول کے ابتدائی دور میں بُدھ دھرم کا نمائندہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو اپنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بُدھ بھکشو بن کر سکون کی تلاش میں رہتا ہے اور دُنیا کی زندگی کو چھوڑ کر سکون تلاش کرتا رہتا ہے۔ پہلے دور میں ہری شنکر اکثر موقعوں پر گوتم کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ گوتم اور ہری شنکر کے درمیان فلسفیانہ بحث بھی ہوتی ہے۔ دوسرے دور میں ہری شنکر کا بُدھ فلسفہ زندہ رہتا ہے۔ لیکن ہری شنکر گُم ہوجاتا ہے اور ایک جگہ شنکر اور ابوالمنصور دونوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ ناول کے تیسرے دور میں ہری شنکر انگریزوں کا منشی بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ گوتم کی رہبری کرتا ہے۔ چوتھے دور کا ہری شنکر کا تعلق سنگھاڑے والی کوٹھی سے ہے۔ یہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے عہد میں ان کے مقرب خاص اور اودھ کے وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند سے بنوائی اور اس میں اب ان کے پڑپوتے بھی رہتے تھے۔ ان میں ان کا ایک لڑکا ہری شنکر اور دو لڑکیاں لاج اور نرملا ابھی طالب علم تھے۔ جن کے ساتھ والی کوٹھی کی لڑکی ''گُلفشاں'' کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہاں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ہری شنکر اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرا کردار خاصا اہم ہے۔میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں میں کہانی میں
اتنے سارے مختلف رول ادا کررہاہوں۔''

(آگ کا دریا،ص ۲۵۷)

نرملا ناول ''آگ کا دریا'' کا ایک معاون کردار ہے۔لیکن اس کردار کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے۔نرملا ہری شنکر کی چھوٹی بہن جس کی منگنی کی بات گوتم سے چلانے کا ارادہ تھا۔جب کمال کلکتہ ریلیف کے سلسلے میں جاتا ہے تو نرملا کے بہنوئی کمال کو گوتم سے متعلق معلومات حاصل کرنے کو کہتا ہے۔کمال جب گوتم سے ملتا ہے تو اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔گوتم بھی لکھنو منتقل ہو جاتا ہے۔نرملا اسے اپنے مالک شوہر تسلیم کر لیتی ہے۔اب گوتم جب لکھنو پہنچ کر چمپا کو دیکھتا ہے تو ایک طرف نرملا کو چاہتا ہے اور دوسری طرف چمپا سے محبت کرتا ہے۔نرملا کو بھی اس کی خبر ہو جاتی ہے۔اور نرملا اندر ہی اندر تڑپتی ہے ایک بار گوتم جب لکھنو سے پیرس جانے کا ارادہ کرتا ہے نرملا اس کی جدائی کو برداشت نہیں کر پاتی اور رونے لگتی ہے جس پر طلعت اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے

:

''اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔روتی کیوں ہے۔شادی کر کے تو بھی ساتھ
چلی جا۔تیرا تو اس کے لیے جانے کا پیغام جا چکا ہے۔وہ بھلا مُجھ سے شادی کرے گا
۔چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا۔''

(آگ کا دریا، ص ۴۴۰)

اس کے بعد تقسیم کا دور شروع ہو جاہے وہ کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔تو نرملا لندن میں بیمار ہو جاتی ہے اور ٹی۔بی جیسی خطرناک بیماری کی شکار ہو جاتی ہے اور بڑی مایوس کُن زندگی گُزارتی ہے آخر کار نرملا موت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔

طلعت بھی اس ناول کا نسوانی کردار ہے۔طلعت نرملا کی اچھی دوست تھی تو اس کو تقسیم کے بعد کیمبرج میں داخلہ لیتی ہے اور جب کمال لندن سے ہندوستان آکر بدلتے حالات پر پریشان ہوتا ہے تو اس کو سہارا دیتی ہے۔ یہ کردار حاضر جواب اور وسیع النظر ہے۔ جب نرملا اور گوتم کے رشتے کے درمیان چمپا آتی ہے تو اس کو بہت غصہ آتا ہے۔اور کہتی ہے:

''چمپا باجی۔ چمپا باجی۔تم سے زیادہ بُرا کون ہوگا۔اب جانے تم اور کس کس کی قسمت برباد کروگی۔

(آگ کا دریا، ص۴۴۰)

طلعت کا کردر ایک بہادر اور خوددار عورت ہے جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف لڑنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھی۔

اس کے علاوہ تہمینہ، عامر بھی اس ناول کے کردار ہیں۔ان دونوں کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور ادھر ان دونوں کے درمیان چمپا باجی آجاتی ہے۔دراصل چمپا کا کردار نہایت اہم کردار ہے جو ہر دور میں بڑے خوبصورت انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر ارجمند آرا چمپا کے کردار کے بارے میں لکھتی ہیں:

''قراۃ العین حیدر نے چمپا کا کردار نہ صرف حقیقت پسندی سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ ہر تاریخی دور میں اسے اپنے عہد کی ترجمان بنایا ہے اور اس طرح وہ آج کی اس ہندوستانی عورت کے مقدر کا استعارہ بن گئی ہے۔ جو تینوں ادوار کی چمپا کی صورت میں بیک وقت موجود ہے۔''

(آج کل، حسن ضیاء، ص۶)

اس طرح ''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے ہر کردار کو اتنا مکمل بنا کر پیش کیا ہے کہ وہ اپنے

ماحول، اپنی تہذیب کی علامت اور علمبردار بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ گوتم، گوتم نیلمبر ، پروفیسر گوتم نیلمبر ،ابوالمنصور کمال، کمال الدین،نواب کمسن اور کمال رضا، چمپا،چمپک رانی ، چمپا وتی، چمپا بائی اور چمپا احمد کے علاوہ نرملا،طلعت ، ہری شنکر،تہمینہ، عامر رضا وغیرہ سب ہی اپنے آپ میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر کردار قاری کے ذہن میں دیرپا تاثر چھوڑتا ہے۔

''آگ کے دریا'' کے کرداروں میں اگر تانیثیت کی بات کی جائے قرۃالعین حیدر ایک عورت کی حیثیت ہونے کی بناء پر عورت کی نفسیات اور اس کی سماج میں رہنے کی حقیقت نگاری سے خوب واقف ہیں۔ اس ناول میں جہاں مرد کردار نظر آتے ہیں وہیں عورتوں کے کردار بھی مرد کرداروں کے ساتھ ساتھ شانہ بشانہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔نسوانی کرداروں میں چمپا کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔جس نے ہر دور میں جنم لیا۔اس کے علاوہ نسوانی کرداروں میں طلعت،نرملا،تہمینہ، لاج ،روشن اس ناول میں نظر آتے ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔آگ کے دریا میں کردار نگاری میں زیادہ وسعت ہے ایسا نہیں کہ کردار کے کسی ایک زندگی کے کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہو اور کس قدر توجہ دی گئی ہو بلکہ قرۃالعین کے فن کا کمال یہ ہے کہ ہر کردار اپنی جگہ اہم درجہ رکھتا ہے۔ان سبھی کرداروں میں ''وقت'' ایک اہم تصور ہے۔جو دریا کی طرح بہتا چلا جاتا ہے اور یہ سبھی کردار بھی وقت کے ساتھ ساتھ مٹتے اور اُبھرتے ہیں ۔اگر یہ کہا جائے ''آگ کا دریا'' کردار نگاری کے اعتبار سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا مرقع پیش کرتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

قراۃالعین حیدر نے ''آگ کے دریا'' میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔سب سے پہلے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ شعور کی رو ہوتا کیا ہے؟

دراصل شعور کی رو اس قسم کے ناول ہوتے ہیں ۔جس میں انسان کے خارجی (باہر) احساسات کے

بجائے داخلی (اندرونی) مسائل پر زور دیا جائے۔شعور کی رو پر جو ناول تخلیق کیا جاتا ہےاس میں قدیم ناولوں کی طرح پلاٹ کا فقدان نہیں ہوتا ہے۔اس میں سب سے زیادہ توجہ کردار کے نفس پر دی جاتی ہے قاری بڑی توجہ سے ان کرداروں کے نفس کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے ناولوں کو پڑھ کر قاری کو ذہن پر دوہرا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔کیونکہ پلاٹ اور واقعات پر زور دینے کے بجائے کرداروں کی ذہنی کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کی رو کی تکنیک کو سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناول ''لندن کیا یک رات'' میں استعمال کیا ہے انگریزی میں امریکی نفسیات ولیم جیمس نے شعور کی رو(stream of conciousness) کی ایجاد کی ۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اُردو کے ناول نگاروں میں قراۃ العین حیدر نے اس تکنیک کے اس مغربی انداز کو اپنایا اور اس کے عناصر کو بڑی خوبی سے مشرقی روایت کے حُسن میں سمویا ہےان کے ناولوں کا فن ناول نگاری کی اُس جدید روش کا بڑا کامیاب نمونہ ہے جس میں واقعات اور ان کے ارتقا سے زیادہ فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کے بیان کو کہانی سمجھا جاتا ہے۔''

(داستان سے ناول تک' وقار عظیم' ص۔۱۳۰)

تکنیکی اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے جس ناول کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ'' آگ کا دریا ''ہے۔اس ناول کے ذریعے حیدر نے اُردو ناول کو فکر وفن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے جو ہندوستانی تاریخ کے دس ہزار سالوں پر مشتمل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں تاریخ،فلسفہ،ادب اور جمالیات کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے۔اس ناول میں وقت کی علامت کو حیدر نے

بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ جس طرح دریا رواں دواں رہتا ہے اسی طرح وقت گزرتا چلا جاتا ہے ۔لیکن یادیں ذہن میں محفوظ رہتی ہیں ۔جس سے دُنیا میں کئی تہذیبیں بنیں اور مٹ گئی ۔اس ساری کیفیت کو قرۃالعین حیدر نے ''شعور کی روٗ'' کی تکنیک سے پیش کیا ۔ایسے ناولوں کے متعلق THE NEW ENCYCLOPAEDIA OF BRITANICA میں لکھا ہے:

> "THE STREAM OF CONSCIOUSNESS NOVEL COMMONLY USES THE NARRATIVE TECHNIQUE OF INTERRIOR MONOLOGUE"
> (The new encyclopaedia of britannica,volume 9 page,604)

شعور کی رو کی تکنیک سے ناول نگار نے ناول میں کرداروں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ تمام واقعات اپنے حال اور ماضی کے ساتھ اُبھر کر ایک ہی وقت میں ہمارے سامنے نظر آتے ہیں ۔جب ہم ۷۸٦ صفحات کے اس ضخیم ناول ''آگ کا دریا'' کا کوئی بھی صفحہ کھولیں گے تو ہمیں وہاں ناول نگار کا وسیع مطالعہ،عمیق فکر، باریک مشاہدے نظر آتے ہیں ۔ناول نگار نے اس ناول میں چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل پیرا گراف تحریر کیے ہیں ۔انہوں نے بیک وقت کئی روئیں پیدا کی ہیں ۔ ہر رو کسی کردار کے شعور سے تعلق رکھتی ہیں۔شعور کی رو تکنیک تحت لکھے ناولوں میں فلمی تکنیک بھی استعمال ہوتی ہے جس کو (M O N T A G E) کا نام دیا گیا۔ (MONTAGE) سے مراد فلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جیسے CUT,FLESHBACK,SLOWUP ETC. اس طرح جوڑے جاتے ہیں کہ ایک فلم تیار ہوجاتی ہے ۔اس طرح اس تکنیک کو ناولوں میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ مکمل ناول وجود میں آتا ہے ۔آگ کے دریا ناول میں ہمیں وقت کے مختلف پیٹرن ملتے ہیں ۔شعوری طور پر اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں TIME MONTAGE

TIME MONTAGE کے تحت SPACE MONTAGE اور دونوں ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ کردار اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے جبکہ SPACE MONTAGE میں وقت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''آگ کا دریا'' میں شروع سے آخر تک مختلف ادوار میں چیزیں نظر آتی ہیں ۔مختلف ادوار، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں اور مختلف چہرے والا یہ انسان ایک ہی چہرے کے مختلف عکس لیے گھومتا ہے۔شعور کے بہاؤ کے ذریعہ ماضی کی یادیں، حال کی کیفیت اور مستقبل کی خواہش ایک ہی وقت میں پیش کر دی جاتی ہے۔اصل میں شعور کے ناولوں کا مقصد کہانی یا قصہ بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ ناول میں کرداروں کی ذہنی کیفیت اور داخلی زندگی کو پیش کرنا پڑتا ہے اور قراۃ العین حیدر نے اس ناول میں یہ بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس ناول کا موضوع دراصل ''وقت'' ہے۔وقت جو دریا کی طرح رواں دواں رہتا ہے۔اس ناول کا مرکزی خیال وقت کی طاقت ہے جس کے سامنے ہے انسان بہتا چلا جاتا ہے۔جس طرح دریا رواں دواں رہتا ہے اسی طرح وقت بھی دریا کی مانند چلتا رہتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''آگ کا دریا'' میں شروع میں ٹی۔ایس۔ایلٹ کی نظم کو پیش کیا ہے۔جس میں ایلیٹ نے وقت کو دریا کہا ہے مسلسل بہتا رہتا ہے جو طاقت ور ہے۔وقت کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔مس حیدر نے اپنا پیش لفظ لکھنے کے بجائے ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی نظم کو پیش کیا ہے۔ایلیٹ نے وقت کے بہاؤ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ۔

دریا ہمارے اندر ہے۔سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے

خاتمہ کہاں ہے۔بے آواز جستجو کا

یہ لمحے مستقبل ہیں جس طرح وقت مستقل ہے

لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند

وقت جو تباہ کُن ہے' قائم بھی رکھتا ہے۔

مصنفہ نے ناول کو'' آگ کا دریا''عنوان دے کر وقت کو'' آگ کا دریا'' کی علامت بنا کر اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ وقت ایک بے رحم اور لا فانی شئے ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی زد میں لے کر فنا کر دیتا ہے۔ جس طرح دریا بہتا ہے اسی طرح وقت کو کوئی نہیں روک سکتا ہے وہ بھی مسلسل چلتا رہتا ہے۔ جس طرح ہمارے معاشرے میں جب کوئی انسان مر جاتا ہے تو سبھی لوگ اس مرنے والے انسان کے رشتہ داروں کو دِلاسا دیتے ہیں کہ'' وقت کے ساتھ ساتھ سبھی گھاؤ بھر جائیں گے''لیکن اس مرنے والے انسان سے وابستہ یادوں کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔ یہی یادیں قصہ کہانی کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ناول نگار نے ناول میں تین کرداروں کو ہر دور میں پیش کیا ہے۔ یہ تینوں کردار وقت کے دریا میں ڈوب کر اُبھرتے ہیں۔

گوتم اور کمال بار بار مرتے اور جنم لیتے ہیں۔ ان کے جسموں، روحوں اور ذہنوں میں ہزاروں برس پھیلی ہوئی زندگی نظر آتی ہے۔ جب گوتم سرجو ندی میں بہہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کرتا ہے ۔ کیونکہ وقت کے طوفان میں اس کو زیادہ طاقت نہ تھی اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں چندر گپت کی لڑائی میں کٹ چکی تھیں اس لیے وقت کے دریا کی زد میں آ کر بہہ گیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> '' اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپڑے سے وہ کنارے کے قریب پہنچ گیا مگر پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اُس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دئے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اُسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اُپر جُھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا....پتھر کو پکڑ کر اُس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند

کیں۔وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لمحے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر،جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں میں ایسا ہی رہے گا''

(آگ کا دریا،ص۱۱۵)

اس طرح ''آگ کے دریا'' میں پل پل کی تہذیبوں کو وقت کے ہاتھوں بدلتا ہوا دِکھایا گیا ہے۔جب سرجوندی کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ایک تہذیب ختم ہو جاتی ہے اور دوسری تہذیب اُبھر کر سامنے آتی ہے ۔اکیلا گوتم دیکھتے ہی دیکھتے ''آگ کے دریا'' کی مٹتی ہوئی لہروں میں ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔لیکن خاتمہ کہیں ہوتا ہے لہٰذا اسی دریا کی آتی ہوئی لہر کے ساتھ وہ ناول کے دوسرے بڑے کردار ابوالمنصور کمال الدین کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے آگے چل کر اسے لکھنو اور کلکتہ میں نواب کمال رضا عرف کمسن صاحب اور مزید آگے چل کر موجودہ نسل کے نمائندے کا کردار ادا کرتا ہے۔اس طرح قرۃ العین حیدر نے دریا جو وقت کا سمبل symbol بنا کر اس ناول میں پیش کیا ہے اور ہر چیز کو اپنی تاریکیوں سے چھپا کر آگے بڑھتا ہے۔

آگ کا دریا میں قرۃ العین حیدر نے ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔تاریخ کے علاوہ حیدر نے اس میں تہذیب،ثقافت،فلسفہ،سیاسی وسماجی نظریات اور وقت کے سفر کو بڑے خوبصورت انداز میں ناول میں بیان کیا ہے ۔قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا میں کائنات اور انسان اور انسان کے رشتے کو موضوع بنایا ہے ۔رگ وید کی نظمیں،حمدیں،بھجن،سماجی وتاریخی مطالعہ ہمارے ہندوستان کے بنیادی عناصر ہیں ۔ان سب چیزوں کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے ۔ناول میں اوّل سے آخر تک ہندوستان کے سارے واقعات کے پورے ڈھائی ہزار سال کی کہانی کو سمیٹا ہے۔گوتم بُدھ سے لے کر جدید معاشرے کی تصویر

یں اس ناول میں صاف عیاں ہو جاتی ہیں۔اس ناول میں حیدر نے ہر تہذیب کا نقشہ ہمارے سامنے رکھا ہے مثلاً چندر گپت ، چانکیہ ، ہمایوں ، ایسٹ انڈیا کمپنی ، غدر ، راجارام موہن رائے ، تقسیم ہند ، ہندو مسلم فسادات کو بڑے موثر انداز میں پیش کر کے مطالعہ کرنے والے کے سامنے ہر دور کے سماجی و تہذیبی عناصر آنکھوں میں گردش کرنے لگتے ہیں۔صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''ناول ''آگ کا دریا'' ہندوستانی تہذیب و تمدن کی خوبیوں اور خامیوں اور ان کے ٹکراؤ کو پیش کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ''وقت'' کے آگے سب بے بس ہیں۔انسان ہر کام اپنی منشاء مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں کر پاتا ہے کیونکہ یہاں کچھ بھی دائمی نہیں ماسوا محبت کے' اور محبت کو وقت مٹا نہیں سکتا ہے کہ یہ جذبہ مٹ کر بھی دائم رہتا ہے۔''

(غالب نامہ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ۱۶۰)

قرۃ العین حیدر کے بیان میں بے تکلفی اور دلکشی ہے۔انھوں نے اکثر ماضی کی حقیقتوں کو حال سے جوڑ کر بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ان کے ناولوں میں اکثر مغرب یافتہ افراد، دولت مند جاگیر دار، اعلٰی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد جن کو ہر طرح کی سہولیت میسر تھیں ان میں متوسط ہندو مسلم گھرانوں کا ماحول ، اودھ اور لکھنو کا ماحول اور یہاں کے سیاسی و سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔یہ تمام مسائل حیدر نے بڑے موثر انداز میں پیش کئے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے جس ماحول کی عکاسی کرتی ہے اُسی ماحول کے مطابق زبان بھی استعمال کرتی ہیں۔اس ناول میں ناول کے آغاز میں ویدک عہد کے بارے میں لکھا ہے جس میں انہوں نے اس میں سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔دوسرے دور میں لکھنو کا معاشرہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور آخری حصے میں انہوں نے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے اس ناول کی

زبان موضوع کے مطابق علامتی اور انداز شاعرانہ ہے۔ مکالمے زیادہ طویل نہیں ہیں۔ان میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔

اس ناول میں زبان و بیان کی اہمیت یہ ہے کہ قرۃالعین حیدر نے ہر عہد کی زبان میں ایک فرق قائم کیا ہے اور قابل ذکر انفرادیت کے ساتھ ہر عہد کے لوگوں کی زبان کی عکاسی کی ہے۔زبان و بیان کے معاملے میں ناول کا جواب نہیں۔

المختصر ''آگ کا دریا'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ قرۃالعین حیدر کے پاس جو صلاحتیں موجود تھیں انھوں نے ان کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوسروں سے الگ اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ ''آگ کا دریا'' ایک مکمل ہندوستان کی تصویر ہے اور یہ اُردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں حیدر نے ہندوستان کی تین ہزار سالہ پرانی تہذیب کو سمیٹا ہے ۔اس ناول میں شعور کی رو اور وقت کے تصور کو بھی جا بجا استعمال کیا۔ناول میں حیدر نے دریا کو وقت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔وقت اپنی رفتار بدلتا رہتا ہے ان بدلتے وقت میں تہذیبیں بنتی اور مٹتی ہیں ان سب چیزوں کو قرۃالعین حیدر نے ناول میں پیش کیا ہے کہ وقت کو کبھی موت نہیں آتی۔اس ناول میں حیدر نے مغربی تکنیک کے ساتھ ساتھ اسلوب اور اظہار بیان کے کئی نئے تجربے کیے ہیں اور نئی راہیں نکالی ہیں۔ جب بھی قرۃالعین کی ناول نگاری کی بات کی جائے گی تو ان کے ناول ''آگ کا دریا'' کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ بلاشبہ قرۃالعین حیدر اردو ناول نگاری میں منفرد پہچان رکھتی ہے۔ان کا ناول ''آگ کا دریا'' اردو ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

☆☆☆

۲۔ایک چادر میلی سی

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی

اردو ناول نگاری میں مرزا ہادی رسوا، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرؔر، پریم چند اور عصمت چغتائی کے ساتھ

ساتھ راجندر سنگھ بیدی کا نام بھی سرفہرست ہے۔ بیدی کی شہرت ایک عظیم افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی وہ ناول نگاری کی دُنیا میں 'ایک چادر میلی سی' کے ساتھ داخل ہوئے اور منفرد پہچان بنائی۔ بیدی نے نہ ہی قلم کے جوہر دکھانے کے لئے اور نہ ہی تفریح کا سامان فراہم کرانے کے لئے لکھا بلکہ زندگی کی حقیقتوں سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ان کے ادبی سفر کا جائزہ لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سوانح:

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بیدی اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'ٹیگور کہتے ہیں دُنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہوتے ہیں۔اس بات کا ثبوت ہے کہ خُدا ابھی انسان بناتے نہیں تھکا کیونکہ ستم ظریفی ہے چونکہ وہ تھک نہیں سکتا اس لئے انسان بناتا جارہا ہے۔''
>
> (راجندر سنگھ بیدی۔شخصیت اور فن جگدیش چندر ودھان، ص۱۵)

بیدی کے والد کا نام ہیرا سنگھ اور والدہ کا نام سیوا دیوی تھا۔ بیدی کی ماں برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور والد کھتری سکھ تھے۔لفظ 'بیدی یا ویدی' 'وید' سے آیا ہے۔وہ کھتری جو وید کو اپنے گرنتھ مانتے ہیں اور اپنا سلسلۂ نسب براہ راست گورو نانک دیو جی سے ملاتے ہیں۔گھر میں گیتا اور جپ جی صاحب کا پاٹھ ہوتا رہتا ہے۔ بیدی نے ۱۹۳۱ء میں خالصہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۳ء میں ڈی۔اے۔وی کالج میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۴ء میں بیدی نے اپنے والد کے کہنے پر ڈاک خانہ میں ملازمت شروع کر دی۔۱۹۳۴ء میں ان کی شادی ستونت کور سے ہوئی۔

بیدی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز دورانِ تعلیم ۱۸۔۱۷ سال کی عمر میں کیا۔ آپ نے انگریزی میں نظمیں، پنجابی اور اُردو میں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بیدی نے 'محسن لاہوری' کے نام سے لکھنا شروع کیا انگریزی میں ان کی پہلی تخلیق ایک انگریزی نظم ''باغ ارم'' تھی جو کالج کے میگزین میں شائع ہوئی۔ ان کی پہلی کہانی پنجابی زبان میں 'دُکھ سُکھ' تھی جو لاہور سے نکلنے والے رسالے 'سارنگ' میں شائع ہوئی۔

بیدی کا پہلا افسانہ ''مہارانی کا تحفہ'' ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوا جو اُس سال شائع ہونے والے افسانوں میں بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔ بیدی اس دوران شرت چند، چیخوف اور ٹالسٹائی وغیرہ کو پڑھتے رہے اور ان عظیم افسانہ نگاروں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قمر رئیس، بیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیدی چیخوف کی طرح بڑی آسانی کے ساتھ بظاہر معمولی اور بے رنگ کے پیچھے پیچھے ہوتے بڑے نتیجہ خیز جذباتی اور ذہنی حقائق کو دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ان کی ظاہری غیر جانبداری کے پس پردہ ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ اور تصور (Vision) ہر لحظ متحرک رہتا ہے۔''
>
> (تاریخ اُردو ادب۔ وہاب اشرفی، ص ۸۸۴)

پوسٹ آفس کی ملازمت کے بعد بیدی لاہور ریڈیو اسٹیشن کو بحیثیت سکرپٹ رائٹر کے طور پر مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور سے شملہ آئے اور وہاں سے دہلی چلے گئے۔ اس کے بعد جموں کشمیر کے چیف منسٹر شیخ عبداللہ نے ۱۹۴۸ء میں بیدی کو جموں ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر مقرر کیا لیکن ڈپٹی منسٹر بخشی غلام محمد سے اختلافات کی وجہ سے نوکری سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں آپ نے بمبئی کا رُخ کیا یہاں سے بیدی کا فلمی دنیا کا سفر

شروع ہوا۔

بمبئی میں جا کر بطور رائٹر بیدی نے خوب شہرت کمائی۔ بیدی نے غالباً چالیس ہندی فلموں کے مکالمے لکھے۔ بیدی کی لکھی ہوئی فلمیں جو کافی مشہور و مقبول ہوئی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	بڑی بہن	۱۹۴۹ء
۲۔	داغ	۱۹۵۲ء
۳۔	مرزا غالب	۱۹۵۴ء
۴۔	دیوداس	۱۹۵۵ء
۵۔	ابیھمان	۱۹۵۷ء
۶۔	مدھومتی	۱۹۵۸ء

بیدی نے فلموں کے مکالمے لکھنے کے ساتھ ساتھ فلم ڈائریکشن میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ موصوف نے اپنے ناول ''ایک چادر میلی سی'' پر ایک خوبصورت فلم بنائی۔ جو کافی مقبول ہوئی۔

اُردو فکشن کی دُنیا میں بیدی منفرد پہچان رکھتے ہیں اور اُن کے ادبی اور فلمی کارنامے دیکھتے ہوئے ان کو ملک بھر میں مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں بیدی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کو پدم شری ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ آپ کو مودی ایوارڈ، فلم فیئر ایوارڈ اور کئی ریاستی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

نومبر کی پانچ تاریخ ۱۹۷۹ء میں بیدی پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور آخر کار طویل بیماری میں مبتلا ہونے کے

بعد آپ کا انتقال ۱۱نومبر ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

بلاشبہ بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔لیکن ان کی اُردو افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوتا ہے:

''بیدی کی افسانوی کائنات بہت سی چیزوں سے مل جل کر بنی ہے لیکن جس چیز نے اس میں سب سے زیادہ چہل پہل اور گہما گہمی پیدا کی ہے وہ اس کے کردار ہیں۔ بیدی کا کوئی افسانہ پڑھیے اُسے ختم کر چکنے کے بعد اور بہت سی چیزوں کے نقش سے زیادہ گہرا کسی نہ کسی خاص آدمی کے وجود کا نقش ہوگا جو باقی ہر چیز کو نیچے کی تہوں میں دباتا ہوا اور کی سطح پر آ کر سب پر چھا جائے۔''

(بیدی نامہ، شمس الحق عثمانی۔ص،۱۲۰)

دسمبر ۱۹۳۹ء میں بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دانہ و دوام'' منظر عام پر آیا جس میں شامل افسانے مندرجہ ذیل ہیں:

''بھولا، ہمدوش، من کی من میں، گرم کوٹ، چھوکری کی لوٹ، پان شاپ، منگل اشٹکا، کوارنٹین، تلادان، دس منٹ بارش میں، حیاتیں، پھمن، ردِعمل، موت کا راز۔''

۱۹۴۲ء میں بیدی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''گرہن'' شائع ہوا۔گرہن کے افسانوں کو بے حد پسند کیا گیا۔افسانوی مجموعہ گرہن میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں:

گرہن، رحمٰن کے جوتے، بکی، اغوا، غلامی، ہڈیاں اور پھول، زین العابدین، لاروے، گھر میں بازار میں، دوسرا کنارہ، آلو، معاون اور میں، چیچک کے داغ اور ایوالانس شامل ہیں۔

بیدی نے اپنے منفرد اسلوب سے اردو کے نقادوں کو چونکا دیا تھا۔اُردو کے دوسرے بڑے نقادوں کی

طرح آل احمد سرور بھی بیدی کی افسانہ نگاری کے قائل تھے اور بیدی کی افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''اگر بیدی کے اہم اور معنی خیز افسانوں کی ایک فہرست بنائی جائے تو اس میں بھولا، گرم کوٹ، گرہن، اپنے دُکھ مجھے دے دو، لمبی لڑکی اور صرف ایک سگریٹ ضرور شامل ہیں۔''

(بیدی شخصیت اور فن۔ جگدیش چندر ودھاون، ص ۲۱۱)

۱۹۴۹ء میں بیدی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''کوکھ جلی'' منظر عام پر آیا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' شائع ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں پانچواں مجموعہ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' منظر عام پر آیا۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں آپ کے افسانوں اور مضامین کا آخری مجموعہ ''مکتی بودھ'' شائع ہو۔

افسانہ نگاری کے علاوہ بیدی نے ڈراما نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۴۳ء میں بیدی کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''بے جان چیزوں'' کے نام سے شائع ہوا جس میں مندرجہ ذیل چھ ڈرامے شامل ہیں جن کی فہرست اس طرح ہے:

۱۔ کار کی شادی　　　۲۔ ایک عورت کی نہ

۳۔ روحِ انسانی　　　۴۔ اب تو گھبرا کے

۵۔ بے جان چیزیں　　　۶۔ خواجہ سرا

۱۹۶۴ء میں بیدی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''سات کھیل'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں درج ذیل ڈرامے شامل ہیں۔

۱۔ خواجہ سرا　　　۲۔ چانکیہ

۳۔ تلچھٹ   ۴۔ نقلِ مکانی

۵۔ آج   ۶۔ رخشندہ

مذکورہ بالا ڈراموں سے بیدی کی ہمہ جہت صلاحیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے جو اُردو ادب کی آن بان اور شان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

ایک چادر میلی سی

راجندر سنگھ بیدی افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے ناول نگار بھی ہیں۔

بحیثیت ناول نگار بیدی نے واحد ناول ''ایک چادر میلی سی'' لکھا ہے جو ۱۳۶ صفحات اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ناول سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں لاہور سے شائع ہونے والے مشہور رسالے ''نقوش'' میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس ناول کے تعلق سے ہندوستان میں ''ایک چادر میلی'' اور پاکستان میں ''مٹھی بھر چاول'' کے نام کی فلمیں بنیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ ایک چادر میلی سی کا ترجمہ اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا۔ ۲۰۰۷ء میں خوشونت سنگھ نے I Take This Women کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کشمیری میں اس کا ترجمہ سید رسول پومپوری نے ''پران وار'' کے نام سے کیا جس کی وجہ سے ۱۹۸۵ء میں انہیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازہ گیا اور پنجابی زبان میں ہرنام سنگھ ناز نے 'ایک چادر ادھورانی' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

اس ناول کے ابتدائی سات ابواب میں ہجر کا احوال بیان کیا گیا ہے اور آخری چار ابواب میں وصل کی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ بیدی کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا گیا ہے کہ ان کی کہانیوں میں زندگی کے جگمگاتے ہوئے جذبات وحالات کی ترجمانی ہوئی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس بیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیدی چیخوف کی طرح بڑی آسانی کے ساتھ بظاہر معمولی اور بے رنگ واقعات کے پیچھے پیچھے ہوتے ہوتے بڑے نتیجہ جذباتی اور ذہنی حقائق کو دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ان کی ظاہری غیر جانبداری کے پس پردہ ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ اور تصور (Vision) ہر لحظ متحرک رہتا ہے۔''
>
> (تاریخ اردو ادب، وہاب اشرفی۔ ص ۸۸۴)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا یہ ایک نفسیاتی ناول ہے۔ جس کو اُردو ادب میں ایک

شاہکار ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس ناول میں بیدی نے پنجاب کے علاقائی رسم ورواج ،آزادی سے قبل کے دیہاتی ماحول کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔جس میں کم عمر میں عورت کے بیوہ ہونے کے بعد اس کو سہارا دینے کے لیے چادر ڈالنے کی روایت ہے۔اسی رسم کو بنیاد بنا کر بیدی نے یہ ناول لکھا ہے۔

چادر ڈالنے کا مطلب ایسی شادی جس میں عورت کے شوہر کی موت ہونے کے بعد اُس عورت کی شادی شوہر کے بھائی یا شوہر کے کسی رشتہ دار سے کر دی جائے۔چادر ڈالنے کی رسم پنجاب میں پہلے عام تھی بیدی نے اس رسم کو سماجی ضرورت بنا کر پیش کیا ہے۔عورت اور مرد کے درمیان محض سماجی رشتے ہی سب کچھ نہیں ہوتے کچھ رشتے ایسے بھی ہیں جو مرد و زن کو اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔جس کی بہترین مثال بیدی کا یہ بے مثال ناول ''ایک چادر میلی سی'' ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اس ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''راجندر سنگھ بیدی کا فن اِس لحاظ سے اُردو کے لیے مایہ ناز ہے کہ وہ ہماری زندگی کے سارے خدوخال نمایاں کر کے پیش کر دیتا ہے۔اس کا مشاہدہ تیز ،اس کی نگاہ دورس ،دوربین اور اس کا ہر اشارہ معنی خیز اور اور خیال انگیز ہوتا ہے۔وہ زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔اس کا مجموعی تاثر ایک ہی تاثر کے گرد گومتا ہے اور وہ ہے سماجی بدحالی۔''

(اُردو دنیا،نئی دہلی شمارہ نمبر ستمبر ۲۰۱۵۔ص،۲۹)

بیدی نے اس ناول کا آغاز گاؤں کے ایک تاریخی مندر کی یاترا پر عقیدت مندوں کے آنے سے کیا ہے۔جہاں ایک طرف ویشنو دیوی کا کلس والا مندر ہے۔یہ ناول پٹھانکوٹ اور جموں کے سرحدی گاؤں کوٹلہ سے شروع ہوتا ہے۔کوٹلہ ہندوستان کے دوسرے گاؤں کی مانند ایک غریب ،غلیظ اور توہمات سے گھرا ہوا گاؤں ہے۔دیوی کے مندر کے سبب اِس میں یاتریوں کی چہل پہل رہتی ہے لیکن اس سے گاؤں کی فضا میں

کوئی تبدیلی نہیں آتی جو بنیادی طور پر ایک افلاس زدہ افسردگی لیے ہوئے ہیں بقول بیدی:

''کوٹلہ جاترہ کی جگہ تھی ۔ چوہدری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی
بیھروں کے چنگل سے بچتی بچاتی ،اس گاؤں میں آنکلی تھی اور اس جگہ جہاں اب
ایک مندر کھڑا تھا ، گھڑی دوگھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے
سیالکوٹ وغیرہ کی پہاڑیوں میں گم ہوگئی تھی اب بھی کسی ڈھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے
شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور اُفق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے وہی
وشنو دیوی کا پہاڑ ہے''

(ایک چادر میلی سی ۔راجندسنگھ بیدی،ص ۱۱)

اس ناول کی کہانی پنجاب کے سیالکوٹ کے ایک گاؤں ڈسکہ کی ہے۔ یہ کہانی ایک گھر کے ارد گرد گھومتی ہے۔اس گھر میں گھر کا مالک حضور سنگھ،اس کی بیوی جنداں اور ان کے دو بیٹا تلوکا،اس کی بیوی رانو اور ان کے بچے اور چھوٹا بیٹا منگل رہتے ہیں۔ رانو ایک غریب گھر سے تعلق رکھتی ہے جس کے ماں باپ نے اپنی غریبی کی وجہ سے اپنی بیٹی رانو کی شادی ایک جاہل،غریب اور شرابی تلوکا سے کر دی تھی۔تلوکا رانو کو بات بات پر مارتا پیٹتا ہے۔رانو کی ایک لڑکی ہے جس کا نام ’بڑی‘ ہے اور دو چھوٹے جڑواں لڑکے اور ایک چھوٹا بچہ جو ایک سال کا ہے ۔ رانو کا دیور جس کا نام منگل ہے رانو نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ جس وقت رانو کی شادی ہوئی تھی۔منگل بہت چھوٹا تھا۔

ناول کے آغاز میں جب رانو اس گھر میں شادی کر کے آتی ہے تو اُس وقت منگل کی عمر صرف چھ برس کی ہوگی یعنی وہ اتنا چھوٹا تھا کہ جب رانو اپنی بیٹی ’بڑی‘ کو دودھ پلاتی تھی تو منگل بھی دودھ پینے کے لیے مچل جاتا تھا اور جب رانو منگل کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی تو وہ شرماتا ہے۔ رانو منگل کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہے اور

منگل بھی رانو کو ماں کا درجہ دیتا ہے۔رانو کا شوہر منگل یکہ چلاتا ہے اور یکہ چلا کر بڑی مشکل سے گھر کا گزارا ہوتا ہے۔اس غریب گھر میں تلوکا ہی ایک کمانے والا تھا اور حضور سنگھ آنکھ میں موتیا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنی چار پائی پر پڑا رہتا اور گروگرنتھ صاحب کا جاپ کرتا رہتا اور رانو کی ساس جنداں روایتی ساس کی طرح بات بات پر اس کو کوستی رہتی ۔تلوکا صبح سویرے گھر سے یکہ لے جاتا تھا اور دن بھر یکہ چلانے کے بعد ہر شام حسب معمول اپنے اڈّے پر لوٹ آتا اور اس تاک میں رہتا تھا کہ کوئی بولی بھٹکی یاترن مل جائے تو وہ اس یاترن کو نرم بستر اور اچھے کھانے کا لالچ دے کر چوہدری ہرنام داس اور اس کے بھائی گھنشام کی دھرم شالہ میں رات گزارنے کے لیے چھوڑ آئے اور اس برے کام کے بدلے میں اُسے ہر دوسرے تیسرے روز ایک مالٹے کی بوتل ملتی رہے اور یوں تلوکا کو شراب کی لت لگ جاتی ہے اور رانو شراب کو اپنی سوت سمجھتی ہے۔تلوکا کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کی رانو اپنی سہیلی کے کہنے پر بابا ہری داس کے پاس ٹوٹکا لینے جاتی ہے اور اپنی مُراد بابا کے سامنے رکھتی ہے لیکن بابا کے ٹوٹکے کام نہیں آتے اور تلوکے کی شراب پینے کی لت دور نہیں ہوتی۔

ناول میں کوٹلہ نامی گاؤں پیش کیا گیا ہے۔جس میں ایک دھرم شالہ ہے جو چوھری مہربان داس کی ہے یہ دھرم شالہ چودھری اپنے بھائی گھنشام کے ساتھ مل کر چلاتا ہے اس دھرم شالہ میں یاتری لڑکیوں کو تلوکا بہلا پھسلا کر لاتا ہے اور جو چودھری اور اس کے بھائی کی ہوش کا شکار بنتی ہیں۔بدلے میں تلوکا کو کئی دن تک شراب کی بوتل ملتی رہتی ہے۔

اس ناول کا سب سے ہولناک واقعہ تب سامنے آتا ہے کہ جب تلوکا ایک یاترن کو دھرم شالہ میں چھوڑ آتا ہے جس کی عمر صرف بارہ تیرہ برس کی ہوگی اور چودھری مہربان داس، چودھری گھنشام اور لنگوٹ والے بابا اس کمزور لڑکی کی عزت کو تار تار کر دیتے ہیں۔دوسری طرف شراب میں دھت تلوکا گھر میں شراب پی کر رانو کی پٹائی

کرنے کے بعد اسے عاجزی سے منا کر اپنی ہوس کی آگ بجھاتا ہے۔لیکن خیال میں وہ اس یاتری لڑکی کے ساتھ زنا کر رہا ہے جسے وہ چودھری کی دھرم شالہ میں چھوڑ کر آیا ہے۔

اگلے ہی دن اُس لڑکی کا بھائی غصے میں آ کر تلوکا کا قتل کر دیتا ہے۔تلوکی کی موت کے بعد رانو کی زندگی بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔اس کی ساس جنداں اُس کا جینا حرام کر دیتی ہے۔رانو بے حد مجبور ہے وہ اپنے چار بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔پھر آخر کار رانو کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ وہ خود بھی قسمت پر حیران رہ جاتی ہے۔لوگ جنداں سے کہتے ہیں کہ منگل کو کہو گے وہ رانو کے چادر ڈال دے۔یعنی وہ رانو سے شادی کر لے۔ منگل کو جب یہ بات پتہ چلتی ہے تو وہ گھر سے بھاگ جاتا ہے۔لیکن گاؤں والے اُسے پکڑ کر لے آتے ہیں۔اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے اپنی ماں جیسی رانو پر چادر ڈالنی پڑ جاتی ہے۔منگل بھی کسی سے پیار کرتا ہے لیکن اس سب میں اس کا سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے۔منگل کچھ دن تو بے حد پریشان رہتا ہے۔آخر کار قسمت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور رانو کو قبول کر لیتا ہے اور یکہ چلانے لگ جاتا ہے۔اس طرح وہ رانو کے پریوار کا بوجھ اٹھا لیتا ہے اور رانو کی زندگی خوش حال ہو جاتی ہے۔

کہانی کے آخر میں ایک حیران کُن موڑ تب آتا ہے جب وہی لڑکا جس نے تلوکا کا قتل کیا تھا اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے رانو کی بیٹی ’بڑی‘ سے شادی کرنے کا پیغام بھیجتا ہے رانو اس رشتے کو قبول نہیں کرتی۔لیکن آخر کار رانو کا سُسر، اس کی سہیلی، رانو کی رضامندی لیتی ہیں اور پھر رانو خوشی خوشی بڑی کی شادی اس لڑکے سے کر دیتی ہے۔

اس ناول کا سب سے اہم اور مرکزی کردار رانو ہے۔رانو کا کردار بیدی کا شاہکار کردار ہے۔رانو کی شادی تلوکا سے کر دی جاتی ہے رانو کو ہمیشہ اس بات کا دُکھ تھا کہ چودھری دھرم داس اور ہرنام داس نے تلوکا کو غلط

راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے رانو کو ان سے خُدا واسطے کا بیر تھا کبھی جب رانو کے دروازے پر ڈبو کُتا روتا رہتا ہے تو اسے بھگاتے ہوئی رانو کہتی یہاں کیوں روتا ہے۔ جا سامنے کے گھر جا کر رو جہاں دولت کے ڈھیر لگے ہیں لکھتے ہیں:

''ہات..... ہات مُردے .... یہاں دھرا ہی کیا ہے، تیرے رونے کو؟......رونا ہی ہے تو سامنے چودھریوں کے گھر جا کر رو، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں، مردوں کی لام لگی ہے........''

(ایک چادر میلی سی، صفحہ نمبر ۱۶)

رانو کو شراب سے سخت نفرت تھی وہ شراب کو اپنی موت سمجھتی تھی کیونکہ اکثر یہ کہا جاتا ہے شراب پینے سے انسان ہوش میں نہیں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تلوکا شراب پیتا تھا وہ ہوش میں نہیں رہتا تھا اور رانو کو بھول جاتا تھا۔ اس وجہ سے رانو شراب کو اپنی موت سمجھتی تھی کیونکہ ایک بار جب تلوکا نے شراب پینے کے لیے اصرار کیا تو رانو نے پینے کے لیے تلوکا کو روکنا چاہا تو تلوکا نے غصے میں آ کر رانو کو مارا پیٹا۔ رانو نے اپنے سسرال میں طرح طرح کے ظلم و جبر کو برداشت کیا۔ بھوک، غریبی، ساس کے تانے، شوہر کی مار پیٹ وغیرہ ایک جگہ تو بیدی نے بھوک کی ماری رانو کو جانور کی طرح جھپٹتے ہوئے بھی دکھایا ہے اور اپنے بچوں کے کھانے کی بھی پرواہ بھی نہیں کی اور رانو کی بیٹی نے کچھ چاول اُبالے تھے لیکن رانو نے ایک دم سے کسی کی پرواہ کیے بغیر نمک مرچ ڈال کر سوکھے ہی نگل گئی اور جنداں اسے دھکے دے کر باہر نکال رہی تھی اور رانو پتھر بنی مار کھا رہی ہے۔

رانو کی زندگی میں تب دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے جب اس کے شوہر تلوکا کا قتل ہو جاتا ہے اور رانو پہلے سے بھی زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے چار بچوں کو لے کر کس کے دروازے پر دستک دے کیونکہ رانو کی سخت گیر ساس جنداں رانو کو بات بات پر طعنے دیتی ہے اور اسے باہر نکالنے کی دھمکی دیتی ہے کیونکہ

جب تلو کا رانو کو مارتا تھا تو وہ رانو کو گھر چھوڑنے کی دھمکی دیتی تھی اور پھر اس کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں:

''رانو کو اس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ اُس کے آگے تو جیسا تیسا بھی ہے لیکن پیچھے کوئی نہیں کبھی تو ایسا وقت آجاتا ہے جب ہر عورت مُڑ کر پیچھے دیکھی ہے اور نہ دیکھ سکے تو اُسے آگے بھی نظر نہیں آتا۔''

(ایک چادر میلی سی، ص۱۴)

رانو کے میکے میں کوئی نہیں تھا کیونکہ اگر عورت کو میکے کا سہارا نہ ہو تو سُسرال میں بھی اُسے عزت و توقیر نہیں ملتی۔ وہ ایک طرح سے کٹی پتنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ بے سہارا اور بے یار و مددگار ہو جاتی ہے۔ تلو کا کے قتل ہو جانے کے بعد رانو بے بس ہو جاتی ہے کیونکہ جب کسی عورت کا خاوند اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو اُس عورت کا اس گھر میں حق نہیں رہتا یہی قہر رانو پر بھی ٹوٹ پڑتا ہے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں جائے تو رانو کی سہیلی چنوں گھر میں اپنا بسیرا کرنے کے لیے اُس کو ایک رائے دیتی ہے کہ منگل سے شادی کر لے اور لیکن رانو یہ ماننے سے انکار کر دیتی ہے کہ جس منگل کو اس نے اپنے اولاد کی طرح سمجھا۔ اُس سے وہ شادی کیسے کر سکتی ہے۔ رانو کہتی ہے:

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا'' رانو نے کہا اس پر ایک لرزہ چھانے لگا منگل......بچہ ہے میں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے...عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ سال چھوٹا ہے نہیں نہیں میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی.......''

(ایک چادر میلی سی، ص ۳۶)

لیکن آخر کار رانو کے لاکھ انکار کرنے کے باوجود پنچوں کی مقرر کی گئی تاریخ پر اُن کی شادی ہو جاتی ہے:

''آنگن میں پسینے کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اوران سب پر سیندور مچل رہا تھا رانو کولا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دلروز چیخ ماری......مرنے والے آ دیکھ کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ.....''

(ایک چادر میلی سی، ص۳۵)

شادی ہونے کے بعد رانو اور منگل کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم نہیں رہتا اور رانو کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر یوں ہی ہم دونوں کے درمیان دوری قائم رہی تو منگل ہاتھ سے نکل جائے گا کیونکہ رانو جنسی آسودگی کی ضرورت مند نہیں تھی بلکہ وہ اپنے بچوں کے لیے فکرمند تھی۔ آخر کار وقت کے ساتھ ساتھ رانو کی زندگی میں خوشیاں دستک دے دیتی ہیں ا دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے رانو پورے حق سے گھر کی مالکن بن جاتی ہے۔ منگل ایک ذمہ دار شوہر ثابت ہوتا ہے۔ بیدی نے اپنے فن کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول دیوندر اثر:

''ایک چادر میلی سی میں بیدی نے انسانی کرداروں کی پیچ در پیچ شخصیت جذبات اور زندگی کے اقدار کی شکست وریخت اور لاشعور کی قوت کو زندہ کردار نگاری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا مرقع ہے .....روزمرہ کے معمولی واقعات اور اور احساسات کو فن کی بلندی تک لے جانا انسانی دُکھ درد کی منھ بولتی تصویر پیش کرنا بیدی کے فن کا کمال ہے۔''

(اُردو ناول میں طنز ومزاح، ص۳۳۷)

رانو کا کردار بے حد موثر' بلند پایہ ہمہ گیر ہے رانو کو بیدی نے ایک ایسی صبر وتحمل کی صورت بنا کر پیش کیا ہے کہ ہر

طرح کے ظلم و جبر سہنے پر بھی خاموش رہتی ہے اس کردار کا تاثر تا دیر تک قاری کے دل و دماغ پر قائم رہتا بطور بہو
، بیوی، ماں، بھابی اور سہیلی کے ایک مثالی کردار ہے اور صفحہ قرطاس پر جی اُٹھتی ہے۔ رانو
جس طرح ایک کامیاب بیٹی، بیوی اور بہو ثابت ہوئی اسی طرح ایک کامیاب ماں کا کردار بھی نبھاتی ہے جب
رانو کے کہنے کے بغیر رانو کی بڑی بیٹی ''بڑی'' کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں جنداں نے باہر کے لوگوں
کو بُلا کر ساڑھے پانچ سو روپے میں اس کا سودا طے کیا تو رانو اپنی ساس پر بہت غُصے ہو جاتی ہے اور اس کے
جواب کی تلخی و ترشی صاف دِکھائی دیتی ہے اور ناول کے آخر میں جب رانو کی بیٹی بڑی کا رشتہ یاترن کے بھائی کے
ساتھ پکا ہو جاتا ہے لیکن جب رانو اُس لڑکے کو دیکھتی ہے تو اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھی ہے کیونکہ وہ تلوکا کا قاتل
ہے رانو اس کو دیکھ کر بیہوش ہونے والے تھی کہ حضور سنگھ نے پکڑ لیا اور رانو کو سمجھایا کہ جو اس دنیا میں چلا گیا وہ
واپس نہیں آنے والا۔ یہ خُدا کا قانون ہے اور اس کے بدلے جو بھی ملے وہ وہ حکم خُداوندی ہے اُسے قبول کر لینا
چاہیے یہ ہمارے لیے بہتر ہے اور رانو حضور سنگھ کی اس نصیحت کو قبول کر لیتی ہے:

> ''رانو کا کردار بے حد موثر، بلند پایہ ہمہ گیر ہے رانو کو بیدی نے ایک ایسی صبر و تحمل کی
> صورت بنا کر پیش کیا ہے کہ ہر طرح کے ظلم و جبر سہنے پر بھی خاموش رہتی ہے اس
> کردار کا تاثر تا دیر قاری کے دل و دماغ پر قائم رہتا ہے بطور بہو، بیوی، ماں، بھابی اور
> سہیلی کے ایک مثالی کردار ہے اور صفحہ قرطاس پر جی اُٹھتی ہے۔'' رانو ہندوستان کے
> ہر صوبے ہر گاؤں ہر شہر میں اپنی پوری شہنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے اس کا لباس
> اسکی زبان چاہے مختلف ہو لیکن بر کھارت کی قوس قزح کا انت ہمیشہ جھکاؤ کی طرف
> ہوتا ہے جس پر پابندیوں، محبتوں، خلوص، ارمان اور زندگی کی چاہت کے رنگ نمایاں
> نظر آتے ہیں وہ اپنے رنگوں کی چمک پیچھے بجھا دھواں چھوڑ جاتی ہے۔''

(اُردو میں ناولٹ نگاری، ص۱۰۰)

منگل اس ناول کا دوسرا اہم کردار ہے یہ تلوکا کا چھوٹا بھائی اور رانو کا دیور ہے منگل صرف چھے برس کا تھا جب رانو کی شادی تلوکا سے ہوئی۔ رانو منگل کو اپنی اولاد مانتی تھی کیونکہ جب رانو اپنی بیٹی کو دودھ پلایا کرتی تو منگل بھی ضد کرتا ہے۔ منگل بھی رانو کو اپنی ماں کا درجہ دیتا ہے اب منگل ایک نوجوان، بیکار اور آوارہ گرد اور عاشق مزاج لڑکا ہے جو دن بھر ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ جب تلوکا اور رانو کے درمیان شراب کو لے کر جھگڑا کرتا ہے اور ایک دن ایسے ہی موقع پر منگل تلوکا کے بالمقابل آجاتا ہے اور یوں منگل اور رانو کے درمیان پہلی بار ایک نئی یگانگت کی بنیاد پڑتی ہے۔ بیدی نے منگل کے جذبات کو اس طرح سے بیان کیا ہے۔

''کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کہاں اب ایکا ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹی سی ماں کی گالی دیتے ہوئے بولا ''لا...اب لا ہاتھ نیچے، کہ عورت ہی پر ختم ہوگئی شہ روزی؟ اب اپنے باپ کا ہے تو؟''

(ایک چادر میلی سی، ص ۱۷)

منگل کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن حقیقت میں ایسا ہو جاتا ہے کہ تلوکا کے قتل ہونے کے بعد منگل کو رانو کے ساتھ شادی کرنے کے لیے گاؤں کے لوگ آمادہ کر رہے ہیں اور منگل کہتا ہے:

''نہیں نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ کبھی نہیں ہوگا........پھر وہ بولا میں ماں کی گالی نہیں کھاتا .....ان پنچوں کی ماں کا.....یہ تو کیا لاٹ اِروِن جارج پنچم بھی آجائے تو میں کبھی نہ کروں۔ یہ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے....میں سر اس کے پاؤں پر رکھ سکتا

ہوں، پانو سر پر نہیں......''

(ایک چادر میلی سی،ص ۴۸۔۴۹)

منگل کو زبردستی کھیتوں سے پکڑ کر رانو سے شادی کر دی جاتی ہے لیکن شادی کے بعد بھی منگل سلامتی کے عشق میں مبتلا رہتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سبھی گھاؤ بھر جاتے ہیں اور آخر کار منگل ایک ذمہ دار شوہر، باپ، بیٹا ثابت ہوتا ہے۔

تلوکا اس ناول کا اہم کردار ہے وہ رانو کا شوہر ہے جو کوٹلہ گاؤں میں یکہ چلاتا ہے اور سارا دِن اسٹیشن سے سواریاں لے جاتا اور لاتا ہے۔ شام کو اس تاک میں رہتا کہ کوئی بھولی بھٹکی یاترن مل جائے اور وہ اچھے کھانے اور نرم بستر کی لالچ دے کر ہرنام داس کی دھرم شالہ میں پہنچا دے اور اس کے عوض میں تلوکا کو ہر دوسرے تیسرے دن شراب کی بوتل ملتی رہے اور اِسی شراب کے وجہ سے رانو اور تلوکا کی ازدواجی زندگی میں لڑائی جھگڑے، مار پیٹ کا معمول بن جاتا ہے۔ آخر کار تلوکا کو اپنی غلطی کی سزا ملتی ہے ایک دن وہ ایک یاترن کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ بعد میں اُس کا بھائی غصے میں آ کر تلوکا کا قتل کرتا ہے اور تلوکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو جاتا ہے۔ یہ کردار بیدی کا مختصر کردار ہے اور بیدی نے اس کردار کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر اور بُرے لوگ ہمیشہ ہارتے ہیں۔

یہ بات مصدقہ ہے کہ انسان مجموعہ اضداد ہے یعنی خیر وشر، نیکی و بدی کا امتزاج اور اس میں حقیقت کی چاشنی بھی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سراسر فرشتہ، خصلت، خوش مزاج اور خوش اعمال ہوتے ہیں اور بعض لوگ بداخلاق اور مردہ ضمیر ہوتے ہیں۔ ایسے انسانوں سے ہمیشہ ڈر محسوس ہوتا ہے ایسے ہی بداخلاق انسانوں میں جنداں بھی تھی۔ جنداں رانو کی ساس ہے۔ جنداں روایتی ساس کی طرح بات بات پر رانو کو کوستی رہتی ہے جب رانو کو تلوکا شراب پی کر مارتا پیٹتا ہے تو بجائے اپنے بیٹے کو روکتی بلکہ رانو کو کوستی رہتی ہے:

''بڑھیا بکے جارہی تھی۔ اپنی کمائی سے پیتا ہے' اس کے باپ کمینے سے تو مانگنے نہیں

جاتا؟ خود تو کھپ گیا' یہ گلنج چھوڑ گیا ہمارے لیے......''

(ایک چادر میلی سی،۱۶)

جنداں کو رانو سے خُدا واسطے کا بیر تھا جب تلو کا قتل ہو جاتا ہے تو جنداں رانو پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے اور اس کا جینا محال ہو جاتا ہے:

''رنڈیے ڈائنئے چڑیلے میرے بیٹے کو کھا گئی اور اور ہم سب کو کھانے کے لیے

پھاڑے ہوئے ہے؟ چلی جا..... جدھر منہ کرنا کر لے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں

تیرے لیے''

(ایک چادر میلی سی،ص ۲۹)

جنداں ایک ایسی کم عقل عورت ہے جسے اپنی بہو سے خُدا واسطے کا بیر ہے لیکن اُس نے اپنی پوتی سے بھی دشمنی نکالنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی یعنی وہ رانو اور منگل کے کہنے کے بغیر بڑی کا سودا کرتی ہے۔ جب پنچایت کے لوگ رانو سے شادی کی بات کرتے ہیں تو اس پر بھی جنداں اس شادی سے ناخوش ہو جاتی ہے۔

حضور سنگھ اپنی بیوی جنداں کی ضد ہے وہ نیک سیرت اور خاموش طبع ہے اس کی بے نور آنکھیں ہر وقت پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں اور ہمیشہ چار پائی پر بیٹھا جپ جی صاحب کا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی جنداں بے وجہ اسے ڈانٹتی پھٹکارتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہیں یہ بیدی کا یہ کردار بزدل تو نہیں۔ لیکن جب حضور سنگھ بات کرتا ہے تو اس کی دانش مندی صاف عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ گھر کے ایک دردمند اور عاقل انسان کا کردار ہے وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ تلو کا نشے میں آ کر رانو کو پیٹے اور وہ رانو کو اس کی مظلومیت کے سبب دلی ہمدردی رکھتا ہے اور اُسے اپنی بیٹی سمجھتا ہے اور رانو بھی حضور سنگھ کو گھر کا قابلِ تعظیم بُزرگ سمجھتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ عورت

کی شادی کے بعد اس کا ساس سُسر ہی اس کے ماں باپ ہوتے بالکل اسی طرح رانو حضور سنگھ کو اپنے والد کا درجہ دیتی ہے۔

چودھری مہربان داس اور اس کا بھائی گھنشام داس ایک ایسے کردار ہیں جن کو سماج میں بلند رتبہ حاصل ہے اور یہ سماج سے چھپ کر بُرے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ان کی ایک دھرم شالہ ہے۔ یکہ چلانے والا تلوکا ان کے لیے بھولی بھٹکی سواریوں کو عمدہ کھانے اور نرم بستر کا لالچ دے کر وہاں چھوڑ آتا ہے اور وہ اس کام کے بدلے ہر تیسرے دن تلوکا کو شراب کی بوتل پیش کر دیتے ہیں۔آخر کار ان کو اپنے گناہوں کی سزا ملتی ہے۔قانون کے ہاتھ دونوں بھائیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔انہیں سات سات سال کی قید ہو جاتی ہے۔ چودھریوں کی حویلی، جائیداد وغیرہ سب کچھ ضبط ہو جاتی ہے۔دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی جاتی ہے تمام کوٹلہ میں ان کی عزت مٹی میں مل جاتی ہے۔

باواہری داس بیدی کا ایک ایسا کردار ہے جیسا کہ اکثر ہمارے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے کہ مردوں سے زیادہ یہ عورتوں میں مقبول ہیں یہ بابا پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا رہتا ہے اس کے لیے مشہور تھا کہ اس بابا نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا تھا اس کے آس پاس ہمیشہ عورتوں کا ہجوم لگا رہتا تھا کوئی اس سے بیٹا مانگتی ،تو کوئی اس سے شوہر کو ماتحت میں کرنے کے لیے ٹوٹکے کی طلب گار ہوتی ہیں رانو بھی ایک بار اپنی سہیلی کے کہنے پر بابا کے پاس ٹوٹکا لینے چلی جاتی ہے تا کہ تلوکا اس کے قابو میں رہے لیکن اس پر اس ٹوٹکے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تلوکا کی موت کے بعد جب چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشام کو قید ہو جاتی ہے تو ساتھ ہی بابا ہری داس کو بھی ان کے ساتھ جیل بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے لوہے کا لنگوٹ درحقیقت بوسیدہ سے کپڑے کا نکل آیا تھا جس سے اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں ایسے کردار ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے اور حقیقت کا رنگ دینے کے لیے مدد کرتے ہیں۔ جیسے رانو کے پڑوس میں رہنے والی عورتیں چنوں، پورن دئی، ودیا اور سلامتی، منگل کو جس سے معاشقہ تھا اور وہ بے نام لڑکا جس نے تلوکا کا قتل کیا تھا اور پھر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے رانو کی بیٹی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔

بیدی کے فن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کردار کی ضد پیش کی ہے۔ ناول کا ہر کردار بھرپور اور جاندار نظر آتا ہے اور اپنی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے اور اپنی دلچسپی سے جکڑ لیتا ہے۔ ہر کردار ہر لحاظ سے پوری طرح منفرد انداز میں سامنے آتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنداں بدگفتار، سنگدل، بے حس اور بے ضمیر عورت ہے اور اپنی بدضمیری کے سبب ہمیں متاثر کرتی ہے۔ بیدی نے ساتھ ہی تقابل کی غرض سے اس کی مکمل ضد کی بناء پر حضور سنگھ تخلیق کیا ہے جو بے حد نیک سیرت، صابر عاقبت اندیش انسان ہے۔ ہم اس کی طرف بے ساختہ کھنچے چلے جاتے ہیں۔

بیدی نے ہمیں تلوکا کا ایسا کردار دیا ترش رو، جابر، بداخلاق لیکن ساتھ ہی بیدی نے تلوکا کی ضد منگل کو بھی پیش کیا ہے جو ہوش مند، دردمند اپنے فرائض کے تیئں چوکس اور ذمہ دار، اچھا شوہر، اچھا والد، اچھا بیٹا ثابت ہوتا ہے اگر چنوں اور پورن دائی پر نظر ڈالیں تو دونوں دوستی، ایثار وخلوص کی پیکر ہیں اور اپنے کردار سے دوستی کے معنی عطا کرتی ہیں اور دوستی کے نام پر قاری پر گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ چودھری ہرنام داس اور اس کا بھائی گھنشام زناکار، بدمعاش ہے جو مذہب کی آڑ میں معصوم یاتریوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی ضد میں ہمیں بیدی نے ہمیں وہ بے نام لڑکا یاترن کا بھائی دیا ہے جو دیوی ماں کا بھگت ہے اور اپنے گناہ کی تلافی کے لئے تلوکا کی بیٹی ''بڑی'' سے شادی کرنے آتا ہے۔ گویا بیدی نے نہ صرف کردار کی ضد میں پیش کیا ہے

بلکہ یہ کردار اپنے اپنے مخصوص دائرے میں بھی توانا اور موثر ہیں ان سب سے منفرد اس ناول کا مرکزی کردار رانو ہے جو اس فن پارے کی جان ہے جو اول تا آخر اس ناول پر چھائی رہتی ہے اور اپنی موجودگی کا احساس بار ہا یاد دلاتی ہے۔

یہ ناول پنجاب کی دیہی زندگی کا مختصر لیکن ایک موثر نقشہ پیش کرتا ہے اس ناول میں پنجاب کی سرزمین کی خوشبو موجود ہے۔ جب اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو پنجاب اور پنجابیت کی تصویر آنکھوں کے روبرو آجاتی ہے کیونکہ اس ناول کا تعلق بیدی کے آبائی گاؤں ڈلے کی ضلع سیالکوٹ پنجاب سے ہے۔ جہاں کے لوگ نہ صرف ان کے جانے پہچانے تھے بلکہ ان کے عادات ،رسم و رواج سے واقف تھے۔اس ناول میں پنجاب کی زندگی ،وہاں کی مٹی کی خوشبو،مکی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی مہک آتی ہے۔

بیدی نے اس ناول کو پنجابی رنگ میں رنگ دیا ہے۔جس میں پنجاب کے لوگ گیت ، بولیاں ، کہاوتیں ،شادی بیاہ کے گیت وارث شاہ اور بُھلے شاہ کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے رہن سہن ،رسومات بھی پنجابی کلچر کی الگ پہچان ہے جس کی زندہ مثال رانو کی سہیلی چنوں ، رانو کو جب منگل سے شادی کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور بھلے شاہ کا کلام پیش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ کہا نہیں بُلھے شاہ نے ۔

بُلھیا رب دا کی ہے پاؤنا

اِیدھروں پُٹنا۔ .اُدھر لاؤنا

(ایک چادر میلی سی،ص۵۰)

پنجاب کے مرد اکھڑ اور عورتیں جھگڑالو ہیں۔ وہ خود ہی اپنا قانون بناتے ہیں اور خود ہی قانون توڑ بھی لیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ کیونکہ جب رانو کی بیٹی ’’بڑی‘‘ تیزی سے شباب

کی طرف قدم بڑھا رہی تھی وہ اپنے آپ سے بے خبر تھی، ہنستی کھیلتی، کودتی، اُچھلتی چاندنی راتوں میں ہم عمر لڑکوں کے ساتھ نکل جاتی۔ رانو اسے پھٹے پرانے تیل میں بسے کپڑوں میں رکھتی۔ اس کے بال بنانے کی بجائے بکھیر دیتی ہے تاکہ وہ نظر بد سے بچی رہے۔ جب بھی کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی ہے اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر کہتی ہے کہ:

''گورا رنگ نہ دئیں وے ربا

سارا پنڈ وَیر پے گیا

(گورا رنگ نہ دیجو پر ماتما سارا گاؤں بیری ہو گیا)

جہاں بیدی نے کرداروں کی مناسبت سے خوبصورت انداز سے پنجابی جملوں اور کہاوتوں کا استعمال کیا ہے وہیں انہوں نے پنجابی اشعار سے ناول کو سجایا ہے مثلاً

نشے دی بے بند بوتلے

تینوں پین گے نصیباں والے

بیدی نے اس ناول میں اشعار اور کہاوتوں کے ساتھ ساتھ پنجابی گیتوں کا استعمال کر کے اس ناول کو بہت خوبصورت رنگ میں رنگ دیا ہے جب منگل اور رانو کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کی سہیلیاں یہ گیت گاتی ہیں:

بابل اب تیرا کیا دعوا ہے دولھا کا باپ ڈولی کی منیاں پکڑے کھڑا ہ، اب دعوا اس کا۔

(ایک چادر میلی سی، ص ۲۶)

بیدی نے جہاں اس ناول میں شادی بیاہ کے گیتوں کو پیش کر کے ناول کو سجایا ہے وہیں ساتھ ساتھ بیدی مذہبی عقیدت کے لحاظ سے کم نہیں کیونکہ وہ ہمیشہ یہ دیکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب کوئی بھی انسان پریشان ہوتا ہے تو پہلے اپنے رب کو یاد کرتا ہے جب یاترن کے بھائی نے تلو کا قتل کیا اور لوگ اس کو لے جا رہے تھے اور

وہ نوجوان دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا لکھتے ہیں:

ما تا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں

میا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں

ہے میا تسیں ستے بھیناں گوریاں

سر لال پھلاں دیاں جوڑیاں

ما تا رانی دے دربار.... جوتاں جگدیاں

(ایک چادر میلی سی، ص ۲۵)

اس ناول میں بیدی نے جا بجا طنز و مزاحیہ اور طربیہ انداز میں منظر کشی کی ہے جس سے مسرت بخش احساس ہوتا ہے اور خوشگوار فضا قائم ہوتی ہے اور قاری اپنے غم و فکر کو وقتی طور پر بھول جا تا ہے مثلاً منگل کی شادی کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

''اوپر کسی نے منہ پر مٹھی گول کر کے باجے کی آواز نکال دی بس پھر کیا تھا سب سمجھ گئے بارات آ گئی خوب ہی دھما چوکڑی گاؤں کے سب بوڑھے، بچے، مرد عورتیں سامنے کے کھلے کے میدان میں کنویں کے من پر کوٹھوں کی چھت پر درختوں کے یہاں اوپر یہاں وہاں سب جگہ پہنچ کر بیٹھ گئے پورن دئی اور اس کی طرار ساتھن ودیا نے برات کی طرف اشارہ کر کے آئے ہوئے مہمانوں کو بندر، بھڑ وَ،یسور اور جانے اور کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اُٹھائے جس پر کھلی پڑی۔''

(ایک چادر میلی سی، ص ۷۰)

اس ناول میں بیدی نے حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ٹھیٹھ پنجابی الفاظ کا استعمال کیا ہے مثلاً اڑیا(ارے) نجروں (نظروں) خوب شورت (خوب صورت) وغیروغیرہ اور بیدی نے پھر کرداروں کی بات چیت، لب ولہجہ، لڑنے جھگڑنے اور ہنسی مذاق کا انداز بھی وہی ہے جو ہم پنجاب کی دیہی عوام کے یہاں پاتے ہیں غرضیکہ پنجاب کی دیہی زندگی کا شاید کوئی ایسا پہلو ہو جسے بیدی نے اس ناول میں اُجاگر نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں بیدی پریم چند سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیدی کے دیہاتی افسانوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تاہم دیہات اس کے تجربے کا ایک اہم جز نظر آتا ہے اس کے افسانوں میں پُر خلوص سادگی ہے وہ دیہاتی معاشرے کی عطا ہے وہ انسانی مسائل کو سادہ لوح دیہات کی نظر سے دیکھتا ہے اِس زاویے سے دیکھا دیکھیے تو بیدی ہمیں پریم چند کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں'

(راجندر سنگھ بیدی، شخصیت اور فن، ص۴۰۹)

بیدی کے فن کا کمال یہ ہے کہ اِنہوں نے اس ناول میں تشبیہات کا استعمال بھی بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔ فکشن کے تعلق سے تشبیہ ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ تشبیہ سے اظہار کو معنویت، وسعت اور رفعت ملتی ہے۔ تشبیہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ موزوں اور مناسب ہو اور اپنے مخصوص سیاق وسباق میں یوں فٹ بیٹھے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی نے تشبیہات کا استعمال کر کے ناول کو دلچسپ، دلکش اور موثر بنا دیا ہے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

(۱) منگل کی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

(۲) رانو کی گلابی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کوئی کپڑے کو دھو کر چھانٹ رہا ہو۔

(۳) وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے

(۴) اس کے ہونٹ دیوان شاہ کی دکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکڑ چکے تھے۔

(۵) آج صبح جب وہ نہا کر جوہڑ میں سے نکلی تو سُلفے کی لاٹ معلوم ہو رہی ہے تھی۔

مختصراس ناول میں بیدی نے پنجاب، پنجابی، پنجابیت کو مرکزی تحریر بنا کر سرزمین پنجاب کی شان میں چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے جس فنکاری سے عصری، سماجی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے بیدی کی فنکاری کا پتہ چلتا ہے۔''ایک چادر میلی سی'' ایک منفرد حقیقت نگاری کی وجہ سے اُردو ناول کو تاریخ میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ ناول میں بیدی کے خلوص اور اخلاق کا رنگ نمایاں ہے۔ منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور بیدی بلاشبہ صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں اور منٹو تو افسانہ نگاری میں بیدی کے شانہ بشانہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں ،لیکن ناول نگاری کے میدان میں بیدی صرف ایک ناول لے کر داخل ہوئے اور اپنا دائمی نقش چھوڑ گئے ایک چادر میلی سی بیدی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

انسان ایک سماجی جانور ہے جب تک سماج کے ساتھ اس کا رشتہ استوار نہیں ہوتا وہ ایک کامیاب انسان نہیں کہلاتا۔ سماج اور معاشرے سے تعلق رکھنا بے حد ضروری ہے جیسا کہ بیدی نے اس ناول میں واضح کیا ہے کہ کس طرح رسم ورواج اور روایات پیوست ہوتے ہیں۔ اس ناول کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بیدی انسانی زندگی کے نبض شناس فنکار اور جذبات وخیالات کو پیش کرنے میں قابلیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ بیدی اُردو فکشن میں ممتاز اور منفرد پہچان رکھنے والی شخصیت کے طور پر یاد کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

۳۔ گئودان

منشی پریم چند

منشی پریم چند

اُردو فکشن میں پریم چند سے قبل نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا کے ساتھ ساتھ رتن ناتھ سرشار نے اُردو ناول کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔لیکن پریم چند کی آمد ایک نہایت ہی خوشگوار واقعہ ہے۔ وہ نہ صرف اُردو کے ایک عظیم ناول نگار ہیں بلکہ جدید اُردو ناول کے بانی بھی ہیں۔ پریم چند اُردو ناول نگاری کے آسماں پر آفتاب

بن کر چمکے۔ پریم چند نے ۱۹۰۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ اِنہوں نے افسانے، ناول، ڈرامے وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور ایسے قابل قدر کارنامے انجام دیئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ اُردو افسانے کا موجد منشی پریم چند کو ہی کہا جاسکتا ہے۔

سوانح:

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے اور منشی لقب تھا۔ پریم چند ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پریم چند اپنے بچپن کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ہر بچے کو اپنے بچپن کی کہانیاں یاد ہوں گی جو اس نے اپنی والدہ اور بہن سے سُنی تھیں۔ کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بے قرار رہتا کہ کہانی شروع ہوتے ہی وہ کس انہاک سے اسے سنتا تھا کھلونے مٹھیائیاں اور کھیل تماشے تقریباً سبھی ذہن سے اتر چکے ہیں محض کہانیوں کی یاد ذہن میں باقی ہے۔''

(تاریخ اردو ادب۔ص، ۸۲۹)

ان کے والد ایک غریب کسان تھے جس کی روزی روٹی کاشت کاری سے چلتی تھی۔ پریم چند کے والد کا نام منشی عجائب لال اور والدہ کا نام آنندی دیوی تھا۔ پانچ سال کی عمر میں وہ مدرسے میں داخل ہوئے۔ پریم چند اپنے والد کے ساتھ مختلف گاؤں میں رہے۔ جس کی وجہ سے انہیں دیہاتی زندگی کے ساتھ رہنے اور دیہاتوں کے مسائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پریم چند صرف آٹھ برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوا پھر ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کی دادی کے سپرد ہوئی۔ ان کی دادی ان کو پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں سُناتی تھیں جس کی وجہ سے کہانیوں میں ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کچھ عرصے بعد ان کے والد نے دوسری شادی کر لی اور پریم چند سوتیلی ماں کے آنے سے شفقت پدری سے بھی محروم ہوگئے۔ اور بعد میں ان کے والد کا تبادلہ گورکھ پور ہوگیا

اور یہیں پریم چند کی تعلیم کا باقاعدگی سے آغاز ہوا۔فراق گورکھ پوری نے اس دور کی زندگی اور مشاغل پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

''پریم چند نے مجھے بتایا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے لڑکے سے ہوئی جو ایک تمباکوفروش کا بیٹا تھا۔روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس مکان پر جاتے تھے ....وہاں طلسم ہوش رُبا پڑھتے تھے ۔یہاں پریم چند اپنے کمسن دوستوں کے ساتھ اسکول کے بعد اس مکان پر جاتے تھے...........اور طلم ہوش رُبا پڑھتے اور افسانے پڑھتے سُنتے تھے ۔یہاں تک کی جب شام ہو جاتی ہے جب وہ اپنے کمسن دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر طلسم ہوش رُبا پڑھتے تھے۔یہاں تک کہ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا لیکن اس اثناء میں پریم چند ہمیشہ کے لئے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے ۔درحقیقت ان قصوں اور کہانیوں کو جس دلچسپی اور اشتیاق سے انھوں نے سُنا تھا اس سے ان کی قوت بیان میں روانی اور وضاحت کے اندر جذب ہو گئے ۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ،ص ۳۰)

پریم چند کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔صرف داستانیں ہی نہیں بلکہ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ اُردو میں جو بھی پڑھنے کو ملتا سب بڑی دلچسپی سے پڑھتے ۔انہوں نے اپنے ایک مضمون ''میری پہلی تخلیق ''میں بڑی تفصیل سے کہا ہے:

''اس وقت میں میری عمر کوئی تیرہ سال کی ہوگی ۔ ہندی بالکل نہیں نہ جانتا تھا اُردو کے ناول پڑھنے کا جنوں تھا۔مولانا شرر،پنڈت رتن ناتھ سرشار،مرزا ہادی رسوا اور مولوی مُحمد علی جوہر دوئی نواسی اس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے ان کی

چیزیں یہاں مِل جاتی تھیں۔اسکول کی یاد بھول جاتی تھی۔کتاب ختم کر کے

ہی دم لیتے تھے۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ص ۳۰)

پریم چند صرف ۱۵ برس کے تھے ان کی شادی کر دی گئی اور گھر کی ساری ذمہ داری پریم چند کے سر پر پڑ گئی اس کے برعکس انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور تعلیم جاری رکھی۔اور ٹریننگ کالج بھیجا گیا۔جہاں وہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک رہے۔اسی زمانے میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ایک ناول ''اسرار معابد'' لکھا۔جو'' آواز خلق ''میں ہفتہ وار اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور یہ ناول نامکمل ہی رہا۔اس کے بعد کان پور کا قیام ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم موڑ رہا اور ان کی مُلاقات دیا نارائن نگم سے ہوئی جو رسالے ''زمانہ'' کے ایڈیٹر تھے اور بڑی پابندی سے اس رسالے میں مضامین لکھتے رہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ملک بھر میں آزادی حاصل کرنے کی آواز بُلند ہو رہی تھی اور وطن کے یہ حالات دیکھ کر پریم چند متاثر ہوئے اور انہوں نے وطن پرستی کے موضوع پر کئی افسانے لکھے اور ان افسانوں کو''سوز وطن'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا۔لیکن انگریزی حکومت نے اس مجموعے کو نہ صرف ضبط کر لیا بلکہ ۱۹۸۰ء میں اس پر نہ صرف پابندی لگا دی گئی بلکہ اس کی ساری کاپیاں بھی جلا دی گئی۔ ۱۹۱۴ء کے بعد مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست پر نمودار ہوئے اور پریم چند گاندھی جی کی شخصیت اور آزادی کی لگن سے کافی متاثر ہوئے اور ملازمت چھوڑ دی اور اپنا ایک پریس قائم کیا اور ہنس نام کا رسالہ ہندی میں جاری کیا اس کے ساتھ ہفتہ وار اخبار ''جاگرن'' شائع کیا۔جوں جوں وقت گزرتا گیا پریم چند کی محنت اُس سے وفا نہ کرسکی اور طویل عرصے کی بیماری کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں انتقال کر گئے

پریم چند کی تصانیف:

افسانوں کے مجموعے:

خاک پروانہ	(۱۹۰۸)
پریم پچیسی حصہ اول	(۱۹۱۵)
پریم پچیسی حصہ دوم	(۱۹۱۵)
پریم بتیسی حصہ اول	(۱۹۱۸)
پریم بتیسی حصہ دوم	(۱۹۲۰)
خاک پروانہ	(۱۹۲۸)
خواب خیال	(۱۹۲۸)
فردوس خیال	(۱۹۲۹)
پریم چالیسی	(۱۹۳۰)
نجات	(۱۹۳۳)
آخری تحفہ	(۱۹۳۴)
زادِراہ	(۱۹۳۶)
دودھ کی قیمت	(۱۹۳۷)
واردات	(۱۹۳۷)

پریم چند کے ڈرامے:

سنگرام	(۱۹۲۳)

کربلا (۱۹۲۴)

پریم کی دیوی (۱۹۳۳)

سوانح مضامین:

ان کا سوانح مضامین ''باکمال کے درشن'' کے عنوان سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا جس میں راجا پرتاب' راجا مان سنگھ' سوامی وویکانند کے بارے میں مضامین قلمبند ہیں۔ ''باکمال کے درشن'' کا دوسرا حصہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جن میں سرسید احمد خان' مولوی وحیدالدین سلیم' عبدالحلیم شرر وغیرہ کی اہم شخصیتوں پر مضامین لکھے

پریم چند کے ناول:

اسرار معابد (۱۹۰۳)

ہم خرما و ہم ثواب (۱۹۰۷)

کشنا (۱۹۰۸)

جلوۂ ایثار (۱۹۱۲)

بازارِ حُسن (۱۹۱۷)

گوشۂ عافیت (۱۹۲۰)

نرملا (۱۹۲۱)

چوگانِ ہستی (۱۹۲۴)

پردۂ مجاز (۱۹۲۵)

بیوہ (۱۹۲۷)

غبن	(۱۹۳۲)
میدانِ عمل	(۱۹۳۲)
گئودان	(۱۹۳۶)
منگل سوتر	(نامکمل)

پریم چند کا پہلا ناول (اسرارِ معابد) اور آخری ناول (منگل سوتر) دونوں نامکمل رہے ۔''اسرار معابد''۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء میں ہفتہ وار اخبار'' آواز خلق''میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔لیکن بعد میں اس اشاعت بند کردی گئی۔منگل سوتر پریم چند کے انتقال کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکا۔

گئودان پریم چند کا آخری مشہور ناول ہے جو بے حد مقبول ہوا۔یہ ناول انہوں نے میدان عمل کے بعد (۱۹۳۲۔۳۵) میں قلمبند کیا اس زمانے میں پریم چند بمبئی میں تھے۔بمبئی سے ۲۰ اپریل ۱۹۳۴ء کو اپنے دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

''ناول گئودان کے آخری صفحات لکھنے کو باقی ہیں ادھر طبیعت ہی نہیں جاتی اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں ، وہاں دولت نہیں ہے مگر سکون قلب ضرور ہے یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کررہا ہوں۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۔۲۷۶)

پریم چند نے یہ ناول سب سے زیادہ عرصے ۱۹۳۲ سے ۱۹۲۵ میں لکھا۔یہ ناول مکمل طور پر ۱۹۳۶ میں شائع ہوا۔پہلے یہ ناول ہندی میں قلمبند ہوا اور بعد میں پریم چند کی وفات کے بعد مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔یہ ناول ۵۹۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔انگریزی میں اس کا ترجمہ جے رتن نے (۱۹۵۷) اور گورڈان ۔سی

نے (۱۹۶۸) The gift of cow کے نام سے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں گئو دان پر ہندی فلم بنائی گئی جس کے اہم کردار راج کمار، محمود اور ششی کلا ہیں۔ اس ناول کے تعلق سے دوردرشن ٹیلی ویژن پر قسط وار پروگرام ''تحریر منشی پریم چند کی'' کے نام سے نشر کیا جانے لگا جس کی وجہ سے یہ ناول مشہور ثابت ہوا۔ اس کے پلاٹ کو پریم چند کے ۳۶ ابواب میں تقسیم کیا۔ اُردو اور ہندی کے بیشتر ناقدین نے گئو دان کو نہ صرف پریم چند کا بلکہ اُردو اور ہندی کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی گئو دان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''گئو دان تصنیف (۱۹۳۴۔۱۹۳۵) پریم چند کا آخری ناول ہے اس کے بعد انہوں نے ''منگل سوتر'' لکھنا شروع کیا۔ مگر وہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ ایسی صورت میں ''گئو دان'' ہی کو ہم ان کی آخری تخلیق قرار دیں گے ۔یہی کہ زمانے کے اعتبار سے ''گئو دان'' پریم چند کا آخری ناول ہے۔ بلکہ فن کے اعتبار سے بھی اُن کی آخری منزل ہے۔ پریم چند نے اس سے بہتر کوئی ناول نہیں لکھا۔''

(دھنپت رائے، نواب رائے پریم چند۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ، ص ۶۹)

پریم چند کی دلی تمنا تھی کہ دیہات میں رہ کر دیہاتیوں کی خدمت میں زندگی بسر کرے کیونکہ بہت عرصے تک پریم چند کو دیہات میں رہنے اور قریب سے دیہاتیوں کے مسائل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جس کی زندہ مثال ''گئو دان'' ہے۔ اس ناول میں حقیقت نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ناول میں پریم چند کے فن کا کمال یہ ہے کہ جو کردار جیسے ہیں ویسے ہی پیش کیے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند کسانوں کے انقلابی شعور کو سامنے لاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فرد کے اخلاقی تہذیب و تربیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ گئو دان جس زمانے میں تصنیف کیا گیا وہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کی تحریک برطانوی سامراج سے ٹکرا رہی تھی اور فرنگی

حکومت کا ظلم و جبر اپنے پورے شباب پر تھا۔ اور قوم کی حالت دن بہ دن خستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اور سب سے زیادہ بُری حالت کسانوں کی تھی۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کا ظلم و جبر سہنا ان کا مقدر بن چکا تھا۔ کیونکہ اکثر فکشن میں یہ دیکھا گیا ہے کہ زمیندار لوگ ظالم اور مزدور لوگ مظلوم ہوتے ہیں اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پریم چند نے گئو دان میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔

ناول کے پلاٹ میں ہوری بیلاری گاؤں کے کسان ہوری کی زندگی کی کہانی ہے۔ اس کے کنبہ میں ہوری کی بیوی دھنیا ایک بیٹا گوبر اور دو بیٹیاں روپا اور سونا ہے۔ تین چار بیگھے زمین کی پیداوار سے بڑی مشکل سے اس خاندان کا گزارا ہوتا تھا۔ ہوری کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اپنے دروازے پر ایک گائے بندھی دیکھے اور اپنے ایک ساتھی بھولا سے گائے حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کا بھائی گائے کو زہر دیتا ہے۔ دوسری طرف ہوری کے بیٹے گوبر نے بھولا کی بیٹی کو دیکھا اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور اسے اپنے گھر بھگا کر لے جاتا ہے اور خود ماں باپ کے ڈر سے شہر فرار ہو جاتا ہے۔ جھنیا کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے ہوری کے مصائب اور پریشانیوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ برادری اور مذہبی ٹھیکیدار ہوری کے بیٹے کی غلطی کو جرم قرار دیتے ہیں اور جرمانے کے طور پر فصل کی ساری پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور بھولا اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے اور گائے کے بدلے میں ہوری کے بیل لے جاتا ہے۔ ہوری کی حالت روز بروز خستہ ہوتی جا رہی تھی۔ گوبر شہر سے لوٹتا ہے گوبر اب کسان نہیں بلکہ ایک شہری مزدور بن جاتا ہے۔ ہوری کی بیٹیاں روپا اور سونا بڑی ہو چکی تھی۔ ہوری قرض لے کر سونا کی شادی کا بندوبست کرتا ہے لیکن وہ بے حد مقروض ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی چند بیگھے زمین کو ہر ممکن طریقے سے بچا رہا تھا یہاں تک کہ اپنی بیٹی روپا کو بوڑھے رام سیوک کے ہاتھ صرف دوسو روپے میں بیچ دیتا ہے۔ آخر کار ہوری کسان سے مزدور بن جاتا ہے اور اور ہوری کی زندگی پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا

ہے اپنے کنبہ کا پیٹ پالنے کے لیے ہوری دھوپ اور تپتی زمین پر کام کرتا رہتا ہے تو اسے (لُو) جان لیوا گرم ہوا کا ایک جھونکا ہوری کی جان لیتا ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہوری کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے پنڈت ہوری کی بیوی سے گئو دان کرنے کو کہتا ہے اور پریم چند کے الفاظ میں ناول ختم ہو جاتا ہے:

> ''دھنیا مشین کی طرح اُٹھی۔آج جو سُتلی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی''مہراج گھر میں نہ گائے ہے، نہ بچھیا نہ پیسا، یہی پیسے ہیں، یہی ان کا گئو دان ہے اور غش کھا کر گر پڑی''

(گئو دان۔ص ۴۶۴)

کردار نگاری ناول کا ایک اہم پہلو ہے۔ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ جو کردار پیش کیا جائے پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو جائے کہ ہم نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور برسوں سے اس کے ساتھ رہے ہیں اور جب گئو دان کا مطالعہ کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی ہوری کے گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور برسوں سے ہمارا ان سے کوئی گہرا رشتہ ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''حقیقت میں ہے کہ کردار کسی بھی قسم کے ہوں ان میں زندگی کا ہونا ضروری ہے۔ان میں ایک صفت ہو یا وہ خاص صفت کے مُجسمے یا اشارے ہوں ۔ضروری ہے کہ ان کی یہ صفت اس طرح نمایاں کی جائے کہ وہ ہمارے طرف کھینچیں اور ان نے حرکات وسکنات' بات چیت وغیرہ سے یہ بھی ظاہر ہو کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کی طرح ہوں۔''

(تنقیدی دریچے، صفحہ ۱۱۴)

گئو دان کا سب سے اہم اور مرکزی کردار ہوری ہے۔ گئو دان کا ہیرو ہوری کی کہانی ہر طرح سے مکمل ہے اور پریم چند کے فن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک معمولی کسان ''ہوری'' کو ناول کا ہیرو بنایا۔ وہ محنت اور شفقت کا قائل ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کو ہر وقت ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوری کے پاس چار پانچ بیگھے زمین ہے اس سے اپنی بیوی دھنیا' لڑکا گوبر اور دو بیٹیاں روپا اور سونا کا پیٹ پالتا ہے۔ ہوری کی دلی تمنا تھی کہ اس کے دروازے پر گائے بندھی دیکھے اور ہوری بھولا کو دوسری شادی کی لالچ دے کر گائے کو ادھار سے حاصل کر لیتا ہے۔ جب ہوری گائے کو اپنے گھر لاتا ہے تو اس کا بھائی حسد میں آ کر گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ ہوری کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی۔ دوسری طرف ہوری کا بیٹا گوبر بھولا کی بیٹی کو دیکھتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور جھنیا کو گھر لاتا ہے اور خود ماں باپ کے ڈر سے شہر فرار ہو جاتا ہے۔ جھنیا کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے مذہبی ٹھیکیدار اسے جرم قرار دیتے ہوئے فصل کی ساری پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور بھولا گائے کے بدلے اور اپنی بیٹی کی بے عزتی کے عوض ہوری کے بیل کھول لے جاتا ہے اور ہوری کی بیٹیاں روپا اور سونا بھی بڑی ہو چکی تھیں۔ ہوری قرض لے کر سونا کی شادی کر دیتا ہے اور بہت مقروض ہو جاتا ہے۔ یوں ہوری کسان سے مزدور بن جاتا ہے۔

ہوری ایک عام کسان تھا لیکن اس بات کا بڑا فخر تھا کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے کسانوں سے بڑھ کر سمجھتا تھا کیونکہ وہ زمینداروں کے زیادہ رہتا تھا۔ جب اس کی بیوی زمینداروں کے پاس جانے اور ان کی خوشامد کرنے کو روکتی ہے تو وہ چڑ جاتا تھا اور کہتا تھا۔

''تو جو بات سمجھتی نہیں اس میں کیوں ٹانگ اڑاتی ہو؟ میری لاٹھی دے اور اپنا کام دیکھ۔ یہ اُسے ملتے جلتے رہنے کا پھل ہے، نہیں تو کہیں پتا بھی نہیں لگتا.....کدھر گاؤں

میں اتنے آدمی تو ہیں۔کس کی بے دخلی نہیں ہوتی ؟کس پر کُرکی (قرقی) نہیں آئی

!جب دوسروں کے پانو تلے اپنی گردن لی ہے تو ان کوسہلانے ہی بھلائی ہے۔''

(گئودان، ص۶)

کسانوں کی زندگی میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جاگیردارانہ نظام ہے۔وہ ملکیت زمین کا مسئلہ ہےاورکسان اپنی زمین کو ماں کا درجہ دیتا ہے۔ہوری کی بھی مجبوری تھی کہ وہ اپنی زمین کوکسی بھی حالت میں کھونہیں سکتا تھااور رائے صاحب کی ہمیشہ جی حضوری کرتا تھااس خوشامد پر ہوری کے بیٹے گوبر کو بہت غُصہ آتا ہےاور ہوری سے کہتا ہے کہ جب بھگوان نے سب کو برابر برابر بنایا ہےتو ہم ان کی جی حضوری کیوں کریں تو ہوری کا جواب یہ ہے کہ یہ سب بھگوان کی طرف سے ہے ہوری کا یہ ماننا تھا کہ جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے اس کا اجر اس جنم میں ملتا ہے۔اس کا یہ ماننا تھا کہ بڑے لوگوں نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے اس لئے اس جنم میں ان کوعیش وآرام میسر ہے گوبر کہتا ہے کہ جب ہم سے زمین کا لگان لیا جاتا ہےتو ہم رائے صاحب کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت ہےتو ہوری کہتا ہے:

''اس وقت یہی خیالات ہوری کے دِل میں آرہے تھےمگرلڑکے کے باغیانہ جذبے کودبانا ضروری تھابولا''سلامی کرنے نہ جائیں تو رہیں کہاں؟ بھگوان نے جب غلام بنادیا ہےتو اپنا کیا بس ہے؟اس اسلامی کی برکت ہے کہ دوارے پرجھونپڑی بنالی اورکسی نے کچھ نہ کہا...............اپنے مطلب کے لیےسلامی کرنے جاتا ہوں۔''

(گئودان،ص۲۰)

ہوری کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اپنی زمین کو بچانا تھا جس کے عوض اپنی بیٹی روپا کو بوڑھے رام سیوک کے ہاتھوں دوسو روپے میں بیچ رکھا ہے۔ جب ہوری روپے لے رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مُنہ پر ذلت کا تمانچہ پڑچکا تھا۔ ہوری کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ اپنی نظروں میں گر چکا تھا لیکن کہیں نہ کہیں اس میں انسانیت باقی تھی۔ اُس کی جھکی ہوئی نظروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ اس کردار میں کہیں بناوٹ نظر نہیں آتی ہے۔ ہوری کے کردار میں سارے ہندوستانی کسانوں کے دل کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں۔ وہ ایک عام کسان ہے جس میں رسم و رواج کا احترام پوری شدت سے موجود ہے۔ وہ محنت اور مشقت کا قائل ہے وہ ایک ایسا شخص ہے جسے ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوری کا کردار اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں حقیقت نگاری آنکھوں میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اس کے مختلف مسائل بیوی بچوں سے اس کے تعلقات، بھائی بندوں کی رقابتیں محبتیں، شادی وغم، دُکھ درد، آرزوئیں ، رسم و رواج، دردمندی اور ہمدردی غرض کوئی ایسا پہلو نہیں جسکو پریم چند نے پیش نہ کیا ہو۔ ہوری کے کردار میں کسی قسم کا جھول نظر نہیں آتا۔ وہ کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا بلکہ سب کو معاف کر دیتا ہے۔

اس ناول کا دوسرا اہم کردار دھنیا ہے۔ یہ ایک ایسی وفادار بیوی ہے جو قدم قدم پر اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ نرم دِل ہے۔ غریبی اور محتاجی کے سبب اس کے مزاج میں چڑ چڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوری کی طرح وہ چُپ چاپ ظلم وستم کو برداشت نہیں کرتی بلکہ جب بھی موقع ملے صدائے احتجاج بُلند کرتی ہے۔ جب ہوری زمینداروں کی خوشامد کرتا ہے تو دھنیا کو اس بات پر ہوری پر غصہ آتا تھا اور آئے دن چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جب ہوری اور دھنیا آپس میں مذاق کرتے ہیں تو ہوری دھنیا سے کہتا ہے:

''ساٹھ تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے پائے گی دھنیا! اس کے پہلے ہی چل دیں گے

''دھنیا نے آزردگی سے کہا اچھا رہنے دو' منھ سے اُسبھ نہ نکالو' تم سے کوئی اچھی بات

بھی کہے تو کوسنے لگتے ہو۔''

(گئو دان، ص ۷)

جب گوبرا پنی بیوی جھنیا کو اپنے گھر چھوڑ کر خود شہر فرار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے سماج و مذہبی ٹھکیدار ہوری سے جرمانہ وصول کرتے ہیں لیکن دھنیا جھنیا کو اپنی مصیبت کی باعث سمجھنے کے باوجود اس کو اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے اس کو ہر طرح پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔ دھنیا ہوری کا قدم قدم پر ساتھ دیتی ہے اور ہندوستانی عورت کی طرح ہر وقت ہوری کے ساتھ مصیبتوں کا سامنا کرتی رہتی ہے کہانی کے آخر پر جب ہوری کھیتوں میں مزدوری کرتا ہے۔ لیکن اس کے جسم میں طاقت نہیں رہتی۔ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ جب ذرا سا ہوش آتا ہے تو دھنیا سے کہتا ہے۔

'' میرا کہا سُنا معاف کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں۔ گائے کا ارمان من ہی میں رہ گیا ۔اب تو یہاں کے روپے کریا کرم میں لگ جائیں گے۔ رومت دھنیا! اب کب تک جلائے گی۔ سب طرح کی دُرگت تو ہوگئی اب مرنے دے۔''

(گئو دان۔ ص ۴۶۳)

آخر میں جب پنڈت دھنیا کو گئو دان کرنے کو کہتا ہے تو دھنیا کہتی ہے۔ جو سُتلی بیچی تھی اس کے بیس آنے آئے تھے۔ گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا نہ پیسا ہے یہی اس کا گئو دان ہے اور غش کھا کر گر پڑتی ہے۔ اگر اس ناول کا مرکزی کردار ہوری پورے ناول میں چھایا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ دھنیا بھی اول تا آخر میں ناول میں نظر آتی ہے اور قدم قدم پر ہوری کا ساتھ دیتی ہے۔ یہاں تک ناول کا اختتام بھی دھنیا کی بے ہوشی پر ہوتا ہے جو قارئین کے ذہنوں میں ایک گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔

اس ناول کا تیسرا اہم کردار ہوری اور دھنیا کا بیٹا گوبر ایک باغی کسان ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ

کھیتوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے والد سے ناخوش رہتا ہے کیونکہ اس کو بالکل پسند نہیں تھا کہ اس کا والد زمینداروں کی خوشامد کرے۔ وہ زمینداروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور صدائے احتجاج بُلند کرتا ہے ۔جب ہوری اور گوبر بھولا کے گھر گائے لانے جاتے ہیں تو گوبر اور بھولا کی بیٹی جھنیا کو ایک دوسرے سے عشق ہو جاتا ہے اس کو اپنے گھر رکھ کر خود شہر فرار ہو جاتا ہے ۔شہر میں جا کر گوبر کسان سے مزدور بن جاتا ہے ۔اور اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے ۔اسے زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم وستم کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں کے ظلم کا بھی احساس ہوتا ہے ۔سیلاب کی طرح بڑھنے والے سود کے خلاف بھی آواز بُلند کرتا ہے ۔ گوبر کا کردار ایک realistic کردار ہے ۔گاؤں آ کر اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے ۔کھنہ کی ہڑتال میں بڑے عزم سے حصّہ لیتا ہے ۔ جب ہوری گوبر کے سامنے رائے صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو کر گھر میں گوبر سے کہتا ہے کہ ہمیں لگتا ہے کہ ہم غریب لوگ ہی دُکھی ہوتے ہیں ۔امیر لوگ بھی دُکھی ہوتے ہیں ۔تو گوبر کہتا ہے ۔

> ’’جسے دُکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موٹر نہیں رکھتا ، محلوں میں نہیں رہتا ، حلوا پوری نہیں کھاتا اور نہ ناچ رنگ میں پھنسا رہتا ہے ۔آرام سے راج کا سُکھ بھوگ رہے ہیں اس پر دُکھی بنتے ہیں ۔‘‘

(گئودان ، ص۲۲)

گئودان کے معاون کرداروں نے جگہ جگہ اپنے نقوش چھوڑے ہیں ۔ ہوری کی بیٹیاں روپا اور سونا جو ہمیشہ حالات سے سمجھوتہ کرتی ہیں اور پورے ناول میں صبر وتحمل سے کام لیتی ہے ۔سونا اور روپا آخر جوان ہو گئی جب لڑکیاں جوان ہوتی ہیں تو ماں باپ کے لیے یہ بات فکر مند ثابت ہوتی ہے ہوری بھی اس بات کے لیے نہایت فکر مند رہتا ہے ۔ ہوری کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ ان کی شادی کر سکے ۔ بہر حال قرض لے کر وہ سونا کی شادی کا بندو بست کرتا ہے لیکن وہ بہت مقروض ہو جاتا ہے ۔اب ہوری کے لیے گزر بسر کرنا مشکل

تھا۔وہ اپنی پشتانی زمین کو بچانے کی بے حد کوشش کرتا ہے اور اپنی تین بیگھہ زمین کو بچانے کے لیے اپنی دوسری بیٹی روپا کو بوڑھے رام سیوک کے ہاتھوں دوسو روپے میں بیچ دیتا ہے۔اور روپا اپنے والد کے لئے یہ قربانی دیتی ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں ایسے کردار ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔اس ناول میں پریم چند نے شہری زندگی اور اپر مڈل کلاس لوگوں کے حالات کو اپنے ناول میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

رائے اگر پال سنگھ گئودان کی ایک اہم شخصیت ہے زمیندار ہیں علم وادب اور موسیقی سے دلچسپی ہے۔ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا لیکن انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔قوم پرست انسان ہیں اور حاکموں سے میل جول رکھتے ہیں۔قومی تحریک کی وجہ سے جیل بھی جا چکے ہیں اور اس طرح کسانوں کو اپنا عقیدت مند بنا لیتے ہیں ۔لیکن کسانوں پر ان کا ظلم کم نہیں ہوتا۔وہ اپنی حیثیت اور طبقاتی مفاد رکھنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے کام لیتا ہے۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار پنڈت داتا دین گاؤں کے ساہوکار تھے۔وہ دھرم کے ٹھیکیدار تھے۔ان کے نزدیک دھرم میں جو مزا ہے وہ اور کسی میں نہیں۔جب ہوری کے بیٹے کی غلطی پر جھنیا کو گھر میں رکھا جاتا ہے تو وہ ہوری سے جرمانہ وصول کرتے ہیں۔لیکن جب پنڈت کا بیٹا ما تا دین ایک چمارن کی بیٹی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دھرم خطرے میں پڑتا ہے تو وہ تین سو روپے دے کر اپنے بیٹے کا دھرم واپس لے لیتا ہے۔

پروفیسر مہتہ گئودان کا ایسا کردار ہے جو یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔پروفیسر مہتہ سچے اصول پرست انسان دِکھائی دیتے ہیں۔جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کی زبان میں خود

پریم چند بول رہے ہیں جیسا کہ قمر رئیس نے بھی اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے۔

''بہت سے قومی مسائل کے بارے میں مسٹر مہتہ کے خیالات خود پریم چند کے خیالات ہیں۔ وہ فلسفہ کے پروفیسر ہوتے ہوئے ایک عملی انسان ہیں........ پریم چند شاید ایسے ہی افراد کے ہاتھوں میں قومی تحریک کی باگ دینا چاہتے ہیں۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص۲۹۳)

مسٹر مہتا کی رہنمائی صرف رائے صاحب زمیندار، مسٹر کھنہ سرمایہ دار، ڈاکٹر مس مالتی، مسز کھنہ ہی قبول نہیں کرتے بلکہ مزدور لوگ بھی دِل و جان سے ان کی حمایت کرتے ہیں۔ مسٹر مہتا تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی عورت کی آزادی کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک عورت محبت اور ایثار کی دیوی ہے۔ جو ہر وقت زبانی اور قربانی سے اپنے آپ کو مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جُز بن جاتی ہے۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار پنڈت اونکار ناتھ بھی ہیں۔ جو اخبار' بجلی کے ایڈیٹر ہیں۔ سرمایہ داران کے مخالف ہیں۔ دولت کا حصول ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ ان کو دھن کمانے کا خوب تجربہ ہے۔ نام اور پیسے کمانے کے لیے مرزا خورشید کے ساتھ مل کر مزدور تحریک چلاتے ہیں۔ وہ اپنے الفاظ میں کہتے ہیں:

''اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کچھ سمجھا نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے اور رہے گا۔''

(گئودان۔ص۹۴)

جس مزدور یونین کے پنڈت اونکار ناتھ سکریٹری ہیں اس کے صدر مرزا خورشید ہیں۔ وہ ایک آزاد طبعیت کے آدمی ہیں اور مزدور کی تحریک میں بطور تفریح چلے جاتے تھے۔ پنڈت اونکار ناتھ کی طرح کبھی لڑائی

سے نہیں بھاگتے ۔مرزا خورشید ایک اعلٰی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔مرزا نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ان کے پاس جوتے کی ایک دُکان تھی جس سے وہ ہر دِن چار پانچ سو کما لیتے تھے۔اگر چہ خورشید مرزا مزدوروں کے ساتھ کھڑے ہوتے تو دوسری طرف حکمران طبقے سے ان کے گہرے تعلقات تھے جس کی وجہ سے انہیں اپنی جدوجہد میں ناکامی ملتی تھی۔

مِس مالتی بھی اس ناول کا اہم کردار ہے جو ایک مغرب زدہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سُدھارنے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن پریم چند مہتا سے اس کی شادی نہیں ہونے دیتے کیونکہ آخر تک وہ ان کے تصورات کی عورت نہیں بن سکی ۔مس مالتی کو مسٹر مہتا کے جذبہ رقابت کی حیوانیت سے سخت نفرت تھی۔لیکن مس مالتی اس ادرش تک نہیں پہنچ پاتی جس کی پریم چند کو ایک ہندوستانی عورت سے توقع ہے۔

گئودان کا ایک اور کردار ٹنخا ہے۔ٹنخا ایک دلال قسم کا آدمی ہے۔جو ہمیشہ اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے۔وہ اپنی چاپلوسی، چالاکی اور فریبی سے زمینداروں میں حصہ بٹوا تا ہے۔جو وہ کسانوں سے حاصل کر لیتا ہے۔یوں تو وہ بیما کمپنی کے ایجنٹ ہیں لیکن اس کا خاص پیشہ زمینداروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف اُکسانا ان کا مقصد تھا۔

اس کے علاوہ اس ناول میں بہت سے ایسے کردار ہیں مثلاً کشن پرساد کول، گوبندی دیو وغیرہ ایسے کردار ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

اس ناول میں پریم چند نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔کیونکہ حقیقت نگاری کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کو جس طرح دیکھا جائے اُسی طرح پیش کیا جائے۔گئودان میں پریم چند نے دیہاتی زندگی کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہے جو ذہن کو متاثر ہی نہیں کرتی بلکہ نہ مٹنے والے نقوش دِل ودماغ پر چھوڑ جاتے ہیں اس

حقیقت نگاری نے گئو دان کو پریم چند کا لازوال ناول بنا دیا ہے

گئو دان میں پریم چند نے حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وقت کے بہاؤ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ناول کے مطالعے کے بعد یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ ہوری پہلے کسان تھا۔ گوبر باشعور لڑکا بن جاتا ہے روپا اور سونا بڑی ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا چلا جاتا ہے ہوری موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ فطری انداز میں ناول نگار کو ناول کے مرکزی کردار کی موت کو پیش کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے کیونکہ ناول کا پورا تاثر اسی سے وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند نے وقت کے بہاؤ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہوری کی موت بالکل حقیقی اور قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح ناول میں پریم چند نے حقیقت کا رنگ دینے کے لیے بہت سے ایسے کردار پیش کئے ہیں جو مختلف حربوں سے کسانوں کا خون چُوستے ہیں۔ اس سلسلے میں زمیندار رائے صاحب اور اُونچے طبقہ کے نمائندہ کردار ہیں کہ جو کسان ان سے ایک بار قرض لیتا ہے اور ساری عمر قرض چُکانے میں نکل جاتی ہے اور آخر تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔

اس ناول میں پریم چند نے حقیقت کا رنگ دینے کے لیے زندگی کی سچائی کو واضح اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کا ثبوت ہے۔ یہ ناول اس زمانے کی حقیقی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو پیش کرتا ہے جس زمانے میں یہ لکھا گیا ہے اُس سماج میں جتنی بھی بُرائیاں اور خامیاں تھیں وہ تمام ناول کو پڑھنے کے بعد آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں اس لئے کہا جاتا ہے کہ گئو دان حقیقت نگاری کا بھرپور شاہکار ناول ہے۔ پریم چند کا یہ ناول حقیقت نگاری کی وجہ سے آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ اُس زمانے میں تھا۔

پریم چند نے گئو دان میں حقیقت نگاری کا ایسا فنکارانہ کمال دکھایا ہے جو قابل تعریف ہے۔ انہوں نے اس ناول میں دیہاتی زندگی کے ساتھ شہری زندگی سے متعلق ایسے منظر پیش کئے ہیں جو حقیقت کے بالکل قریب

نظر آتے ہیں۔ جب بھی ناولوں کی حقیقت نگاری کی بات کی جائے تو منشی پریم چند کے اس ناول کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہوری کو ایک کسان کی زندگی اور اس کے پورے ماحول کو جس انداز میں پریم چند نے پیش کیا ہے اس کا جواب نہیں اس طرح ''گئو دان'' اُردو ناول نگاری میں اہمیت کا حامل ہے اور اس کے ساتھ پریم چند کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ کے۔ کے کُھلر گئو دان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''گئو دان پریم چند کا آخری ناول ہے اور سب سے بہترین غم اور غصے کے ساتھ ساتھ اس میں امید بھی ہے آنے والے کل کی........... پریم چند نے عام لوگوں کی زبان میں لکھا پریم چند کسی اخبار کی سُرخی نہیں ہے اور نہ ہی خالی نعرہ پریم چند کا ایک خیال ہے۔ پریم چند ایک پیغام ہے۔''
>
> (اُردو ناول کا نگار خانہ' کھلر کے کے' ص۔۴۳)

اس ناول میں پریم چند نے عورت کے مسائل کا اظہار خیال کیا ہے۔ گئو دان میں پریم چند نے عورت کو جس نقطہ نظر سے دیکھ کر پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت کو گھر کی چار دیواری کے باہر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مسٹر مہتا کے خیال میں عورت کا دائرہ عمل بنیادی طور سے مرد سے مختلف ہے۔ جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ مہتا کی زبان خود پریم چند بول رہے ہیں۔ مسٹر مہتا کے مطابق عورت کا دائرہ عمل بالکل مختلف ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف گرہستی ہے۔ لیکن پریم چند عورت کی آزادی کے مخالف نہیں۔ لیکن ناول کے اس حصے میں پریم چند نے بالخصوص تعلیم یافتہ عورتوں پر مذمت کی ہے جو ان کی حد سے بڑھتی ہوئی مغرب سے متاثر زندگی ہے اس طرح پریم چند نے ہر رُخ اور ہر پہلو کو بڑی گہرائی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اِندر ناتھ مدان لکھتے ہیں:

> ''متوسط طبقہ کی اس سرگذشت سے پریم چند کے ان خیالات کی وضاحت ہوتی ہے

جو وہ مغربی تہذیب کی اشاعت کے بارے میں رکھتے تھے انھوں نے مغربی
تہذیب کے خلاف آواز بلند کی۔'' (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۹۹۔۳۰۰)

ناول میں پریم چند نے کسانوں کو لوٹنے والوں پر کئی جگہ طنز کیا ہے اور کئی جگہ ان پر رحم دلی، سخاوت اور خودداری کی تعریفیں بھی کی ہیں۔ پریم چند کا خیال ہے کہ جاگیردارانہ طبقے میں سارے لوگ ظالم نہیں ہوتے بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بنیادی طور پر نیک ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں رائے صاحب ہوری سے کہتے ہیں:

''تم ہمیں بڑا آدمی سمجھتے ہو۔ ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن چھوٹے۔ ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن چھوٹے غریبوں میں اگر حسد و دُشمنی ہے تو سوارتھ کے لیے پیٹ کے لیے ایسی حسد اور دُشمنی کو میں معافی کے قابل سمجھتا ہوں ہمارے مُنہ کا لقمہ کوئی چھین لے تو اسکے حلق میں انگلی ڈال کر ہمارا دھرم ہو جاتا ہے.........مجھے تو یہی تعجب ہوتا ہے کیوں تمھاری آہوں کی آگ ہمیں بھسم کر ڈالتی۔ مگر نہیں، تعجب کی کوئی بات ہیں۔'' (گئو دان، ص۔۱۷)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند پہلا طنز نگار ہے جس نے سماجی معاشرے کی خامیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے چونکہ وہ زندگی بھر سماجی شعور سے ہم آہنگ رہے اس لیے ان کے یہاں ظرافت کم اور طنز زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہنس راج رہبر لکھتے ہیں:

'' ہمیں ان کے قہقہے بھی کہیں خاموشی سُنائی دیتے ہیں کہیں طنز کہیں حقارت کا اظہار کرتے ہیں اور کہیں وہ ریا کاری اور پاکھنڈ پر حملہ کر کے بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔''

(اُردو ناول میں طنز و مزاح، ص۔۳۰۸)

پریم چند نے دیہاتیوں کی نفسیات پر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کسان محنت کرتا ہے مگر پھل نہیں ملتا چند مجبوریوں کی وجہ سے تمام عمر زمینداروں ، پٹواریوں ، پنچائت اور پولیس وغیرہ کے چنگل میں پھنسا رہتا ہے ۔ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے لُوٹا اور تباہ ہو جاتا ہے ۔اس المیہ کو پریم چند نے طنز کے لیے ایک اقتباس کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔کس طرح ٹھاکر سیدھے سادے کسانوں کو دس روپے کی رسید دے کر پانچ روپے دیتا ہے اور باقی سُود میں کاٹ لیتا ہے ۔

''یہ تو پانچ روپے ہیں مالک

نہیں دس ہیں گھر جا کر گننا

نہیں سرکار پانچ ہیں

ایک روپیہ نذرانہ کا ہوا کہ نہیں

ہاں سرکار

ایک کاگد(کاغذ) کا

ہاں سرکار

ایک دستوری کا

ہاں سرکار

ایک سُود

ہاں سرکار

پانچ نقد دس ہوئے کہ نہیں

(گئودان،ص۔۲۷۷)

پریم چند نے ناول میں محاورات اور تشبیہات کا استعمال بڑے خوبصورت انداز میں پیش کر کے ناول کو دلچسپ اور مؤثر بنا دیا چند مثالیں پیش کرتی ہوں:

''ا۔شیر کا کام تو شکار کرتا ہے اگر وہ گرجنے اور غرانے کے بجائے میٹھی بولی بول سکتا تو اُسے گھر بیٹھے من چاہا شکار مل جاتا، شکار کی کھوج اسے جنگل میں نہ بھٹکنا پڑتا۔''

(گئودان،ص۔۱۵)

۲:اس نے مڑ کر دیکھا تو وہی کبری گائے دُم سے مکھیاں اڑاتی، سر ہلاتی مستانہ وار آہستہ آہستہ جھومتی چلی جاتی تھی، جیسے لونڈوں کے بیچ میں کوئی رانی ہو۔''

(گئودان،ص۔۱۴)

''۳:ہیرا غصے میں اسے مارتا تھا مگر چلتا تھا اسی کے اشاروں پر، اس گھوڑے کی طرح جو کبھی کبھی مالک کو لات مار کر بھی اس کی سواری میں چلتا ہے۔''

(گئودان،ص۔۳۷)

اس ناول میں پریم چند نے منظر نگاری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ناول میں پریم چند نے گاؤں کی فضا' دریاؤں کی روانی' موسموں کی کیفیات کو بیان کر کے قاری کو مناظر قدرت کی تصویر کشی کی ہے۔اگر پریم چند نے ایک طرف مناظر قدرت کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف قدرت کے غضب اور جلال کو ناول میں پیش کیا ہے ۔جس کی زندہ مثال یہ ہے:

باب سوم

پنجابی سے اُردو میں درآمد اہم ناول

١۔	سفید خون	نانک سنگھ
٢۔	پنجر	امرتا پریتم
٣۔	گوری	اجیت کور

۱۔ سفید خون

نانک سنگھ

سفید خون

(ناول)

تعارف:

ناول ''سفید خون''، یعنی ''چِٹا لہو'' پنجابی ناول ہے جو کہ پنجابی کے صف اوّل کے فکشن نگار نانک سنگھ کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس ناول کو نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی نے جہاں ملک کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کروایا ہے وہیں اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ پنجابی ناول ''چِٹا لہو'' کا اردو میں ترجمہ اردو کے معروف افسانہ نگار و ناول نگار رتن سنگھ نے کیا ہے۔

یہ ناول ستمبر ۱۹۷۱ء میں نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کی قیمت آٹھ روپے ہے اور یہ کتابی سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا پیش لفظ ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، بالکرشن کیسکر نے لکھا ہے۔ ناول ''چِٹا لہو'' کو پنجابی کے شاہکار ناول کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بالکرشن کیسکر رقم طراز ہیں:

> ''مغرب میں بھی بہت سی قومیں ہیں، ہر ایک کی اپنی الگ زبان ہے مگر وہ لوگ ایک دوسرے کے فکر و ادب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں حالات اس کے متضاد ہیں۔ کسی مغربی زبان میں کوئی اچھی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ فوراً دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں ہم، ایک قوم ہوتے ہوئے، یہ تک نہیں جانتے کہ پڑوس کی زبان میں کیا لکھا جا رہا ہے۔
>
> اِس صورتِ حال کے مدِّ نظر، حکومت نے ایک اسکیم بنائی ہے کہ ہر زبان سے موجودہ یا تقریباً موجودہ زمانے کی چُنندہ کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ کی جائیں، یہ

کتابیں عام دلچسپی کی ہوں گی......ایسی مقبول تصنیفات کو ترجمہ کیا جائے گا جو کسی

بھی لسانی علاقے کی طرزِ زندگی، سماجی و تہذیبی سرگرمیوں، جذباتی کیفیتوں اور

ارمانوں کی نقاب کُشائی کر سکے۔''

(ناول ''سفید خون''، پیش لفظ، صفحہ ۳)

اس ترجمے میں پنجابی ناول ''چٹا خون'' کے لئے اس کی پہلی اشاعت پر ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو لکھا گیا پرنسپل تیجا سنگھ کا ''دیباچہ'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ پرنسپل تیجا سنگھ نے پنجابی ناول کی رفتار وسمت پر روشنی ڈالتے ہوئے نانک سنگھ کی ناول نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے ''سفید خون'' کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ نانک سنگھ کے تحریر کردہ ناولوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے غالباً چالیس کے قریب ناول لکھے ہیں۔ ''چٹا لہوٗ'' ان کا شروعاتی دور کا ناول ہے۔ پرنسپل تیجا سنگھ نانک سنگھ کی ناول نگاری کے بارے رقم طراز ہیں:

''بھائی نانک سنگھ کے ناول بھی سماجک سدھار والے ہیں۔ اِنہوں نے اِس سے پہلے 'مٹھا موہرا'، 'پریم سنگیت'، 'کال چکّر' وغیرہ کئی ناول لکھے ہیں اور وہ پنجابی ادب کے قارئین میں اچھی طرح جانے پہچانے ہیں۔ لیکن جو کمال انھوں نے یہ ناول ''چٹّا لہوٗ'' (سفید خون) لکھنے میں دِکھایا ہے۔ وہ پہلے نہیں دِکھایا تھا۔ پہلے تو وہ معاشرے کی کوئی ایک دو خامیوں کو لے کر ہی ناول لکھتے تھے لیکن اس بار تو سارے کے سارے معاشرے کو مضبوط ہاتھ سے جھنجھوڑا ہے اور ہر طرف سے چوٹیں لگائی ہیں کہ اس ناول کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا جائے تو بڑے سدھار کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ جہالت، چھوت چھات، منشیات کا اِستعمال، بیاہ شادی سے متعلق بُری رسمیں، عورت ذات، خاص کر بیوہ پر ظلم، گوردواروں کی طرف سے لاپرواہی، بات بات پر جھگڑے، مقدمے بازی وغیرہ کی علّتیں اور بھیڑ چال، یہ سب اِس خوبصورتی

سے اس ناول میں گندھے ہیں کہ پڑھنے والے کے دِل پر بہت جلد اور گہرا اثر پڑتا
ہے۔''

(ناول ''سفید خون''، دیباچہ، صفحہ ۸۔۹)

کہانی:

نانک سنگھ نے اس ناول کو ۱۳۶ یکٹوں یعنی ابواب میں پیش کیا ہے۔ ناول کا آغاز ''ادھورا باب'' سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے لے کر ۳۴ ابواب پیش کئے گئے ہیں۔ باب ۳۴ کے بعد ''ادھورے باب کا باقی حصّہ'' ہے اور پھر باب نمبر ۳۵ پیش کیا گیا ہے۔

ناول ''سفید خون'' کی کہانی کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ''ادھورے باب'' سے ہوتا ہے جس میں گپ تیشور نام کا ایک ۱۸ سال کا سکھ نوجوان ناول نگار لاہور سے امرتسر بغیر ٹکٹ ریلوے میں سفر کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر وہ پکڑا جاتا ہے۔ پولیس والے اور ٹکٹ چیکر اس کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔ گپ تیشور اپنا نیا تحریر کردہ ناول ''چٹا لہو'' چھپوانے کی غرض سے لاہور گیا تھا۔ لیکن کسی بھی پبلیشر نے اسے مناسب دام نہیں دیئے اس لئے وہ ناول لے کر واپس آ گیا۔ گپ تیشور انتہائی غریب ہے اُس کے کپڑے پرانے اور میلے کچیلے ہیں۔ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہیں کہ وہ ناول لکھنے کے لئے نئے کاغذ خرید سکے۔ وہ ناول لکھنے کے لئے کاغذ کوڑے کے ڈھیروں سے لیتا ہے۔

''میں بازار میں چلا جا رہا تھا کہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر کچھ میلے کچیلے کاغذ دکھائی دیئے۔ شاید کسی سکول کے بچے نے ردی کی کاپی پھینک دی تھی۔ میں نے جب اُنہیں اُٹھا کر دیکھا تو سب کاغذ گیلے گیلے سے تھے۔ اُن کاغذوں کے ایک طرف

سکول کی تحریر تھی۔ دوسری طرف سے خالی تھے لیکن سیاہی کے پھیل جانے کی وجہ سے
وہ کافی رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سارے کاغذ اُٹھا لیے اور اپنی کوٹھری
میں جا کر آگ کی سینک سے اُنہیں سکھا لیا............اُن کاغذوں پر میں لگاتار چھ
سات گھنٹے لکھتا رہا۔ دوسرے دن میرے لکھنے کے لیے کوئی کاغذ نہیں بچا تھا۔

(ناول ''سفید خون''، صفحہ۱۶)

ریلوے کے اعلیٰ افسر کو نوجوان ناول نگار پر ترس آ جاتا ہے۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گیا اور کھانا کھلایا
۔لیکن جب افسر کو نوجوان ناول نگار کا نام پتہ چلا تو وہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ وہ گپ تیشور کے ناولوں کا دیوانہ تھا۔
افسر نے گپ تیشور سے ناول سنانے کو کہا اور اس نے ناول کے صفحات کو درست کرنا شروع کر دیا۔ گپ تیشور خود
اپنے اس ناول کے بارے میں کہتا ہے کہ

''ناول کا نام ہے سفید خون۔ اس میں جتنے بھی کرداروں کا ذکر آیا ہے، اُن میں سے
ایک دو کو چھوڑ کر سب کا لہو سفید ہی ظاہر کیا گیا ہے۔''

(ناول ''سفید خون''، صفحہ۱۸)

اس کے بعد گپ تیشور ریلوے کے بابو کو ناول سنانا شروع کر دیتا ہے۔

ناول ''سفید خون'' محبت، جنگ، نفرت اور انتقام پر مبنی ایک طویل کہانی ہے۔ گوردیئی کی ماں کا انتقال
ہو جاتا ہے اور اس کا شرابی باپ اس کی روپے لے کر ایک بوڑھے شاہوکار سے شادی کر دیتا ہے۔ جو کہ شادی
کے ایک سال بعد ہی مر جاتا ہے۔ شوہر کی موت کے بعد گوردیئی کے سوتیلے بچے اس کی جان کے دشمن بن جاتے
ہیں۔ وہ انصاف کے لیے گاؤں کے دھرماتما پنڈت رادھے کرشن کی چوکھٹ پر جاتی ہے۔ لیکن پنڈت رادھے
کرشن اس کی مدد کرنے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ ایک طرف وہ گوردیئی کے سوتیلے بچوں سے چاندی کے سکّے لے

کر پنچایت کو ان کے حق میں کر دیتا ہے دوسری طرف گوردیئی سے اس کے ہاتھوں میں پہنے سونے کے کنگن بھی لے لیتا ہے اور اس کو ایک تاراچند نام کے آدمی کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ جب تک گوردیئی پنڈت رادھا کرشن کی چال کو سمجھتی ہے اس وقت تک تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پنڈت رادھے کرشن ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ تھانیدار خواجہ سے اس کی دوستی ہے دونوں اکثر اکٹھے شراب پیتے ہیں۔ پرنسپل تیجا سنگھ، پنڈت رادھے کرشن کا خاکہ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

> ''پنڈت رادھے کرشن کی تصویر بہت ہی دانشمندی سے مضحکہ خیز بنائی گئی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں پر ایک بار ہے، کیونکہ وہ ان سے ہی کھاتا پیتا ہے۔ لوگوں کے سامنے چھوت چھات کا ماننے والا ہے لیکن اندر بیٹھ کر وہ مسلمانوں کی رکابی میں کھانے سے پرہیز نہیں کرتا۔ گاؤں میں جو بھی دھوکا دہی کا کام ہوتا ہے یا چوری چکاری کی نوبت آتی ہے، سب کام اس کے مشورے سے ہوتے ہیں پھر بھی وہ چودھری کا چودھری بنا رہتا ہے۔!'' (ناول ''سفید خون''، صفحہ ۱۰)

تاراچند کے ہمراہ وہ سیالکوٹ پہنچ جاتی ہے اور اپنا سب کچھ تاراچند کو سونپ دیتی ہے۔ تاراچند اسے جھوٹ بتاتا ہے کہ وہ ایک سرکاری دفتر میں تیس روپے مہینے کا کلرک تھا۔ اس کا اصل وطن گجراں والا ہے۔ لیکن اپنے باپ کی ناراضگی کی وجہ سے ابھی وہ گھر نہیں جا سکتا۔ ویسے اس کی لاکھوں کی جائیداد ہے۔ لیکن یہ جھوٹ زیادہ دن چھپ نہیں سکتا۔ کچھ مہینوں بعد ہی تاراچند کی پول کھل جاتی ہے۔ ایک دن اُس کی ماں کی چٹھی آتی ہے۔ تاراچند گھر میں نہیں تھا۔ گودیئی چٹھی کسی سے پڑھوا لیتی ہے۔ اس کی اصلیت سے واقف ہو جاتی ہے۔ تاراچند کی ماں لکھتی ہے۔

> ''میں محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتی ہوں اور تم جب سے گئے ہو مجھے ایک پیسہ

نہیں بھیجا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ تم، کسی کی عورت نکال کر لے آئے ہو۔ یہ باتیں
تمہارے لیے اچھی نہیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔‘‘

(ناول ’’سفید خون‘‘، صفحہ ۴۵)

گوردیئی اپنی قسمت کے آگے بے بس ہو جاتی ہے۔ صبر کرنے کے سوائے اب اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے لئے اب نہ سسرال میں جگہ ہے اور نہ ہی مائیکے میں۔ تاراچند کا بھی پونے سال میں اس سے اور اس کے جسم سے دل بھر جاتا ہے۔ گھر میں مار کٹائی اور بھوک مری چھا جاتی ہے۔ ایک دن تاراچند گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ ساتھ میں وہ گھر کا سارا سامان بھی لے جاتا ہے۔ گوردیئی کا بھوک پیاس سے بُرا حال ہو جاتا ہے اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر جاتی ہے۔

یہاں سے ناول کا ایک دم منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ بلکہ ناول نگار ایک نیا سین پیش کرتا ہے۔ گوردیئی کا آگے کیا ہوتا ہے؟ اس متعلق تشنگی برقرار رہتی ہے۔ ناول اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور ناول میں ایک نئے کردار روڈو بابے کی اینٹری ہوتی ہے۔

بابے روڈو نام کے مداری کو جھاڑیوں میں پڑی ایک بچی ملتی ہے۔ روڈو کو اُس ننھی جان پر رحم آ جاتا ہے اور وہ اُسے اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں لے آتا ہے۔ روڈو اُس بچی کا نام سندری رکھتا ہے۔ روڈو بندریا کا تماشہ کر کے روزی روٹی کماتا ہے۔ روڈو کے علاوہ اُس کی جھونپڑی میں ایک بندریا بھی رہتی ہے۔ جو روڈو کی طرح سندری سے بہت پیار کرتی ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور سندری بڑی ہوتی جاتی ہے۔ اِس طرح دس بارہ سال بیت جاتے ہیں۔ اس دوران سندری کچھ سمجھدار ہو جاتی ہے اور وہ روڈو سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔

سندری اس ناول کی ہیروئن ہے۔ اس کے مدمقابل ہیرو کے طور پر بچن سنگھ نام کا ایک لڑکا ہے جو خالصہ

کالج میں دسویں جماعت میں زیرِ تعلیم ہے۔ بچن سنگھ اپنے ملک کے متعلق بے پناہ عقیدت رکھتا ہے اور اس کی اسی وطن پرستی کو دیکھ کر اُس کا والد اُس کی پڑھائی چھڑا دیتا ہے تا کہ کہیں لڑکا آزادی کی لڑائی کا ایندھن نہ بن جائے اور گاؤں میں اپنے ساتھ کھیتی باڑی کے کام میں لگا لیتا ہے۔ بچن سنگھ، گیانی دیدار سنگھ سے بہت متاثر ہے۔ جو اُسے پڑھائی کے دوران امرتسر میں ملے تھے۔ بچن سنگھ کے والد جیوا سنگھ لگاتار بیمار رہنے لگ جاتے ہیں۔ اس لیے کھیتی باڑی کی ساری ذمہ داری بچن سنگھ پر آ جاتی ہے۔ بچن سنگھ بہت ملن سار، نیک اور مذہبی اقتدار کی پاسداری کرنے والا نوجوان ہے۔ وہ اپنے گاؤں کے گوردوارے کی حالت دیکھ کر بھائی جی سے بہت ناراض ہو جاتا ہے اور اُسے بہت ڈانٹتا ہے۔ پالا سنگھ اس گاؤں کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ اُس کے چیلے چانٹے اُسے بھگوان کی طرح پوجتے ہیں۔ بھائی جی، بچن سنگھ کی بدسلوکی کی شکایت پالا سنگھ سے کرتا ہے۔ پالا سنگھ کی بچن سنگھ کے والد جیوا سنگھ سے پرانی دشمنی ہے۔ بس پھر کیا تھا پالا سنگھ موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں سوچنے لگا رہتا ہے۔

پالا سنگھ اپنے ہمراہ گوردوارے میں آ کر اکثر شراب پیتا ہے۔ اُس دن گنڈا سنگھ کا داماد پرتاپ سنگھ پہلی بار اپنے سسرال کے گاؤں آیا تھا اور پالا سنگھ کے ہمراہ گوردوارے میں شراب پی لیتا ہے۔ لیکن شراب پینے کے بعد اس کی طبیعت بہت خراب ہو جاتی ہے۔ پالا سنگھ پہلے تو گھبرا جاتا ہے لیکن بعد میں وہ بڑی چالاکی سے گنڈا سنگھ کو زہر دینے کا الزام بچن سنگھ کے سر لگا دیتا ہے۔ پولیس بچن سنگھ اور بھائی جی کو گرفتار کر لیتی ہے۔ لیکن جب عدالت میں کیس چلا جاتا ہے تو بھائی جی اور گنڈا سنگھ کے داماد پرتاپ سنگھ کو جھوٹ کی بنیاد پر پکڑا گیا۔ سچ سامنے آ گیا اور عدالت نے یہ فیصلہ سنایا:

''بچن سنگھ بری.......... بھائی دسوندھا سنگھ کو غیر ذمہ داری سے ایک جان خطرے میں ڈالنے کے جرم میں ایک سال قید۔ پالا سنگھ کو جھوٹی رپورٹ درج کرانے کے

جرم میں دفعہ ۱۷۷ کے مطابق دوسال قید۔ باقی پانچوں کو جھوٹی گواہی دینے کے جرم

میں دفعہ ۱۹۳ کے مطابق چھ چھ مہینے قید۔‘‘

(ناول ’’سفید خون‘‘، صفحہ ۷۳)

بچن سنگھ نے گوردوارے کا کام سنبھال لیا اور گیانی دیدار سنگھ کو وہ اپنے گاؤں میں لے آیا اور گوردوارے کا انتظام ان کو سونپ دیا۔ پھر گاؤں کے انپڑھ، جاہل لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے گوردوارے میں اسکول کھولا گیا۔ سندری بھی اس اسکول میں پڑھنے لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بچن سنگھ اور سندری میں نزدیکیاں بڑھنے لگیں۔ دوسری طرف پالا سنگھ کی پارٹی کو سندری کا گورودوارے میں گاؤں کے لوگوں کو تعلیم دینا راس نہ آیا۔ کیونکہ انھوں نے گوردوارے کو نشے کا اڈّا بنایا ہوا تھا۔ اس طرح ڈیڑھ سال بیت گیا اور پالا سنگھ جیل سے رہا ہو کر گھر آ گیا اور گاؤں کا پُرسکون ماحول ایک دم سے گرما گیا۔ لیکن سندری اس عرصے میں سکھ دھرم کے اصول و ضوابط، ادب اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوگئی۔ بچن سنگھ کا اسکول بند ہو گیا۔ گیانی دیدار سنگھ اس نفرت بھرے ماحول سے گھبرا کر واپس چلے گئے۔

اس طرح پالا سنگھ اور اس کا غنڈا گروپ گوردوارے پر دوبارہ قابض ہو جاتا ہے۔ پھر گوروپرب کے دن گوردوارے میں ایک عالی شان پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سندری اب سکھ دھرم سے کافی متاثر ہو چکی تھی۔ وہ بھی گوروپرب کا پروگرام دیکھنا چاہتی ہے لیکن چھوٹی ذات کی ہونے کی وجہ سے وہ گوردوارے میں داخل ہونے سے ڈرتی ہے۔ وہ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے گوردوارے میں بھوسے والے کمرے میں چھپ جاتی ہے اور چھپ کر گوروپرب کا پروگرام دیکھنے لگتی ہے۔ لیکن بھوسے والے کمرے کا اچانک دروازہ کھل جاتا ہے اور سندری شری گوروگرنتھ صاحب کے حضور جہاں ماتھا ٹیکنے کی جگہ تھی وہاں جا گرتی ہے۔ پالا سنگھ کے غنڈے سندری کی اس خطا کو معاف نہیں کرتے اور مار مار کر اُس کا برا حال کر دیتے ہیں لیکن بچن سنگھ کو جب اس بات کا پتہ چلتا

ہے تو وہ سندری کی حمایت میں پالا سنگھ اور اس کے غنڈوں کے درمیان ٹکر ہو جاتی ہے۔

> ''اُس کا دھیان سندری کی طرف گیا۔ وہ ڈر گیا۔ شاید یہ بچ ہی نہ سکے۔ اس خیال سے اُس نے وہاں مزید رُکنا خطرناک سمجھا۔ آگے بڑھ کر اس نے سندری کو بازوؤں پر اُٹھا لیا اور یہ کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ ''ظالمو، بے رحمو! لو میں اِسے اپنے گھر لیے جاتا ہوں۔ جاؤ مجھے برادری سے الگ کر دو۔''
>
> (سفید خون، ص۱۹)

بچن سنگھ سندری کو اپنے گھر لے گیا۔ دوسری طرف پالا سنگھ نے بھی سندری کو حاصل کرنے کی ٹھان لی اور بابے روڈو کی بندری لچھو کو مار دیا۔ بچن سنگھ اور روڈو نے سندری کی جان کو خطرہ محسوس کیا اور اُسے گاؤں سے باہر پڑھنے بھیج دیا۔ سندری کو لاہور کے ایک کنیا آشرم میں داخلہ مل گیا۔ دوسری طرف پالا سنگھ سے بچن سنگھ نے اس کی محبوبہ سندری چھین لی۔ اس بات کا اس کو بہت دکھ تھا۔ سندری نے پورے تین سال اپنی پڑھائی جاری رکھی اور دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ دیوان پور واپس آ گئی۔ اس دوران بچن سنگھ اور سندری ایک دوسرے کو چٹھیاں لکھتے رہے اور اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس بیچ روڈو اللہ کو پیارا ہو گیا۔

بچن سنگھ جانتا تھا کہ لچھو بندریا اور روڈو مداری کی موت کے پیچھے پالا سنگھ کا ہاتھ ہے۔ اب اس کا تیسرا شکار سندری ہے۔ وہ سندری پر بری نظر رکھتا تھا اور اسے اپنی اندھی ہوس کا شکار بنانا چاہتا تھا۔ اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے بچن نے سندری کو دیوان پور کی بجائے روانی گاؤں میں استانی مقرر کروا دیا۔ جو دیوان پور سے زیادہ دور نہ تھا۔

بچن سنگھ پکا گُرسکھ تھا۔ وہ بے کار کے رسم و رواج اور سماجی اونچ نیچ کے خلاف تھا۔ جہاں بھی اُسے کوئی غلط رسم نظر آتی وہ اُس کی مخالفت کرتا تھا لالہ رلا رام کے گھر بارات آنے والی تھی۔ اس پروگرام میں دلی کی ایک

مشہور رنڈی کے مجرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لالہ رلا رام نے پورے گاؤں کو شادی کے ساتھ ساتھ مجرے میں شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ لیکن اپنے اصولوں کے مطابق بچن سنگھ نے اس مجرے کی غلط رسم کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے گاؤں کے ایک ایک فرد سے ذاتی طور پر مل کر اس مجرے میں نہ شامل ہونے کی گزارش کی ساتھ ہی لالہ رلا رام کو بھی سمجھایا کہ اس سے گاؤں کی عورتوں پر غلط اثرات مرتب ہوں گے لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ پالا سنگھ، بچن سنگھ کی مخالفت سے بہت غصّہ ہوا اور اُس نے بچن سنگھ کو مارنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اُس سے روز روز کی حسد برداشت نہیں ہوتی تھی۔

آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں اور دلی کی مشہور طوائف انور جان دیوان پور میں تشریف لے آئی۔ بس پھر کیا تھا رات بھر گاؤں میں خوب ناچ گانا ہوا۔ گاؤں کے عام لوگوں کے ہمراہ پنڈت رادھے کرشن اور کرم چند بھی مستی میں جھوم رہا تھا۔ بچن سنگھ ناکام ہو کر سندری کے پاس چلا گیا۔ اپنے دلبر کو مایوس دیکھ کر سندری سے رہا نہ گیا اور وہ طوائف انور جان کے پاس چلی گئی اور اُسے گاؤں سے جانے کے لئے کہنے لگی۔ لیکن انور جان کی بے پناہ ممتا نے سندری کے غصّے کو ٹھنڈا کر دیا۔ پھر انور جان نے سندری کو اپنی زندگی کی درد بھری کہانی سنائی تو سندری کے پاس کوئی جواب نہ رہا۔ لیکن جب انور جان اصلی نام گوردیئی نے سندری سے اس کے بارے میں پوچھا تو انور جان کو پتہ چل گیا کہ وہ سندری اس کی ہی بیٹی ہے جسے جھاڑیوں سے اٹھا کر بابے روڈو نے پرورش کی ہے۔ ماں بیٹی ایک دوسرے کو پا کر بے حد خوش ہوئیں لیکن ان کی خوشی جلد ہی غمی میں بدل گئی کہ لوگ کیا کہیں گے ۔انور جان سندری کی زندگی کو مزید مشکلات میں نہیں ڈالنا چاہتی اس لئے اس نے اس بات کو راز ہی رہنے دیا اور سندری بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

گھر جا کر سندری نے بچن سنگھ کو بتایا کہ آج کے بعد انور جان کبھی کہیں بھی مجرا نہیں کرے گی۔

دوسری طرف انور جان سندری کے جاتے ہی دیوان پور کے دو افراد کا قتل کر دیتی ہے جنھوں نے اس کی زندگی برباد کی تھی۔ پنڈت رادھے کشن اور کرم چند کا قتل انور جان (گوردیئی) نے اپنا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا۔ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد وہ خود کو بھی چاقو مار لیتی ہے اور جان بحق ہو جاتی ہے۔ پالا سنگھ نے موقعہ کو غنیمت جان کر ان تین قتلوں کا الزام بچن سنگھ کے نام لگا دیا۔ کیونکہ وہ اس مجرے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی بچن سنگھ ،سندری کے گھر سے جاتا ہے تو راستے میں پولیس والے اُسے گرفتار کر لیتے ہیں اور سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتے ہیں۔سندری کو جب بچن سنگھ کی گرفتاری کا پتہ چلتا ہے تو وہ گھبرا جاتی ہے اور بچن سنگھ کی رہائی کے لیے دن رات ایک کر دیتی ہے۔

عدالت میں بچن سنگھ کے خلاف کیس چلتا ہے۔کیس کے دوران سندری عدالت میں اپنی زندگی کی پوری کہانی سناتی ہے اور ساتھ ہی انور جان کے بارے میں بھی بتاتی ہے کہ یہ قتل انور جان نے کئے ہیں۔لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بچن سنگھ کو بری کروانے میں ناکام رہ جاتی ہے۔ بچن سنگھ کو عدالت کی طرف سے پھانسی کا حکم سنایا جاتا ہے۔اس طرح بے قصور بچن سنگھ گاؤں والوں کی جھوٹی گواہیوں کی وجہ سے پھانسی کے پھندے پر چڑھ جاتا ہے۔

سندری بے ہوشی کے عالم میں امرتسر سے دیوان پور لائی جاتی ہے۔ بچن سنگھ کی آخری خواہش کے مطابق اکثر سندری کو برا بھلا کہنے والی بچن سنگھ کی ماں سدا کور سندری کو اپنا لیتی ہے اور اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔اس طرح سندری اپنا سب کچھ کھو دیتی ہے۔

دوسری طرف پالا سنگھ سندری کو پانے کے لئے بے قرار تھا۔اس سے پہلے کہ پالا سنگھ سندری پر حملہ کرتا اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالتا وہ خود ہی پالا سنگھ پر وار کر دیتی ہے۔وہ اس کے اڈّے پر خود ہی چلی جاتی ہے۔

''جس کنوئیں پر بنے کمرے میں پالا سنگھ اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ رہا کرتا تھا وہ جگہ سُندری کی دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئی۔ کمرے کے پیچھے جہاں سے دیوار میں ایک بڑے سوراخ کے راستے اندر کا سب حال دیکھا تھا وہاں وہ چھپ کر بیٹھ گئی۔ اندر کڑوے تیل کا دیا جل رہا تھا جس کی روشنی میں سندری نے دیکھا۔ پالا سنگھ اور اس کے دونوں ساتھی شراب پیتے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے ۔ ویر سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔'' پالا سنگھ بولا۔ ''لیکن تم نے سچ مچ اُسے جیوا سنگھ کے گھر جاتے دیکھا تھا کہ ایسے ہی نشے میں بڑبڑا رہے ہو۔'' (سفید خون، ص ۱۷۸)

جب پالا سنگھ اور اس کے دو ساتھی نشے میں دھت ہو گئے تو سندری نے باہر سے دروازہ بند کر کے اُس جھونپڑی کو آگ لگا دی۔ پالا سنگھ اور اس کے ساتھی آگ میں جل کر مر گئے۔ سندری آگ لگانے کے بعد وہاں سے فرار نہیں ہوتی۔ بلکہ کھڑی پاگلوں کی طرح ہنستی رہی۔ آج اُس کے چہرے پر اس طرح کی بھیانک ہنسی تھی جس سے شاید موت بھی ڈر کر کانپ اُٹھے۔

سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔ لوگ فوراً آگ بجھانے کے لیے دوڑے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی چھت کی لکڑیاں جل کر نیچے گرنے لگیں۔

گاؤں والوں نے سندری کو پکڑنا چاہا لیکن وہ دریا کے پُل پر چڑھ گئی اور ان جملوں کو ادا کرتے ہوئے دریا میں کود گئی۔

''میں ہوں خونی، آؤ مجھے پکڑ لو۔ جس کی ہمت ہے۔ دو جانوں کے بدلے میں، میں تین جانیں لے کر جا رہی ہوں۔ میں نے کسی بے گناہ کی بددعائیں نہیں لیں۔ ان کو

مارا ہے جنھوں نے میرے سر کا تاج اتار کر پاؤں سے روند ڈالا تھا اور میرے
بوڑھے باپ کا لہو پیا تھا۔ یاد رکھو ظالمو۔ ایک ستی کے جیتے جی اُسے بیوہ بنانے والے
اس کے غصّے سے نہیں بچ سکتے۔ سارے گاؤں سے تو واہگورو ہی بدلہ لے گا جنھوں
نے جھوٹی گواہیاں دے کر میرے مالک کی جان لی اور میرے بوڑھے باپ کے
قاتلوں کو بچایا۔ ابھی تو اصل قاتلوں کو ہی ان کے کئے کی سزا ملی ہے۔ آؤ مجھے پکڑ
لو۔''   (سفید خون، ص۱۸۰)

سندری کو گاؤں کے لوگوں نے دریا میں چھلانگ مارتے دیکھا تھا لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ کیونکہ اس کی لاش کسی کو نہیں ملی۔ پولیس نے سندری کا حلیہ دے کر اشتہار شائع کئے، انعام مقرر کئے لیکن اس کا کچھ نہ پتہ چلا۔

خوش قسمتی سے سندری بچ جاتی ہے اور پولیس سے بچنے کے لئے اپنی شناخت ختم کر دیتی ہے اور لڑکوں والے کپڑے پہن کر اپنی شکل وصورت بدل لیتی ہے اور گپتیشور کے نام سے ناول لکھ کر اپنی ضروریات پوری کرتی رہتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گپتیشور کے ناول ادبی دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔

''گپتیشور کے صرف نام سے ہی لوگ واقف تھے۔ اُسے شکل سے کوئی نہیں پہچانتا
تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں، صرف دو سالوں میں ہی، وہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔
ناشر اور ایڈیٹر خاص طور پر اُسے دیکھنا چاہتے تھے لیکن کوشش کرنے کے
باوجود اُسے ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔ گپتیشور کا ہر چھپنے والا مضمون انھیں ڈاک کے
ذریعے ہی ملتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوتا تھا کہ اس کا معاوضہ جو بھی مناسب ہو
فلاں پتے پر بھیج دیا جائے۔

اس لیے جتنا کسی کا دل چاہتا تھا، اس کا معاوضہ سدا کور بیوہ سردار جیوہ سنگھ، موضع دیوان پور ضلع امرتسر کے پتے پر بھیج دیتا تھا۔ کئی بار لوگوں نے اس پتے پر چھٹیاں لکھ لکھ کر گپتیشور کی تلاش کی لیکن وہاں سارے گاؤں میں گپتیشور نام کے کسی آدمی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ جس عورت کے پاس روپے جاتے تھے۔ اس سے بھی تسلّی بخش جواب انھیں نہیں ملتا تھا، جس سے گپتیشور کا پتہ چل سکے۔''

(ناول ''سفید خون''، ص۱۸۲)

گپتیشور سے ناول سنتے ہوئے بابو شام داس روتے رہتے ہیں اور گپتیشور سے اس ناول کی کہانی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے یہ حقیقی کہانی ہے اور اُسے خود سندری نے مرنے سے ایک دن پہلے سنائی تھی ۔سندری کو اب صرف اپنے باپ تاراچند کی تلاش ہے جسے وہ پچھلے ڈھائی سال سے تلاش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں وہ بابو شام داس سے مدد کی گزارش کرتی ہے۔ اب تک بابو شام داس کو یہ نہیں پتہ چلتا کہ یہ گپتیشور لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہے۔ لیکن تاراچند کا نام سُن کر اُس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے کیونکہ وہ خود ہی تاراچند ہے اُس نے اپنی پرانی شناخت کو ختم کرنے کے لیے تاراچند کی جگہ اپنا نام شام داس رکھ لیا ہے۔ لیکن اب کی بار شام داس جھوٹ نہیں بولا اور کہتا ہے اور گپتیشور سے تاراچند کو ملانے کا دعوہ کرتا ہے اور سوا بارہ بجے کی گاڑی سے شام داس لاہور چلا جاتا ہے۔ اگلے دن شام کو سات بجے تاراچند شام داس کے گھر آتا ہے۔

''تاراچند نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا اور شاید آنکھیں خراب ہونے یا کسی اور وجہ سے دھوپ والا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ سر کی پگڑی اس نے بڑے بے ڈھب سے باندھی ہوئی تھی اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھا رکھا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ سردی سے وہ بہت ڈرتا ہے۔''

(ناول ''سفید خون''، ص۱۹۲)

گپتیشوریعنی سندری اب صرف تاراچند سے بدلا لینے کے لئے جی رہی ہے۔لیکن جب وہ (گپتیشور)
تاراچندکو مارنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو تاراچند کی پگڑی اُتر جاتی ہے اور شام داس کا چہرہ دیکھ کر سندری
حیران رہ جاتی ہے۔گپتیشور چیخ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔لیکن پھر وہ اپنے باپ سے لپٹ جاتی ہے۔سندری یہ کہتے
ہوئے تاراچندکومعاف کردیتی ہے۔

''پتا جی .....میرا فرض پورا ہوگیا۔ ماں نے جسے مارنے کا کام میرے سپرد کیا تھا وہ
میرے مارنے سے پہلے ہی مر چکا ہے۔اُس کی بُری عادتیں، اُس کے گناہ ایک
ایک کر کے مر چکے ہیں اور اب اس کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جسے کسی
عظیم انسان کی زندگی کہا جاسکتا ہے۔''   (ناول ''سفید خون''، ص۱۹۵)

تاراچند سے ملاقات کے ساتھ ہی سندری کی زندگی کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ اگلے دن گپتیشوریعنی
سندری خودکو مارکر اپنی زندگی ختم کر لیتی ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب بچن سنگھ کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔
اس طرح اس ناول کا اختتام ہوجاتا ہے۔

کردارنگاری:

نانک سنگھ نے اس ناول کوتخلیق کرنے کے لئے جہاں سندری اور بچن سنگھ کوناول کے ہیرو ہیروئن کے
طور پر پیش کیا ہے وہیں پالاسنگھ جیسا بدمعاش بھی اہم لیڈر کے طور پر سامنے آتا ہے۔گوردیئی اورانور جان ایک
ہی عورت کے دو روپ ہیں اور دونوں عورتوں کا ناول میں بہت اہم رول ہے۔ مداری بابا روڈو بھی اس ناول کا
ایک اہم کردار ہے۔ناول کوتخلیق کرنے کے لیے اہم کرداروں کے علاوہ ضمنی کردار بھی ناول کو پیش کرنے میں اہم

رول ادا کرتے ہیں۔اس ناول کے کرداروں کا نہایت مختصر تعارف کچھ یوں ہے:

گوردیئی	:	بیس سال کی ایک نوجوان لڑکی
انور جان	:	گوردیئی نے اپنا نام بدل کرانور جان رکھ لیا اور طوائف کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔
سندری	:	۱۸سال کی ایک لڑکی۔بچن سنگھ کی محبوبہ
گپتیشور	:	سندری لڑکوں والے کپڑے پہن کر گپتشور کے نام سے رہنے لگتی ہے اور بطور ناول نگار کے طور پر شہرت حاصل کرتی ہے۔
بچن سنگھ	:	۲۰ سال کا ایک نوجوان لڑکا۔سندری کا محبوب
پالا سنگھ	:	ایک نمبر کا بدمعاش۔سندری پر غلط نظر رکھنے والا
دسوندھا سنگھ	:	(بھائی جی) گوردوارے کا پاٹھی اور ناول کا مزاحیہ کردار
رادھے کشن	:	پچاس سال کا پنڈت،ایک نمبر کا ٹھگ اور بے ایمان
تاراچند	:	گوریئی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے والا۔تیس سال کا آدمی
شام داس	:	تاراچند اپنا نام بدل کر شام داس رکھ لیتا ہے اور ریلوے میں بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔
گیانی دیدار سنگھ	:	ادھیڑ عمر نیک سیرت بزرگ
جیوا سنگھ	:	بچن سنگھ کے والد
سدا کور	:	بچن سنگھ کی والدہ
انسپکٹر خواجہ	:	شرابی اور بے ایمان پولیس انسپکٹر،

لالہ رلارام : گاؤں کا امیر جاگیردار

کرم چند : گوردیئی کے بوڑھے شوہر کا بڑا بیٹا،

نانک سنگھ کو کردار نگاری میں کمال حاصل ہے۔ انہوں نے سماج کے ہر طبقے سے کردار چُنے ہیں اور ان کو ہو بہو پیش کر دیا ہے۔ ان کے کردار اپنی زمینی حقیقتوں سے جڑے ہیں۔ حالانکہ ناول کو تشکیل دینے میں بے شمار کرداروں کو لیا گیا ہے لیکن کہیں بھی کردار پیش کاری میں مغالطہ نہیں پڑتے بلکہ ہر کردار کو اپنی جگہ پر نہایت سلیقے سے فٹ کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کردار کو بغیر نام کے پیش کیا گیا ہے حالانکہ اس کے بعد اس کا نام بتا دیا جاتا ہے۔ اس سے قاری کو کچھ مشکل ضرور درپیش آتی ہے۔

تنقیدی جائزہ:

ناول ''سفید خون'' ایک سماجی قسم کا ناول ہے۔ جس میں انسانی رشتوں کی پامالی کچھ اس طریقے سے پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے والا بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آج کے انسان کا خون واقعی سفید ہو گیا ہے۔ باپ پیسے کے بدلے میں بیٹی بیچ دیتا ہے اور بوڑھا ساہوکار اپنی بیٹی سے کم عمر کی لڑکی خرید کر شادی کر لیتا ہے اور پھر ایک سال کے اندر ہی مر جاتا ہے جس سے ایک لڑکی کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ گاؤں کا پنڈت اس لڑکی کے سارے زیورات لے کر بھی اس کی مدد نہیں کرتا بلکہ اس کو مزید آگے بیچ دیتا ہے، گاؤں کا مسلمان پولیس انسپکٹر پنڈت کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہے۔ لڑکی کا اگلا خریدار اس کے جسم میں اپنا پاپ ٹپکا کر بھاگ جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ناجائز اولاد جھاڑیوں میں پھینک کر عورت کو مزید کوٹھے پر بیچ دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس ناول میں عورت کی بدترین حالت پیش کی گئی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سماج کی عورت بے حد لاچار ہے اس کو بار بار بیچا جا سکتا ہے، اُس کا

جنسی استحصال کیا جاسکتا ہے۔ ناول نگار نے عورت کو اپنی تقدیر بدلنے کا فارمولہ بتایا ہے جس سے اس کی رہائی اور آزادی ممکن ہے۔ وہ فارمولہ ہے بدلہ اور بغاوت۔ بدلہ مطلبی اور عیاش مرد سے، بغاوت مذہب کی ڈور سے بندھے سماج سے۔ یہی اس کی نجات کا واحد اور آخری راستہ ہے۔ اس ناول کے نسوانی کردار انور جان (گوردیئی) اور سندری ان کا معاشی و جنسی استحصال کرنے والوں کو موت کے گھات اتار کر آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔

سماج کو مذہب کے نام پر بانٹنے والے مذہبی پیشوا اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے ایسے عمل کرتے ہیں۔ انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے افسران بکاؤ مال ہیں۔ گاؤں کے گوردوارہ نشے کا اڈا ہے۔ لوگوں کا اچھے کاموں میں دل نہیں لگتا اور بڑے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول ''سفید خون'' میں مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کی بدحالی پر چوٹ کی گئی ہے۔ بقول پرنسپل تیجا سنگھ:

> ''لیکن جو کمال انھوں نے یہ ناول ''چٹا لہو (سفید خون)'' لکھنے میں دِکھایا ہے وہ پہلے نہیں دِکھایا تھا۔ پہلے تو وہ معاشرے کی کوئی ایک دو خامیوں کو لے کر ہی ناول لکھتے تھے۔ لیکن اس بار تو سارے کے سارے معاشرے کو مضبوط ہاتھ سے جھنجھوڑا ہے اور ہر طرف سے وہ چوٹیں لگائی ہیں کہ اس ناول کو ملک کے کونے کونے تک پہنچا یا جائے تو بڑے سدھار کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ جہالت، چھوت چھات، منشیات کا استعمال، بیاہ شادی سے متعلق بُری رسمیں، عورت ذات، خاص کر بیوہ پر ظلم، گوردواروں کی طرف سے لاپرواہی۔ بات بات پر جھگڑے، مقدمے بازی وغیرہ کی علّتیں اور بھیڑ چال، یہ سب اِس خوبصورتی سے اس ناول میں گندھے ہیں کہ پڑھنے والے کے دِل پر بہت جلد اور گہرا اثر پڑتا ہے۔

(ناول ''سفید خون''، ص۱۰)

ناول کا منظر نامہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ سماجی برائیوں کے خلاف لڑنے والا بچن سنگھ حضرت عیسیٰؑ کی طرح پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لیکن انور جان اصلی نام گوردیئی پنڈت رادھے کرشن اور کرم چند کو مار کر اور سندری پالا سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں کو زندہ جلا کر اپنے دور کے راونوں کا خاتمہ کر کے امر ہو جاتی ہیں۔

ناول ''سفید خون کی کہانی کو اگر موجودہ دور کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ناول کی کہانی نہایت گھسی پٹی ہے یعنی کہ اس موضوع پر بے شمار پنجابی اور ہندی فلمیں بن چکی ہیں۔ اس ضمن میں پنجابی فلم 'بدلا جٹی دا' قابل ذکر ہے جبکہ ہندی میں اس موضوع پر بے شمار فلموں کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر اس ناول کو ۱۹۲۰ء کے زمانے میں دیکھا جائے جس زمانے میں یہ ناول تخلیق ہوا تھا تو ہمیں اس ناول کی انفرادیت پر بالکل بھی شک نہیں ہوگا۔ جس دور میں ''چٹا خون'' لکھا گیا اُس زمانے میں پنجابی ناول کا دائرہ مذہبی ہیروؤں کے کارناموں تک محدود تک رکھا گیا بلکہ نانک سنگھ نے پنجابی ناول کو اپنے ناولوں کے ذریعے نئے موضوعات سے آشنا کروایا ہے۔

رتن سنگھ نے اس ناول کو بڑی محنت سے پنجابی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ ناول پنجابی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ناول کی زبان نہایت سلیس اور آسان ہے۔ البتہ کہیں کہیں پنجابی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان پنجابی الفاظ کا ناول کی کہانی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی قاری کو یہ الفاظ بوجھل محسوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ روز مرہ کی زبان میں بولے جاتے ہیں۔ نانک سنگھ کو منظر نگاری پر بے پناہ قدرت حاصل ہے وہ جگہ جگہ ہمیں دیہاتی ماحول کی سیر کراتے ہیں۔

المختصر ناول ''سفید خون'' کے مطالعے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ ناول پنجابی

ادب کے ابتدائی دور کے ناولوں کا ایک اہم ترین ناول ہے۔ جو ناول نگاری کے فنی تقاضوں پر کھرا اُترتا ہے۔

☆☆☆

۲۔ پنجر

امرتا پریتم

"پنجر"

(ناول)

تعارف:

''پنجر'' پنجابی ناول ہے جو کہ پنجابی کی صف اوّل کی قلم کار امرتا پریتم کا تحریر کردہ ہے۔ امرتا پریتم کا شمار اردو کے عظیم قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ موصوفہ نے بطور شاعر، کہانی کار، ناول نگار اور صحافی کے طور پر پنجابی ادب میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔

ناول ''پنجر'' ۱۹۵۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ ناول ''پنجر'' کو دنیائے ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے دنیا بھر کی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ خشونت سنگھ، فرانسیسی میں ڈینی ماترنگ اور اردو میں مختلف قلم کاروں نے کیا ہے۔

2003ء میں ناول ''پنجر'' کو لے کر ہندی فلم ''پنجر'' بنائی گئی۔ جس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ فلم ادبی و فلمی دنیا میں چرچے کا موضوع بنی۔ اس فلم میں اہم کردار ارملا ماتونڈکر، منوج باجپائی اور سنجے سوری وغیرہ نے ادا کئے۔ پنجر ہٹ ہوئی اور اس فلم نے ہندوستان میں 5,24,00,000 کروڑ روپے اور ہندوستان سے باہر 6,14,50,000 کروڑ کمائے۔ اس فلم کو اس سال کی بہترین فیچر فلم کا ایوارڈ بھی ملا۔

اردو میں پنجر ناول کو کئی قلم کاروں نے ترجمہ کیا ہے اسی وجہ سے یہ واضح نہیں ہو پایا کہ اصل ترجمہ کار کون ہے یا پہلے کس نے ترجمہ کیا ہے۔ بہر حال سر دست ترجمہ کردہ ناول ''پنجر'' پر ترجمہ نگار کا نام درج نہیں ہے۔ ناول ''پنجر'' 23x36/16 سائز کی کتاب ہے جو کہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ امرتا پریتم نے اس ناول کو ۱۶ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس ناول کا انتساب ''افضل توصیف'' کے نام کیا گیا ہے۔ یہ ناول سیمانت پرکاشن نئی دہلی کا شائع کردہ ہے۔ جو کہ ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ جس پر قیمت ایک سو ساٹھ روپے درج ہے۔

پنجر سماجی قسم کا ناول ہے۔ جو کہ مشترکہ پنجاب کے ہندو، مسلم اور سکھ سماج کی کہانی ہے۔ یعنی اس ناول میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دنوں کے واقعات اور ۱۹۴۷ء کی خونی داستان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول ''پنجر'' ہندو اور مسلمان پریوار کی پرانی دشمنی پر مبنی ہے۔ جس میں مرد سماج کی دشمنی میں دونوں طرف عورت کا شکار ہوتا ہے۔ ناول کے آغاز میں مندرجہ ذیل جملے اس ناول کی کہانی کو بیان کرتے ہیں:

> ''ایک بے بس عورت کی کہانی...........امریتا پریتم کی زبانی........عورت جو انتقام کا شکار ہوئی، جو اپنے بطن کے بیٹے کو ماں کا پیار نہ دے سکی، جو تاعمر اپنے گھر، اپنے کنبے اور اپنے منگیتر کو نہ بھلا سکی۔ جس نے تقسیم کی خوں ریزی میں خود کو خطرے میں ڈالا اور دوسری عورتوں کی عصمت وعفت کی حفاظت کی لیکن خود.........موقع ملنے پر بھی اپنے بیٹے کی خاطر واپس نہ جا سکی اپنے کنبہ میں، اپنے عزت کے گہوارے میں.......'' (ناول ''پنجر''، صفحہ ۵)

ناول کا تانا بانا ضلع گجرات (موجودہ مغربی پنجاب، پاکستان) کے دیہاتوں چھتووانی، سیام، رتووال اور سکڑیالے کے کھیتوں اور کھلیانوں کے ارد گرد بُنا گیا ہے۔ آیئے اس ناول کی ورق گردانی کرتے ہیں۔

تنقیدی جائزہ:

ناول ''پنجر'' کا مرکزی کردار ایک ہندو لڑکی پارو ہے۔ پارو ضلع گجرات کے چھتووانی گاؤں کے ساہوکاروں کی لڑکی تھی۔ جس کا رشتہ قریب کے گاؤں رتو وال کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں طے ہوا تھا۔ امرتا پریتم نے پارو کا حلیہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

''پندرہواں سال لگتے ہی پارو کے انگ انگ میں ہل چل مچ گئی۔ پچھلے سال کی سب قمیصیں اسے تنگ ہوگئی تھیں۔ قریب کی منڈی سے پارو نے پھولوں والی چھینٹ کی نئی قمیصیں سلوائیں۔ اوڑھنیوں کو بہت سا ابرق لگایا۔ پارو کی سہیلیوں نے اس کے منگیتر رام چند کو اسے دور سے دکھلا دیا تھا۔ پارو کی آنکھوں میں اس کی صورت بس گئی تھی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پارو کا منھ لال ہو جاتا تھا۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ۱۰)

پارو گھر سے بہت کم نکلتی تھی۔ لیکن دن ڈھلے پارو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومنے آیا کرتی تھی۔ لیکن اس دوران گاؤں کا بائیس چوبیس سال کا مسلمان لڑکا رشید اس کا پیچھا کرتا ہے۔ جس سے پارو بُری طرح ڈر جاتی ہے۔

''پارو کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ پارو پر جوانی بھی جھوم کر آئی ہے اس کے گورے چہرے پر نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔'' (ناول ''پنجر''، صفحہ۱۴)

پھر ایک شام پارو اپنی چھوٹی بہن کے ہمراہ کھیتوں سے سبزی لینے جاتی ہے کہ رشید اس کو اپنی گھوڑی پر زبردستی اغوا کر کے لے جاتا ہے اور پارو بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو ایک انجان گھر میں قید پاتی ہے۔ پارو، رشید کی بہت منّتیں کرتی ہے لیکن رشید اس کو کسی بھی حالت میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ پارو کو چھوتا تک نہیں۔ پھر ایک دن اس سے رشید کہتا ہے:

''صبح نہا دھو کر تیار ہو جانا۔ مولوی آ کر ہمارا نکاح پڑھا دے گا۔''

پارو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بدبختی جواب تک نہیں ہوئی وہ ہو کر رہے گی، اس دن پارو پھر رشید کے پاؤں پر گر پڑی۔

(ناول ''پنجر''، صفحہ ۱۹)

اور روتے ہوئے رشید سے سوال کرتی ہے:

''تجھے اپنے اللہ کی قسم ہے، رشید! مجھے سچ سچ بتا کہ تو نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' (ناول ''پنجر''، صفحہ ۲۰)

رشید پارو سے کہتا ہے کہ تم نے اب اس سب سے کیا لینا ہے۔ لیکن پارو کے بار بار اصرار کرنے پر رشید اس کو اغوا کرنے کی وجہ بتاتا ہے:

''پارو ہمارے شیخ گھرانے میں اور تمہارے ساہوکار گھرانے میں ہمارے دادے کے وقت سے ایک بیر چلا آ رہا ہے۔ تیرے دادے نے پانچ سو میں گروی رکھے ہوئے ہمارے مکان پر سود در سود لگایا تھا۔ پھر قرقی کروا کے ہمارے گھرانے کو بے گھر کیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ اس کے منشی اور کارندے نے ہمارے گھر کی عورتوں کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ اور میرے دادے کی بڑی بیٹی کو تیرے دادے کے بڑے بیٹے نے زبردستی تین راتوں تک اپنے گھر میں رکھا تھا۔ تیرے دادے کی آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا۔ لیکن اس وقت شیخ گھرانا گنّے کی طرح نچڑا ہوا تھا۔ سب خون کے آنسو پی کے رہ گئے۔ میرے دادے نے میرے باپ چاچا اور تاؤ کو قرآن اٹھوا کر قسمیں دی تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ اس سے اگلی نسل تک بات دب کر رہ گئی۔ اب جب تیری شادی اسی گاؤں میں ہونے لگی۔ میرے چاچے اور تاؤ کے دل میں پرانا انتقامی جذبہ جاگ اٹھا۔ انہوں نے مجھے قسمیں دیں اور میرے خون میں جوش پیدا کر دیا۔ مجھ سے قول کیا کہ ساہوکار کی بیٹی کو شادی سے پہلے کسی دن بھی اٹھا کر لے جاؤں گا۔'' رشید چپ ہو گیا۔ پارو صبر سے اپنی ہونی کی کہانی سنتی

رہی۔ (ناول ''پنجر''، صفحہ۲۰)

رشید مزید کہتا ہے کہ پارو پہلے دن سے جب سے تجھے دیکھا ہے مجھے تم سے عشق ہو گیا تھا۔لیکن اب مجھ سے تیرا دُکھ نہیں دیکھا جاتا۔ پھر ایک رات پارو، رشید کی قید سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔لیکن اس کے والدین سماج کے ڈر سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ پارو اپنی ماں سے چمٹ کر روتی رہتی ہے۔ پارو کا باپ دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہے:

''بیٹی تیری قسمت ، اب ہمارے بس میں کچھ نہیں۔'' پارو کو اپنے باپ کی آواز آئی۔ پارو اپنی ماں سے چمٹی رہی ۔''ابھی شیخ گھرانے کے آدمی آجائیں گے تو ہمارے کنبے کو ختم کر دیں گے۔''

''مجھے ساتھ لے کر سیام چلے چلو، پارو نے ماں کی چھاتی سے منھ ہٹا کر پورے زور سے کہا۔

''ہم تمہیں کہاں رکھیں گے،اب تجھ سے کون شادی کرے گا، تیرا دھرم گیا اور تیرا جنم گیا۔اگر ہم ذرا بھی آواز نکالیں تو یہاں ہمارے خون سے ایک قطرے کا پتہ بھی نہ چلے گا۔''

''تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔'' پارو نے تڑپ کر کہا۔

''بیٹی تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے،اب یہاں سے چلی جا۔ابھی شیخ آتے ہوں گے۔تیرے باپ اور بھائی کا کہیں بھی نشان نہیں ملے گا۔'' ماں نے پتہ نہیں کیسا پتھر دل پر رکھ کر کہا۔ (ناول ''پنجر''، صفحہ۲۴۔۲۵)

پارو اٹھ کر چل پڑی۔ اُسے نہ ماں نے روکا اور نہ ہی باپ نے۔ آتے وقت پارو زندگی سے ملنے کے

لئے آرہی تھی۔اس میں زندہ رہنے کی چاہت تھی۔لیکن جاتے وقت وہ صرف ایک پنجر تھی۔جس کے دل میں نہ کوئی خوف تھا نہ کوئی چاہت۔ پارو، واپس آ کر چپ چاپ رشید سے شادی کر لیتی ہے۔رشید اس کا نام پارو سے بدل کر حمیدہ رکھ دیتا ہے۔اس کا نیا نام اس کے بازو پر گودوا دیا جاتا ہے۔ پھر ایک دن رشید نے بتایا کہ تمھارے والدین خیریت سے سیام چلے گئے ہیں۔ پارو اب حمیدہ بن گئی تھی۔لیکن اب بھی رات کو سوتے ہوئے اس کی سہیلیاں ملتی ہیں۔

''وہ سپنوں میں ماں باپ کے گھر کھیلتی کودتی، سب ہی اسے پارو پکارتے تھے۔ پارو دن کی روشنی میں حمیدہ بن جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں پارو ہوتی تھی۔لیکن وہ سوچتی تھی کہ وہ اصل میں حمیدہ ہے نہ پارو.......وہ صرف ایک ڈھانچہ ہے۔جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ کوئی نام ہے۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ ۲۷)

چھتووانی کا نام لیتے ہی پارو کو چکر آتے تھے۔رشید بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔اور چھتووانی میں پارو کو لے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ رشید کے دل میں ہلکا سا ڈر تھا کہ کہیں اردگرد کے ہندو اس پر حملہ نہ کر دیں۔حالانکہ اس واقعے کو ایک مہینہ ہو گیا تھا۔کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی تھی۔رشید کی کوئی بہن یا ماں بھی تو زندہ نہیں تھی۔ بھائی تھے، چاچے تھے۔رشید نے پارو سے کہا کہ وہ اس کو کوسوں دور ایک گاؤں سکڑیالے میں ایک رشتے دار رحیم بھائی کے ہاں لے جائے گا۔ پارو نے خود کو زندگی کے حوالے کر دیا تھا۔ماں باپ کے گھر سے دھکیلی گئی پارو کا اب اس گاؤں میں رکھا بھی کیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے پارو، رشید کے بچے کی ماں بن گئی۔ بچے کا نام جاوید رکھا گیا۔

پارو نے حالات سے سمجھوتہ تو کر لیا تھا۔لیکن وہ اپنے ساتھ ہوئے ظلم کو کبھی فراموش نہ کر پائی۔ وہ اس

آگ میں برابر جلتی رہتی۔ کئی بار اس کو اپنے بیٹے جاوید سے بھی نفرت ہو جاتی تھی۔

''بچہ پارو کا دودھ پیتا رہا۔ پھر پارو کو محسوس ہوا کہ یہ بچہ زبردستی اس کی نسوں میں سے اس کے دودھ کو کھینچ رہا ہے.......زبردستی......زبردستی......بچے کے باپ نے بھی تو اس سے زبردستی کی تھی۔ بچہ بھی تو اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کا خون تھا۔ اپنے باپ کا گوشت تھا۔ اپنے باپ کا روپ تھا۔ زبردستی یہ بچہ اس کے جسم میں رکھا گیا تھا۔ زبردستی اس بچے نے اس کے پیٹ میں پرورش پائی تھی۔ اب زبردستی یہ بچہ اس کی نسوں میں سے دودھ کھینچ رہا ہے۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ ۳۴)

ناول ''پنجر'' کی بنیاد مذہبی دشمنی پر ٹکی ہے۔ جس کا شکار دونوں طرف کی عورتیں ہوتی ہیں۔ پارو اس ناول میں انسانیت کو سبق دیتی نظر آتی ہے۔ وہ انسانیت کی سچی خیر خواہ اور ہمدرد ہے۔ پارو ہر روز صبح صبح کھیتوں میں جاتی۔ اس کے بیٹے جاوید کو رشید سنبھالتا ہے۔ ایک صبح اس نے دس بارہ سال کی پتلی اور کمزور کمّو کو گاگر کے بوجھ تلے دبے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ پارو عرف حمیدہ مسلمان تھی اور کمّو ہندو اس لئے وہ پارو کے گاگر کو ہاتھ لگانے سے ڈرتی ہے۔ لیکن پارو اپنی محبت سے اس لڑکی کو مذہب کی اندھی کوٹھری سے باہر نکال لیتی ہے اور کمّو ، پارو کی گرویدہ بن جاتی ہے۔ پارو کمّو کو ماں کی طرح پیار دیتی ہے۔ اس کو نئی جوتی دیتی ہے۔ ساتھ میں طاقتور غذا کھلاتی ہے۔ لیکن کمّو کی چاچی، پارو سے نفرت کرتی ہے اور کمّو سے پارو کے بارے میں کہتی ہے:

چاچی کہتی ہے کہ ''وہ تو بھاگ کر آئی ہے، تو بھی اسی طرح بھاگ جائے گی۔'' کمّو نے رونا روک کر کہا۔ سویرے کا اُجالا نکھرا جا رہا تھا۔ پارو روئی کی ٹوٹی ہوئی پندیا کی طرح ہو گئی۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ ۳۹)

پارو مسلسل اداس رہتی اور چپ چاپ گھر کے کام کاج کرتی رہتی تھی۔ پارو کا دن بدن سوختہ ہوا چہرہ رشید سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ایک رات سوتے سوتے رشید کا جسم گرم ہو گیا۔صبح جب پارو نے اس کا ماتھا چھوا، تو رشید کو بہت تیز بخار تھا۔گاؤں کے حکیم نے اسے دوا دی۔لیکن تین دن تک رشید کا بخار نہیں اُترا۔حکیم کو شک ہوا کہ رشید کو میعادی بخار ہے۔ پارو کا یہاں ایک نیا روپ نظر آتا ہے۔ وہ رشید کا اس پر کیا ظلم بھول کر اس کی سیوا میں لگ جاتی ہے۔ پارو، رشید کو وقت پر دوا دیتی ہے، اس کے جسم کو دباتی ہے۔ وہ رشید کی بیماری میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے جاوید کو بھی بھول جاتی ہے۔ پارو کا یہ روپ رشید کو نڈھال کر دیتا ہے۔ وہ اپنے کیئے پر بہت پچھتاتا ہے۔

کئی راتیں گزر گئیں۔لیکن رشید کا بخار نہ اترا۔

''پارو میرا گناہ بخش دے..... پارو میرا قصور معاف کردے۔پارو .... پارو........'' رشید بخار کی بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔

(ناول ''پنجر''، صفحہ۴۱)

رشید کو اگر کچھ ہو گیا تو۔ یہ سوچ کر پارو گھبرا گئی۔ پارو کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری دنیا میں اکیلی ہے ۔رشید کے بعد کون اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہ سوچتے ہی وہ گھڑے کے ٹھنڈے پانی میں کپڑا بھگو کر رشید کے ماتھے پر رکھتی ہے۔رشید کا ماتھا چولھے کی طرح تپ رہا تھا۔کٹورے کا پانی تھوڑی ہی دیر میں گرم ہو گیا۔ پارو نے پانی بدلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رشید کے ماتھے پر پڑتے رہے۔صبح تک پانی کی ٹھنڈک سے یا آنسوؤں کی نمی سے رشید کا بخار کم ہو گیا تھا۔

رشید کی بیماری نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ پارو کی کشش رشید کے تئیں بڑھ گئی تھی۔ پھر رشید نے کبھی پارو سے غلط سلوک بھی نہیں کیا تھا۔ پارو کا دل بھی چاہنے لگا کہ کسی دن وہ سچ مچ ہی بھول

جائے کہ رشید نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ وہ رشید کو بہت پیار کرے۔ رشید اس کا خاوند تھا۔ رشید اس کے بچے کا باپ تھا۔ بس ایک یہی سچ تھا باقی سب جھوٹ تھا۔

اس کے بعد ناول میں ایک نیا کردار پگلی اینٹر ہوتا ہے اور پارو کی بے لوث شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ پگلی ایک پاگل عورت ہے۔ بقول امرتا پریتم:

> ''پگلی نے پنڈلیوں تک اونچی شلوار پہنی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے اوپر والے حصے پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ رنگ اس کا دھوپ سے جھلسا ہوا تھا یا یونہی کالا تھا۔ اس کے سر پر بال لٹیں بن گئے تھے۔'' (ناول ''پنجر''، صفحہ ۴۴)

چند ہی دنوں میں گاؤں کی عورتوں کو پگلی کا بڑھا ہوا پیٹ نظر آتا ہے۔ گاؤں کی تمام عورتیں اس شرمناک فعل پر مرد ذات پر لعنت بھیجتی ہیں اور خود شرمندہ سی ہو جاتی ہیں۔ پارو اپنا آپا کھو دیتی ہے:

> ''وہ کیسا مرد ہوگا۔ وہ کیسا وحشی ہوگا جس نے ایسی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا سب عورتیں پھٹکار بھیجتی تھیں۔ سب کا دل خون کے آنسو روتا، پگلی جو حسین تھی نہ جوان تھی۔ جو گوشت کا بے ہوش لوتھڑا تھی۔ ہڈیوں کا ایک لڑکھڑاتا ڈھانچہ تھی۔ مردوں نے اسے بھی نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔ پارو یہی سوچ سوچ کر غم و غصے کی آگ میں جلنے لگتی۔'' (ناول ''پنجر''، صفحہ ۴۵)

پھر ایک صبح پارو کو پگلی ایک درخت تلے پڑی نظر آتی ہے۔ قریب جا کر پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک لڑکے کو جنم دیتے ہوئے مر چکی ہے۔ پارو اس بچے کو گود لے لیتی ہے۔ اس کا اپنا بیٹا جاوید دو سال کا ہو چکا ہے جس نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہے۔ پارو کا دودھ خشک ہے لیکن وہ کسی کے کہنے پر سفید زیرہ کھاتی ہے تو قدرت اس کی محبت سے متاثر ہو کر سفید زیرے کے بہانے اس کی چھاتیوں میں دودھ اُتار دیتی ہے۔ اس طرح پارو ایثار و محبت کی پاک مورت

بن کرا بھرتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس ناول کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کی نفرت پر رکھی گئی ہے۔ اس نفرت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ گاؤں میں پگلی کے بچے کو لے کر ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے ہندوؤں میں یہ بات زور پکڑتی ہے کہ پگلی تو ہندو تھی اس لئے اس کا بچہ بھی ہندو ہی ہوا۔ اس لئے پگلی کے بچے کی پرورش ہندو ہی کریں گے۔ اس بچے کا مسلمان کے گھر میں پلنا ہندوؤں کی توہین ہے۔ پارو اور رشید بے بس ہو جاتے ہیں۔ ان سے بچہ چھین کر ایک ہندو عورت جھیوری کو دے دیا جاتا ہے۔ لیکن بچہ ماں کا دودھ نہ ملنے کی وجہ سے چند ہی دنوں میں مرجھا جاتا ہے۔ آخر کار بے ہوش ادھ مرا بچہ دوبارہ پارو کو دے دیا جاتا ہے۔ پارو بچے کو پا کر کھل اُٹھتی ہے اور پھر چند ہی دنوں میں بچہ دوبارہ صحت مند ہو جاتا ہے۔

رشید کے رشتے دار رحیم بھائی کی ماں کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ رتو وال میں ایک باؤلی ہے۔ باؤلی کی مٹی اور باؤلی کا پانی آنکھوں سے لگانے سے لوگ مرادیں پاتے ہیں۔ وہ پارو کو اپنے ساتھ چلنے کو کہتی ہے۔ پارو، رتو وال سنتے ہی گم صم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رتو وال میں ہی پارو کی شادی رام چند سے ہونے والی تھی۔ پارو کے دل میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ وہ رام چندر سے زندگی میں ایک بار ضرور ملے۔ پارو بزرگ خاتون کے ساتھ رتو وال جاتی ہے اور رام چند سے ملنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ رام چند اس کو پہچان لیتا ہے لیکن وہ چپ رہتی ہے۔

> ''جو تو پارو ہے مجھے ایک بار بتا جا۔'' رام چند نے پارو کے پیچھے تیز قدم سے چل کر کہا۔ ''میں ساری رات کھیتوں میں رہا ہوں، میرا دل کہہ رہا تھا کہ تو پھر آئے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ تو پارو ہے۔''
>
> ''پارو کب کی مرگئی ہے۔'' جانے کس طرح پارو کے منھ سے یہ بات نکلی۔ پارو نے

پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آگے ہی آگے چلی گئی۔ (ناول ''پنجر''، صفحہ ٦٦)

پھر ایک دن رشید کو یہ خبر ملتی ہے کہ چھتو والی میں کسی نے اس کے کھیتوں کو آگ لگا دی ہے۔ گاؤں والے بتاتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکے نے یہ کام کیا ہے جو شاید پارو کا بھائی تھا۔ پارو کو اپنے شوہر کے نقصان کا دکھ تو ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ خوشی بھی ہوتی ہے کہ کسی نے تو اس کا بدلہ لیا اُسے یاد کیا۔

''پارو اس لمحے لگی ہوئی آگ کا دکھ بھول گئی۔ جلی ہوئی گندم کی راکھ میں سے بھائی بہن کا پیار اُبھر آیا۔'' (ناول ''پنجر''، صفحہ ٦٩)

یہاں سے ناول ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ ملک میں آزادی کا اعلان ہوتے ہی پنجاب فسادات کی آگ میں جھلس جاتا ہے۔ ہر طرف افراتفری پھیل جاتی ہے۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھر جاتی ہیں۔ پاکستان کے علاقے سے ہندو اور سکھ اور ہندوستان کے علاقے سے مسلمان ہجرت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ہجرت میں دونوں دھرم کے لوگ ایک دوسری کی بہو، بیٹیاں اٹھا لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔ پارو اس افراتفری کے ماحول میں ایک مسیحا کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ رشید باقی کے مسلمانوں سے الگ پارو کا پورا ساتھ دیتا ہے۔ پارو اپنے گنے کے کھیتوں سے ایک ہندو لڑکی کو بچا کر اپنے گھر لگاتی ہے۔ پارو کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس دنیا میں بیٹی پیدا کرنا حرام ہے۔

اسی دوران پارو کے گھر کے آگے سے ہجرت کرنے والا ایک قافلہ گزرتا ہے۔ جو رتووال کی طرف سے آرہا ہے۔ پارو کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس میں رام چندر بھی ہوگا۔ وہ سودا سلف بیچنے کے بہانے اس قافلے میں چلی جاتی ہے اور رام چند کو ڈھونڈ لیتی ہے اور رام چند بھی پارو کو پہچان جاتا ہے کہ یہی پارو ہے جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ رام چند پارو کو بتاتا ہے:

''تیرے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے چپ چاپ ایک رات تیری چھوٹی بہن

کے ساتھ میرے پھیرے کرادیئے اور تیرے بھائی کے ساتھ میری بہن کے
پھیرے ہوئے۔ اس وقت سے وہ گاؤں واپس نہیں آئے۔ آج کل بھی سیام میں
رہتے ہیں۔'' (ناول ''پنجر''، صفحہ۷۷)

پارورام چند سے اپنی بہن کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ پچھلے دنوں تیرا بھائی آیا تھا ہمارے گھر۔ میری بہن کو چھوڑ گیا اور اپنی بہن کو لے گیا۔ یہ کہہ کر رام چند روتے ہوئے بتاتا ہے کہ اب اس قافلے سے اچانک اس کی بہن غائب ہوگئی ہے۔ لاجو اس کا نام ہے۔ پاروا پنے دماغ پر بوجھ ڈالتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ رام چند ہاں میں جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے بازو پر اس کا نام گدا ہوا ہے۔ پارو رام چند سے اس کا نیا پتہ لیتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کی بہن اور اپنی بھابی لاجو کو تلاش کر کے ہی دم لے گی۔ پارو گھر آ کر سارا قصّہ رشید کو بتاتی ہے اور اس کے پاؤں پر پڑ جاتی ہے:

''جیسے بھی ہو سکے مجھ پر کرم کر.....میں نے ساری عمر تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ لاجو کا
پتہ لگا دے جیسے بھی ہو سکے۔'' پارو کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوتے تھے۔ رشید
نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ۸۰)

رشید، پارو سے کہتا ہے کہ ضرور لاجو کا اغوا رتو وال میں ہی ہوا ہوگا۔ وہ کئی دن وہاں جا کر پتہ کرتا ہے ۔اسے پتہ چلتا ہے کہ کئی لڑکیوں کا اغوا ہوا ہے لیکن اب وہ کہاں ہیں کسی کو نہیں پتہ تھا۔ رشید اور لاجو اپنے بچوں سمیت رتو وال آ جاتے ہیں ۔ پارو، لاجو کی تلاش میں دریاں کھیس بیچنے والی کا روپ دھار کر گھر گھر کی خاک چھانتی ہے آخر ایک گھر میں لاجو کا سراغ مل جاتا ہے۔ یہ گھر بھی رام چند کا ہی ہے جس پر ایک مسلمان پریوار نے قبضہ کرلیا ہے اور انھوں نے لاجو کو زبردستی قید کر رکھا ہے۔ پارو لاجو کو اس گھر سے نکالنے کے لئے ایک ترکیب

بناتی ہے۔ جسے رشید نے انجام دینا ہے:

''اب تو جان اور تیرا کام.....'' پارو نے رشید کو ساری بات بتا کر کہا۔

''کوئی ایسا طریقہ ہو.............'' رشید سوچنے لگا۔

''جیسے مجھے گھوڑی پر اٹھا لایا تھا، اب بھی ہمت کر..........'' پارو نے رشید کو ٹھوکا دیا

اور ہنس پڑی۔ (ناول ''پنجر''، صفحہ۸۴)

پارو کی ترکیب رنگ لاتی ہے اور رشید آدھی رات کو لاجو کو گھوڑی پر اٹھا لاتا ہے۔ اس طرح رشید اپنے گناہ کا ازالہ کرتا ہے جو اُس نے پارو کو اٹھا کر کیا تھا۔ رشید دل کا برا نہیں تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اُس کا پارو کے ساتھ کوئی لینا دینا تھا جو وہ راہ چلتے کسی کی شریف بہن بیٹی کو زبردستی اپنے گھر اٹھا لایا۔ پارو سے شادی کرنے کے بعد رشید نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی بہن بیٹی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ پارو بھی آہستہ آہستہ رشید کو معاف کر دیتی ہے۔ وہ لاجو سے کہتی ہے:

''رشید کی پیٹھ پیچھے کی بات ہے، کہ اس نے پہلا گناہ تو کیا سو کیا۔ پھر اس نے مجھے کوئی بری بھلی نہیں کہی، وہ اگر میری مدد نہ کرتا تو میں تجھے کیسے ڈھونڈ کر لا سکتی تھی۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ۱۰۴)

آخر کار پارو اور رشید لاجو کو اس کے بھائی رام چند اور اس کے شوہر تک پہنچا دیتے ہیں۔ پارو کا بھائی چاہتا تھا کہ پارو بھی ان کے ساتھ چلے لیکن پارو نے پیچھے ہٹ کر رشید کے پاس جا کر اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ناول کا اختتام پارو کے ان بے مثال جملوں سے ہوتا ہے:

''چاہے کوئی ہندو لڑکی ہو، چاہے مسلمان، جو بھی لڑکی ٹھکانے پر واپس پہنچ رہی ہے، سمجھو کہ اسی کے ساتھ پارو کی روح بھی ٹھکانے پر پہنچ رہی ہے، پارو نے دل ہی دل

میں کہا اور دونوں آنکھیں جھکا کر رام چند کو آخری پرنام کیا۔''

(ناول ''پنجر'' صفحہ۱۱۲)

ناول ''پنجر'' پنجابی کا ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب کا ایک لافانی شاہکار ہے۔ اسی طرح پارو کا کردار بھی لافانی ہے۔ پارو کو ناول نگار نے امن کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناول کی پوری فضا پر نفرت کی چادر پڑی ہوئی ہے۔ لوگ مذہب کی دیواروں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں پارو انسانیت کی سچی خیر خواہ بن کر سامنے آتی ہے۔ پارو کے اثر میں رشید بھی انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار پارو ہے۔ معاون کرداروں میں رشید، رام چند، لاجو اور جاوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس ناول کے کرداروں کی مکمل فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ پارو (بعد میں حمیدہ)

۲۔ رشید

۳۔ رام چند

۴۔ لاجو

۵۔ ترلوک

۶۔ رجو

۷۔ تارہ (پارو کی ماں)

۸۔ موہن لال (پارو کا باپ)

۹۔ شیام لال (رام چند کا باپ)

۱۰۔ پگلی

۱۱۔ جاوید

۱۲۔ کمّو

ناول ''پنجر'' پارو کے اردگرد گھومتا ہے۔ پارو نے اس ناول میں بیٹی، بہن اور بہو کے سبھی روپ ادا کیئے ہیں۔ پارو تہذیب یافتہ، ذہین، محنتی، وفادار، ہمدرد، خدا ترس اور معاف کرنی والی ہے۔ جب رشید اس کو اغوا کر کے لے جاتا ہے تو وہ اسے گالیاں نہیں دیتی بلکہ التجا کرتی ہے کہ اسے چھوڑ دے۔ پارو زندگی جینے کا ہنر جانتی ہے۔ وہ ہر حال میں جی سکتی ہے۔ اس کے ماں باپ اور سسرال والے اس کو ٹھکرا دیتے ہیں تو پارو مایوس ضرور ہو جاتی ہے لیکن زندگی کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اس کے برعکس پارو اس کا بدلہ اپنے ماں باپ کی بہو اور سسرال والوں کی بیٹی ڈھونڈ کر لاتی ہے۔ پارو پرواہ کرنے والی ہے۔ جب رشید کو کئی دن مسلسل بخار رہتا ہے تو وہ اس کی دن رات سیوا کرتی ہے کیونکہ اب وہ اس کا شوہر ہے اس کے بچے کا باپ ہے۔ اب رشید کے سوا اس دنیا میں اس کا کون ہے؟ وہ خدا سے دعا بھی کرتی ہے کہ اس کا دل رشید کو معاف کر دے۔ پارو کا دل بہت نرم ہے۔ وہ ننھی کمّو کو سر پر گاگرا اٹھائے دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور اس کی مدد کرتی ہے۔ کمّو کو وہ اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتی ہے۔ اسی طرح پگلی کے لاوارث بچے کو پارو اپنا دودھ پلا کر بڑا کرتی ہے۔ فسادات کے دنوں میں وہ ایک ہندو لڑکی کو بچا کر ہندوستان بھیجتی ہے۔ پارو بہت نڈر ہے وہ رام چند کی بہن لاجو کو بچانے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال دیتی ہے۔ ناول میں آخر میں جب پارو کو اس کا بھائی ہندوستان چلنے کے لئے کہتا ہے تو پارو رشید اور اپنے بیٹے جاوید کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ رشید کو معاف کر دیتی ہے۔

رشید پارو کے بعد اس ناول کا دوسرا اہم کردار ہے۔ رشید پہلی نظر میں ہی پارو پر فدا ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی فیملی کے کہنے پر اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ لیکن وہ اس سے مزید کوئی گستاخی نہیں کرتا۔ وہ پارو کو اپنے گھر سے

بھاگنے کا موقع بھی دیتا ہے۔لیکن پاروکواس کے گھر والے ٹھکرا دیتے ہیں۔رشیداس سے باقاعدہ نکاح کرلیتا ہے اور پاروکی ہرطرح سے حفاظت کرتا ہے۔اس کو دنیا کی ہرخوشی دینے کی کوشش کرتا ہے۔رشیدکواپنے کئے پر بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔وہ پارو سے معافی مانگتا ہے۔وہ پاروکو بے پناہ چاہتا ہےاس کی خاطراپنی جان جوکھم میں ڈال کر لاجوکو بچا کرلاتا ہے۔

رام چند، پاروکا منگیتر ہے۔ پارو کے اغوا ہونے کے بعد وہ اس کی خبر تک نہیں لیتا۔ پاروکورام چند سے اس بات کا شکوہ ہے۔اسی وجہ سے وہ اس سے ملنا چاہتی ہےلیکن جب رام چند سے وہ ملتی ہےتو پارو کچھ بول نہیں پاتی اوررام چنداس کو پہچان لیتا ہے۔رام چند کی بہن لاجو گم ہو جاتی ہے۔فسادات کے وقت دوبارہ رام چند ، پارو سے ملتا ہےاوراپنی بہن لاجوکوڈھونڈنے کی اس سے گزارش کرتا ہے۔ پارورام چند سے کچھ نہیں کہتی وہ اپنا رام چند کے تئیں غصّہ بھول جاتی ہے۔

امرتا پریتم نے اس ناول کے منظرنامے کومکالموں کے ذریعہ ابھارا ہے۔اس ناول کے مکالمے چھوٹے اوراثر دار ہیں۔ناول کے مکالموں میں پنجاب اور پنجابیت کی خوشبوبسی ہے۔کردار جب بولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ زندہ جاوید ہیں۔ ناول نگاراختصار کی قائل نظر آتی ہے بلا وجہ کی منظرنگاری سے اس کو پرہیز ہے۔اس ناول کاایک اوراہم وصف جزیات نگاری ہے۔کیونکہ اس ناول کی کہانی نہایت مختصر ہے۔اس کوطویل کرنے کے لئے امرتانے جزیات کا سہارالیا ہے۔یعنی ناول میں ایک واقعہ کے بعد دوسراواقعہ سلسلہ وارنمودار ہوتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ پنجابی ناول ہےلیکن اس کا ترجمہ بہت اچھے ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔کئی جگہ پنجابی الفاظ نظرآتے ہیں جوناول کی زبان کواور بھی دلکش بنارہے ہیں۔مثلاً دادے، پوتے، چاچے،تائے، برات اور داتن جیسے الفاظ اس طرح استعمال کئے ہیں کہ پڑھنے والے کوکوئی مشکل پیش نہیں آتی۔اس کے علاوہ ناول میں جگہ جگہ

پنجابی بولیاں اور پنجابی گیت بھی شامل کئے گئے ہیں۔ مثلاً پارو کی ماں اس کی شادی کے بارے میں سوچ کر غمگین ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے ہیں۔

لادیں تے لادیں کلیجے نال مائیے

(کلیجے سے لگالے اے ماں)

دسیں کے دسیں اک بات نی

(اور اک بات بتا)

باتاں تے لمیاں نی دھیاں کیوں جمیاں نی

(باتیں تو لمبی ہیں بیٹیاں کیوں پیدا کیں)

پارو کی ماں اپنے گھر میں بدھو ماتا کی پوجا کرتی ہے تاکہ اس کے آنگن میں تین بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہو۔ اس موقع پر گاؤں کی کچھ عورتوں نے گھر کے صحن میں گوبر کی گڑیا بنائی۔ کناری لگا کر سرخ اوڑھنی گڑیا کو پہنائی۔ دو ماشے سونے کی نتھ بنوا کر گڑیا کی ناک میں ڈال دی اور سب عورتیں مل کر گانے لگ جاتی ہیں۔

بدھ ماتا رُسّی آویں تے منّی جاویں

(بدھو ماتا روٹھ کے آنا اور خوش ہو کر جانا)

ترکھلاں دی دھاڑ آئی

(تین لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوا)

اسی طرح پارو جب اپنے منگیتر کے گاؤں رتو وال جاتی ہے تو بیٹھے بیٹھے پارو کو بھولا ہوا ایک پنجابی گیت یاد آ جاتا ہے۔

جہے آئے تھے ٹُر چلے (جیسے آئے ویسے ہی چلے گئے)

ساڈے آیاں دی قدر نہیں (ہمارے آنے کی قدر بھی نہیں)

ہائے ربّا ! ساڈے آیاں وا صبر یوئی (ہائے خدا! ہمارے آنے کا صبر پڑے)

امرتا پریتم نے اس مختصر سے ناول میں جہاں مشترکہ پنجاب کے مذہبی تناؤ بھرے ماحول کو پیش کیا ہے وہیں جگہ جگہ پنجاب کے دیہاتی کلچر کی عکاسی بھی کی ہے۔ناول نگار نے پنجاب کے سب سے اہم تہوار بیساکھی کی تفصیلی تصویر کشی کی ہے۔

''جب صبح پارو سو کر اٹھی تو گاؤں میں بیساکھی کے ڈھول بج رہے تھے۔ پہلے تو وہ کام کاج میں لگی رہی۔ پھر چھت پر چڑھ کر دور میدان میں لگے ہوئے بیساکھی کے میلے کو دیکھنے لگی۔ دور کھڑی ہوئی پارو کو صرف لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ لمبے تڑنگے توانا کسان کوری کوری تہمدیں باندھے ہوئے اور ہاتھوں میں تیل سے چمکائی ہوئی لاٹھیاں لئے ہوئے بڑے جوش وخروش میں ادھر آتے اور اپنے آگے ایک دو بچے بھی۔ کئی ایک بچوں کو انگلی پکڑائے ہوئے اور عورتوں کو پیچھے پیچھے لئے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کئی جوان اپنی جوانی کے جوش میں چھاتی کو ابھارے ہوئے چلے جا رہے تھے۔، کچھ گاتے جاتے تھے۔ کچھ باتیں کرتے جاتے تھے۔ دور میدان میں دنگل ہو رہا ہوگا جلیبیوں کے تھال رکھے ہوئے ہوں گے۔ گرم گرم پکوڑوں کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ گڑ اور شکر پارے، میدے کی مٹھائیاں اور مٹھائیاں ڈھیر کے ڈھیر لوہے کے بڑے بڑے تھالوں میں سجی ہوں گی۔''

(ناول ''پنجر''، صفحہ ۳۰)

جوان کسانوں کی ایک ٹولی کانوں میں پھول لگائے ہوئے، ہنستے گاتے ہوئے پاس سے گزر رہی تھی۔

ایک کسان یہ پنجابی لوک گیت گا رہا تھا۔

کھوہ تے بیٹھی داتن کردی چٹیاں منداں دی ماری

(کنوئیں پر بیٹھی داتن کر رہی ہے تا کہ دانت سفید ہو جائیں)

نی آپے تینوں لے جان گے

(اری تجھے خود لے جائیں گے)

جنہاں نوں لگیں گی پیاری

(جن کو تو پیاری ہوگی)

اسی طرح بھنگڑا (ناچ) ڈالتے ہوئے کسان خوشی میں یہ بولیاں گا رہے تھے:

تیرے لونگ دا پیا لشکارا (تیرے لونگ کی چمک پڑی)

ہالیاں نوں ہل بھل گئے (ہل والے اپنے ہل بھول گئے)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول ''پنجر'' ایک بے نظیر پنجابی ناول ہے۔ جس میں ایک بہترین ناول کے سبھی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس ناول کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں حقیقت نگاری اور انسانی زندگی سے جڑے مسائل کو دردمندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امرتا پریتم نے اس ناول کے ذریعے دنیا بھر کے مذاہب پر چوٹ کی ہے جو اغوا کی ہوئی بے قصور لڑکی سے ہمدردی کرنے کے بجائے اسے ٹھکرا دیتے ہیں، لیکن ۱۹۴۷ء کی خونی ہولی میں اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو ان لوگوں نے اپنایا جن کے دل و دماغ میں غرور و گھمنڈ تھا۔ بقول پارو:

''پارو کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ اس کے لئے ساری دنیا کے دھرم، اس کے راستے

میں کانٹے بن کر بچھ گئے تھے۔اس کے ماں باپ اس کو واپس نہیں لیتے تھے۔اس کے سسرال والے اسے واپس نہیں لیتے تھے۔آج سب مذہبوں کے غرور ٹوٹ گئے ہیں۔"

(ناول "پنجر"، صفحہ۸۵)

☆☆☆

۳۔ گوری

اجیت کور

گوری

(ناول)

اجیت کور شاعرہ، ناول نگار، کہانی کار اور سوانح نگار کے طور پر پنجابی ادب میں جانی پہچانی جاتی ہے۔آزادی کے بعد پنجابی ادب میں متعارف ہوئی اس قلم کار نے آج اپنی الگ شناخت بنالی ہے۔اجیت کور پنجابی ادب کی ایک منفرد آواز ہے۔ جو اپنی بے باکی، بولڈ پن، حقیقت نگاری اور اپنے منفرد موضوعات کی

وجہ سے ہمیشہ چرچا کا موضوع بنی رہی ہیں۔اجیت کور کا اصل میدان کہانی ہےلیکن ناول نگار اور سوانح نگاری میں بھی دور دور تک ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔انہوں نے عورت مرد کے رشتے کو بڑی بے باکی اور گہرائی سے پیش کیا ہےاور انسانی زندگی کا حقیقت پسندی سے مطالعہ کیا ہے۔بقول ساتھی لدھیانوی:

''اتے انسانی جیون دیاں بھاوناواں،عورتوں،مرداں دے رشتے دی خوبصورتی تے جذباتی ٹکراں نوں،تنہائی دی اداسی نوں، انسانی رشتیاں دیاں الجھناں نوں، پنجاب دے سنتاپ نوں بڑی دلیری نال بیان کیتا ہے۔''

(www.wikipedia)

اجیت کور کی سوچ کا دائرہ پنجاب تک ہی محدود نہیں بلکہ پنجاب کے علاوہ انہوں نے دلی،اندور اور ملک بھر کے غریب طبقے کے لوگوں کے استحصال اور مشکلات کو نہایت صاف گوئی سے پیش کیا ہے۔اسی طرح موصوفہ نے نہ صرف عورت پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے بلکہ سماجی،معاشی اور سیاسی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے نیز ہندوستان کے سیاسی ایوانوں میں ہو رہی کرپشن ،دورحاضر میں نوجوان نسل کی خمیر میں پھیلتا زہر،رشتوں کی پامالی،صنفِ نازک کا جبری استحصال،سیاسی زیادتیاں،لال فیتا شاہی جیسے واقعات کو اپنے قلم کی نوک پر لایا گیا ہےاور بے باکی سے ان پر کھل کر لکھا ہے۔بلاشبہ اجیت کور پنجابی ادب میں بالکل منفرد انداز کی قلم کار ہیں۔دُھپّ والا شہر،پوسٹ مارٹم،گوری،کٹیاں لکیراں اور ٹٹے ترکون جیسے لازوال ناول لکھ کر اجیت کور نے پنجابی ادب میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔لیکن جو شہرت ان کے ناول گوری کو حاصل ہوئی ہے وہ ان کے دوسرے ناولوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

ناول گوری۔تعارف و کہانی:

ناول ''گوری'' اجیت کور نے ۱۹۹۱ء میں قلم بند کیا۔ یہ ناول پنجابی ادب کا ایک انمول رتن ہے۔ جو دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ معروف نقاد پروفیسر خالد محمود نے کیا ہے۔ جو ۲۰۰۱ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول ۱۱۲صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت ۱۵۰ روپے رکھی گئی ہے۔ اجیت کور نے اس ناول کو ۶۷ مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اس ناول کی کہانی بڑودہ اور نرمدا ندی کے درمیان اُجاڑ سنسان علاقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے نہایت ہی غریب پریوار سے تعلق رکھتی ہے۔ ناول نگار نے اس گاؤں کا جغرافیہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

''بڑودہ اور نرمدا ندی کے درمیان اُجاڑ سنسان علاقہ میں ایک چھوٹا سا گانو تھا۔ ریتیلا علاقہ۔ دور دور تک پھیلے ریت کے ٹیلے، نرم نہیں سخت راجستھان کی ریت کے ٹیلوں کی طرح نہ ڈھیتے نہ تپتے۔ نیچے سخت زمین اور اوپر ریت ہی ریت، پتھریلی سی بھوری ریت۔'' (ناول ''گوری''، صفحہ ۱۰)

اس ناول کی کہانی کا تانا بانا ایک لڑکی گوری کے ارد گرد گھومتا ہے۔ گوری کے دادا کا نام رام اوتار ہے۔ دادی کا نام کسی کو معلوم نہیں یعنی یہ ایسا سماج ہے جہاں پر عورت کے اصل نام سے کسی کو کوئی مطلب نہیں۔ گوری کی دادی کو ''گردھر کی مائی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی گوری کی ماں کو اس کی بڑی بہن ''رمیّا کی مائی'' کہتے ہیں۔ گوری گردھر اور رمیّا کی مائی کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ گوری اپنی مائی کا اصل نام نہیں جانتی۔ ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے اس گھر کی عورتوں کا کردار یوں پیش کیا ہے۔

''ویسے اس گھر میں عورتوں کو بلانے کا نہ رواج تھا اور نہ ہی کوئی ضرورت۔ مرد گھر آجاتے تو عورتیں خواہ ماں ہوں خواہ بیوی، خود ہی انھیں پینے کے لئے پانی دیتیں، چوڑی پتّل میں چاول ڈال کر اور ساتھ ہی نمک مرچ کی ڈھری رکھ کر سامنے پروس

دیتیں۔ کپڑے بدلنے ہوں تو دُھلے کپڑے لاکر رکھ دیتیں۔ پلنگ بچھا دیتیں۔ مرد
بیمار ہو جاتے تو دبا دیتیں، تلوؤں میں تیل مل دیتیں اور رات میں جب بھی وہ تقاضا
کرے خود کو اس کے سپرد کر دیتیں سب خاموشی سے۔''

(ناول ''گوری''، صفحہ۱۲)

گوری سے بڑی اس کی دو بہنیں رمیّا اور منجھلی ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کی تیسری بیٹی ہے۔ جو بلاضرورت پیدا ہوئی ہے کیونکہ اس کے ماں باپ کو بیٹی نہیں بیٹا چاہتے تھے۔اس لئے اس کے والدین اس سے نفرت کرتے ہیں۔ گوری کے گھر کے سبھی افراد اس کی ماں سے بیٹیاں پیدا ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔اس کا باپ اکثر اس کی ماں کو چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔

ان کے علاوہ اس گھر میں گوری کا ایک چچا رمیش اور چچی دھنیا بھی رہتے ہیں۔جن کی شادی کو ہوئے سات سال ہو گئے ہیں لیکن ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ گوری کو اپنے چچا رمیش کی بھی دھندلی سی یاد ہے۔ وہ کہیں دور شہر میں کپڑے کی مل میں کام کرتا ہے اور گوری کے لئے ''لوگڑ'' لایا کرتا تھا۔

گوری کا چچا رمیش باقی گھر سے قدرے مختلف ہے اُسے یہ گاؤں پسند نہیں۔ وہ اپنی شادی کے ساتھ کئی سال میں چار دن اس گھر میں رہا ہوگا۔یعنی اس کی چچی دنیا صرف نو دن سہاگن رہی تھی۔ ناول نگار کے مطابق عورت کی چار ذاتیں بیاہی، کنواری ، مطلقہ اور بیوہ ہوتی ہیں لیکن دھنیا کی پانچویں ذات تھی انتظار کی ذات۔ رمیش کے آنے کا انتظار، اس کی خبر کا انتظار اور منی آرڈر کا انتظار۔

گھر والوں کو صرف رمیش کے منی آرڈر کا ہی انتظار رہتا تھا۔اگر کبھی منی آرڈر لیٹ ہو جاتا تو دھنیا کو باقی کے گھر والے بلانا بند کر دیتے ،خود اس کے چاول حلق سے نیچے نہ اُترتے تھے۔ ڈاکیہ مشکل سے تین چار مہینوں بعد اس گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ رمیش کے منی آرڈر آنے پر رام اوتار کے گھر عید جیسا ماحول ہو جاتا۔ گوری کا باپ

شہر جا کر چاولوں کی بوری اور گھر کے افراد کے لئے ایک آدھ کپڑے لیکن جب کبھی اکیلی چھٹی آتی تو پورے گھر میں سوگ کا ماحول چھا جاتا تھا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول میں انتہائی پچھڑے ہوئے علاقہ کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پورے ناول پر بھوک وافلاس کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ یہ ایسا علاقہ ہے جہان پر صرف کھانے کے نام پر مٹھی بھر اُبلے ہوئے چاول ملتے ہیں۔

یہ علاقہ بے انتہا پچھڑا ہوا تھا۔ نہ یہاں گاڑی آتی تھی اور نہ ہی بس اور نہ ہی یہاں سڑک تھی۔ بلکہ پگڈنڈی بھی دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔بس چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ان کا اہم پیشہ کھیت تھا۔لیکن کھیتی کرنے کا طریقہ صدیوں پرانا تھا۔ یہ لوگ کھیتی کے مشینی اوزاروں سے بالکل ناآشنا تھے۔اگر کوئی ان کو کھیتی کے جدید اوزاروں کے بارے میں بتاتا تو یہ کہتے۔

جاؤ رے جاؤ.....اُلو بنانے کے لئے تمھیں ہم ہی ملے ہیں۔

فصل بارش پر منحصر کرتی تھی۔ بارش ہوجاتی تو فصل ہوجاتی ورنہ خدا مالک تھا۔کھیتی کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بکریاں اور مرغیاں پالتے تھے۔ چارے کے بغیر پلی یہ بکریاں بہت کمزور ہوتیں تھیں۔ جو کم داموں میں شہر جا کر بکتی تھیں جن سے صرف چند کلو موٹے چاول ہی ان کو ملتے تھے۔

گوری اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر اس دنیا میں آتی ہے۔اس کا باپ گردھر بیٹا چاہتا ہے اور اس کی ماں دعائیں کرتی ہے کہ اس بار اس کے بیٹا ہو اور گوری اپنی ماں کی کوکھ میں خود بن کر دھڑک رہی تھی۔ سارے گھر میں صرف دھنیا ہی گوری کی ماں کا خیال رکھتی ہے۔گردھر کو لگتا ہے کہ گوری کی ماں نے بیٹیاں پیدا کر کے اس کی مردانگی کو شرمسار کیا ہے۔غرض کہ اس خطے میں عورت کی حالت بد سے بدتر ہے انتہائی رحم والی ۔عورتیں اس گاؤں میں بکریوں کے بھاؤ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔

''گردھر کے دوست تاڑی پی کر اسے تسلی دیتے۔

''قصور بیج کا ہی تو نہیں ہوتا گردھر بھائی۔قصور تو زمین کا ہوتا ہے۔اگر زمین بنجر ہو تو جتنا بھی جوت لو بیج ڈالتے جاؤ وہ بنجر ہی رہتی ہے۔دیکھو نا بیچارے اپنے بھائی رمیش کی طرف، آج تک اس کی عورت اس بیچارے کو ایک مچھر بھی پیدا کر کے نہیں دے سکی۔آتا ہی ہے وہ دو تین سال میں۔کمائی بھی تو کرتا ہے بیچارہ۔پردیس میں بھٹک رہا ہے کمائی کے واسطے اور یہاں وہ بس کھانے کے لیے کھونٹے سے بندھی ہوئی ہے۔ہم تو کہتے ہیں اگر اس بار بھی تیری عورت نے لڑکی پیدا کی تو تم دونوں بھائی دو بہوئیں اور لے آؤ اور بہو کون اگانی پڑتی ہے۔چار بکریوں کے بدلے میں نئی بہو آجاتی ہے اور کیا۔'' (ناول ''گوری''،صفحہ ۱۸)

گردھر کو فکر ہے اگر اس کے بیٹا نہ ہوا تو اس کا خاندان ختم ہو جائے گا۔

لیلا رام گردھر کا بچپن کا دوست ہے جو شہر میں ماسٹر ہے۔کئی سال بعد گھر واپس آیا ہے۔لیلا، گردھر سے بہت پیار کرتا ہے۔اس سے ہی ملنے آیا ہے۔لیلا رام کے اعزاز میں تاڑی کو دعوت دے دی ہے۔اس خطے کے لوگ درختوں کے پھلوں سے ایک طرح کا رس نکال کر پیتے ہیں جو پینے میں کھٹا ہوتا ہے۔لیلا رام شاید اس علاقے کا واحد شخص ہے جو لڑکیوں کو پیار کرتا ہے۔وہ گردھر کو سمجھاتا ہے کہ بچے تو بچے ہوتے ہیں لیکن گردھر کہتا ہے کہ ماں کو تو لڑکا چاہیئے۔لیلا رام کو اپنی مٹی سے بہت پیار ہے۔وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارے علاقے میں کوئی اسکول ہوتا تو وہ یہیں رہ کر اپنے بچوں کو پڑھاتا۔لیکن گاؤں کے جاہل لوگ اس کی باتوں کو سچ نہیں مانتے کہ بھلا شہر کو چھوڑ کر اس ریت میں کون آئے گا۔جہاں کھانے کے لئے ایک وقت کھانے کے نام پر صرف چاول اور پینے کے لئے تاڑی ملتی ہے۔سارا دن درختوں پر چڑھتے رہو اور تاڑی کے مٹکے باندھتے رہو۔

اس ناول کی عورت بھی عورت کی دشمن ہے۔ بیٹی کے پیدا ہونے پر ماں، دادی اور دائی کو بھی بہت افسوس ہوتا ہے۔ گوری کی پیدائش پر گھر میں ماتم چھا جاتا ہے۔ صرف اس کی چچی دھنیا ننھی بچی کو اٹھاتی ہے اور اس کو نہلا دھلا کر اس کا نام گوری رکھتی ہے۔ دائی کے مکالمے ملاحظہ فرمائیں:

''مرنا ہوتا تو پیدا ہونے سے پہلے مرتی، اب کیا مرے گی، اب تو ماں باپ کو مارے گی۔ میرا بھی انعام کھا گئی حرام زادی۔'' (ناول ''گوری''، صفحہ ۲۹)

گوری کی ماں اس کی پیدائش پر بہت ڈرتی ہے۔ سارا دن کام کرتی رہتی ہے اور طعنے سنتی رہتی ہے۔ گوری کی ماں اپنی بیٹیوں کو خاردار جھاڑی کہتی ہے اور اس کی ساس پتھر۔ وہ بار بار گردھر کی دوسری شادی کی دھمکی دیتی ہے۔ گوری کی پیدائش کے جرم میں اس کی ماں کو گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے لیکن لیلا رام نے گردھر کو اپنی بیوی کے لئے ایک اور موقع دینے کی ہدایت کی۔ گردھر لیلا رام سے کیا وعدہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک ہی تو یار تھا اس کا پوری دنیا میں۔

رمیش کئی سال بعد چھٹی پر گھر آیا۔ گردھر اور رمیش نے ولائتی شراب پی اور دیر رات تک دکھ سکھ کی باتیں کرتے رہے۔ چند ماہ بعد ایک بار پھر گوری کی ماں اور چچی دھنیا پہلی بار اُمید سے تھیں۔ دیوی نے اس مظلومہ پر کرپا کر دی اور دونوں کے ہاں بیٹے ہوئے۔ گھر کے بیٹوں کی پرورش راجکماروں کی طرح شروع ہوگئی اور بیٹیوں کو گھر میں مویشیوں سے بھی کم سمجھا جاتا تھا۔ صرف دھنیا چچی ہی ان کا دھیان رکھتی اور ساس سے ڈانٹ کھاتی۔

گوری اپنی بہنوں سے زیادہ خوبصورت اور ضدی تھی۔ وہ کھانے کے لئے ضد کرتی۔ وہ گھر کے لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی۔ دھنیا چچی ان کو چوری سے اور کھانا دیتی۔ دھنیا کے علاوہ پڑوس کا لڑکا کشن جو گوری کا ہم عمر تھا۔ گوری کا بہت خیال رکھتا تھا۔ کشن کا والد اُسے پڑھاتا رہتا۔ گوری بھی محسوس کرتی تھی کہ ایک کشن ہی ہے جو اس کو برابری کا حق دیتا ہے۔ گوری کو کشن کے ساتھ بیٹھ کر، کھیل کر بہت اچھا لگتا تھا۔ دونوں پکے

دوست تھے اور دن بھر کھیلتے رہتے تھے۔

گوری آٹھ سال کی ہوگئی تھی کہ ان کی جھگیوں سے تین چار کوس دور سڑک بننے لگی۔ اس سال سوکھا بھی زبردست پڑا تھا۔ جھگیوں کے لوگ چاہتے تھے کہ سڑک بنانے کی بجائے ان کو اناج دے دیا جائے۔ لیکن سڑک ان کے لئے نئی چیز تھی۔ اس لئے پورا گاؤں سڑک بنتی دیکھنے نکل گئے۔ سڑک بنا رہے بابو نے بھیڑ سے کہا سرکار نے تم لوگوں کی مدد کے لئے یہ سڑک بنوانا شروع کی ہے........تم سب مزدوری کرو۔ پانچ چھ مہینے کا کام ہے، بچے بھی مزدوری کر سکتے ہیں جب بارش ہوگی تو تم کھیتی کرنا۔ لوگ کام پر آ گئے دوپہر کا کھانا اور تاڑی لائے تو بابو ناراض ہو گیا۔ لیکن جلد ہی بابو کو پتا چل گیا کہ یہاں کچی لسّی (چھاچھ) جیسی تاڑی ان لوگوں کے لئے چائے کی پیالی سے زیادہ نشیلی نہیں ہوتی۔ تاڑی ان کی زندگی کا حصّہ ہے۔ گردھر نے اپنی بیٹیوں کو بھی اس کام پر لگا دیا۔ بابو کا نام بابورام تھا جس کا تعلق پنجاب سے تھا۔ رام لبھایا اس سڑک کا ٹھیکے دار تھے جو بہت امیر آدمی تھے۔ رام لبھایا کی اکیلی اولاد سوشیلا کی شادی بابورام سے ہوئی تھی۔ سوشیلا خوبصورت نہیں تھی بابورام نے یہ شادی پیسے کے لئے کی تھی لیکن اس کے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ بابورام کی گندی نگاہ گوری پر ٹک گئی اور اس نے گردھر کو کہا کہ وہ گوری کو گود لینا چاہتا ہے اور ہزار روپے میں گوری کا سودا ہو گیا۔ آخر کار سڑک بن گئی اور بابورام گوری کو اس وعدے کے ساتھ اپنے ساتھ لے گیا کہ وہ اسے ہر سال یہاں لایا کرے گا۔

سوشیلا نے گوری کو دیکھ کر بہت ہنگامہ کیا اور بابورام اور گوری کے گھر والوں پر بہت برسی۔ لیکن بابورام نے آخر اس کو رضامند کر لیا کہ وہ گوری کو اس کی خدمت کے لئے لایا ہے۔ گوری کو حویلی کی چھت پر ایک کوٹھری دے دی گئی۔ گوری سارا دن گھر میں جھاڑو لگاتی، پونچھا لگاتی، کپڑے دھویا کرتی، برتن مانجھتی، سوشیلا کے سر میں تیل ڈالتی اور مالش کرتی پیر دباتی۔ پھر رات کے وقت اپنی کوٹھری کے دروازے سے لپٹ کر روتی رہتی۔ اسی

طرح چار پانچ سال گذر گئے۔ گوری کی قمیض اسے پھنسنے لگی۔ پھر ایک دن جب سوشیلا اپنی ماں کے ساتھ پوری اور جگ ناتھ مندر کے درشن کرنے گئی ہوئی تھی تو بابو رام نے گوری کو اپنی اندھی ہوس کا شکار بنا لیا۔ چند ماہ بعد جب سوشیلا نے گوری کا بڑھا ہوا پیٹ دیکھا تو اس نے گوری کو بہت مارا۔ گوری نے نو ماہ بعد بابو رام کی ناجائزہ اولاد کو جنم دیا۔ اس کے ایک بیٹا ہوا جس کو سوشیلا اور بابو رام نے اپنا نام دے دیا۔ شنکر جب گھٹنوں کے بل چلنے لگا تو سوشیلا نے گوری سے اُسے چھین لیا اور گوری پھر سے گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ شنکر بڑا ہو رہا تھا۔ وہ اسکول جانے لگا۔ لاڈ پیار نے شنکر کو بری طرح بگاڑ دیا تھا۔ گھر میں وہ گوری پر دھونس جماتا۔ اس کی پیٹھ پر مُکے مار دیتا اور اس کو گندی گندی گالیاں دیتا۔ شنکر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا سوشیلا اسے گوری سے دور کرتی گئی۔ جب وہ بڑا ہو گیا تو گوری اس کے نوکرانی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔ پورے گھر میں صرف دو لوگ تھے جن کا کلیجہ گوری کو دیکھ کر پگھلتا تھا۔ ایک تو روٹی بنانے والا پرانا ادھیڑ نوکر جسے سب ''مہاراج'' کہتے تھے۔ دوسرا فرد گھر کا مکھیہ رام لبھایا تھا جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنا ہوا تھا۔ یہ دونوں بوڑھے بزرگ گوری سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ رام لبھایا کو لقوہ مار گیا۔ سوشیلا اس کے پاس بھی نہ آتی جبکہ گوری اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے سر کو اس طرح اٹھاتی جیسے نوزائیدہ بچے کو چھوا جاتا ہے۔ پھر اس کے سر کو اپنے کندھے سے ٹکا کر بٹھا دیتی اور اسے دلیا کھلاتی، سوپ پلاتی۔ رام لبھایا کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور دعائیں دیتا رہا۔

''میری بچی اگلے جنم میں یا تو میری بیٹی بننا یا ماں.....''

(ناول ''گوری''، صفحہ۸۳)

آخر کار ڈیڑھ سال کی علالت کے بعد رام لبھایا مر گیا۔ شنکر گیارھویں میں پہنچا تو سوشیلا کو بھی لقوا ہو گیا۔ گوری سوشیلا کے اس پر کئے مظالم بھول گئی اور دن رات اس کی خدمت میں لگ گئی۔ بابو رام کا راستہ صاف

ہوگیااوراس نے ہر رات گوری کواپنی ہوس کا شکار بنانا شروع کر دیا۔ایک دن شنکر نے دروازے کے سوراخ سے اپنے باپ کوگوری کے ساتھ دیکھا تو نفرت کا تیز سیلاب اس کی پسلیوں کے اندر اُمنڈنے لگا۔اسی بیچ سوشیلا مرگئی۔شنکر کی نفرت اپنے باپ کے تئیں بڑھتی گئی۔شنکر گھر سے دور چلا گیااور بابورام،گوری کے اور نزدیک ہوگیا۔ وہ گوری کوخوش کرنے کی ہر کوشش کرتا۔دولت اور زیور سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔بابو نے آخر میں اسے خوش کرنے کے لئے اس کے گاؤں بڑودہ لے جانے کا ارادہ کیا۔لیکن اس گاؤں میں بھی ریت کے ٹیلوں کے اور تاڑی کے درختوں کے علاوہ گوری کو کچھ نہیں ملا۔بابورام بوڑھا ہو چکا تھااور گوری چالیس سالوں کا درد کا سفر طے کر چکی تھی۔

شنکر جب بھی گوری کواپنے باپ کے کمرے میں دیکھتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔وہ گوری اوراپنے باپ کوگندی گندی گالیاں دیتا۔اسی بیچ بابورام بھی بیمار رہنے لگا۔آہستہ آہستہ اس کی بیماری بڑھنے لگی۔بابورام شنکر کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ گوری اس کی اصل ماں ہے۔لیکن شنکر نے کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔شنکراب انتظار میں تھا کہ کب بابورام کا کام تمام ہواور وہ اس کی وراثت کا وارث بنے اور پھرایک رات بابورام کا سوتے ہوئے ہی ہارٹ فیل ہوگیا۔

شنکراب پوری حویلی کا، پورے بزنس کا ساری جائیداد کا اکلوتا وارث تھا۔مشکل سے انتیس سال کا تھا اس وقت وہ۔لیکن انتیس سال کی عمر میں وہ چالیس کا نظر آنے لگا تھا۔سر کے آدھے بال اُڑ چکے تھے۔شراب نے توند پھلا رکھی تھی اوراکھڑ پن نے نقوش سخت کر دیے تھے گوری ویسے تو اس وقت چالیس کو پار کر چکی تھی لیکن بچپن سے ہی پانچ پانچ سات سات میل سے پانی کے گھڑے بھر کر لانے سے،سڑک پر پتھر توڑنے اور پھر بابورام کی حویلی میں چڑیوں سے بھی پہلے اُٹھ کر جھاڑو پونچھا کرنے سے، برآمدہ رگڑ رگڑ کر دھونے سے،کچن کا پورا کام

کرنے سے، سارا دن پورے گھر کی خدمت کرنے سے، سوشیلا کو ملنے دبانے سے، ادھر سے ادھر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھاگنے دوڑنے سے اس کے جسم میں لچک اور چستی تھی اور وہ مشکل سے اٹھائیس کی نظر آتی تھی۔ حقیقت میں اگر گوری شنکر سے چھوٹی لگتی تھی۔

شنکر گوری کو اپنے باپ بابورام کی رکھیل سمجھتا ہے جس نے اس کی ماں سے اس کا پتی چھین لیا تھا۔ اس کا بدلہ وہ گوری سے بلاتکار کر کے لیتا ہے۔ اجیت کور ناول کی کہانی چند جملوں میں یوں پیش کرتی ہے:

> ''(گوری) جو پوری عمر پہلے باپ سے کانپتی رہی، کیونکہ باپ اسے بھگوان کی بھیجی ہوئی بد دعا سمجھتا تھا۔ ماں سے ڈرتی رہی کیونکہ ماں کو لگتا تھا کہ وہ اسے رسوا کرنے کے لئے ہی ایک بد دعا کی طرح پیدا ہوئی ہے.......پھر وہ اس مرد سے کانپتی رہی جو اسے غلام بنا کر خرید کر لایا تھا۔ اس نے گوری کی غلام کوکھ کو استعمال کر کے اپنا وارث پیدا کیا تھا۔ اپنے خاندان کا چراغ جو گوری کا کچھ نہیں لگتا تھا پھر وہ اسی وارث یعنی اِسی مرد سے خوفزدہ رہنے لگی جس کو اس نے اپنے لہو سے سینچا تھا اور اپنے جسم سے پیدا کیا تھا۔ اپنے ہی خون اور گوشت کا ایک حصہ....آج اِسی نے گوری کے جسم کو وراثت میں ملی جائداد اور ملکیت سمجھ کر سب سے بڑی گالی دی تھی۔ کوڑا کر دیا تھا اسے۔''
>
> (ناول ''گوری''، صفحہ ۱۱۱۔۱۱۲)

کردارنگاری:

ناول ''گوری'' کا مرکزی کردار گوری ہے جو کہ ایک لڑکی ہے۔ اس ناول کا تانا بانا بننے کے لیے اجیت کور نے گوری کے علاوہ کئی اہم کردار اور ضمنی کرداروں کی مدد سے ناول کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اس ناول میں مندرجہ ذیل کردار ہیں:

۱۔ گوری

۲۔ شنکر (گوری کا بیٹا)

۳۔ رام اوتار (گوری کا دادا)

۴۔ گردھر کی ماں (گوری کی دادی)

۵۔ گردھر (گوری کا والد)

۶۔ رمیا کی مائی (گوری کی ماں)

جسے اس کی بڑی بیٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۷۔ رمیّا (گوری کی سب سے بڑی بہن)

۸۔ منجھلی (گوری کی منجھلی بہن)

۹۔ ملّی (گوری کی بہن)

۱۰۔ رمیش (گوری کا چچا)

۱۱۔ دھنیا (گوری کی چچی)

۱۲۔ لیلا رام (گوری کے والد گردھر کا دوست)

۱۳۔ کشن (گوری کا بچپن کا دوست)

۱۴۔ بابو رام (سڑک بنانے والا ٹھیکے دار)

۱۵۔ رام لبھایا (بڑا ٹھیکے دار، امیر ترین آدمی)

۱۶۔ سوشیلا (بابو رام کی بیوی، اور رام لبھایا کی بیٹی)

۱۷۔ مہاراج (رام لبھایا کے گھر کا نوکر)

ناول ''گوری'' بیانیہ قسم کا ناول ہے۔ناول نگار نے پورا ناول خود بیان کیا ہے۔صرف شنکر اس ناول کا واحد کردار ہے جو بولتا ہے۔لیکن اِن سب کے باوجود اس ناول کے سبھی کردار زندہ جاوید ہیں اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔بلاشبہ گوری کا کردار پنجابی ادب کا ایک نمائندہ کردار ہے۔

تنقیدی جائزہ:

ناول ''گوری'' ایک سماجی اور معاشرتی قسم کا ناول ہے۔جس میں جہاں ناول نگار نے ایک نہایت ہی پسماندہ طبقے کی کہانی بیان کی ہے وہیں ہندوستان کی معاشرتی برابری پر بھی سوال اٹھایا ہے۔یعنی اس ملک کا معاشرتی نظام صحیح نہیں ہے۔کہیں تو لاکھوں کروڑوں روپے ہیں کہیں پیٹ بھرنے کے لئے مٹھی بھر چاول بھی نہیں۔ناول نگار نے ہندوستان کا ایسا علاقہ ناول کے لئے منتخب کیا ہے جو دنیا سے بالکل کٹا ہوا ہے۔جہان زندگی کے لئے ضروری اشیاء روٹی، کپڑا اور مکان بھی دستیاب نہیں ہیں۔ناول کے ابتدائی حصّے پر بھوک وافلاس کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔پورا ناول عورت کے آنسوؤں سے تر ہے۔

جہاں تک ناول کی کہانی کا تعلق ہے تو اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔اس موضوع پر بے شمار فلمیں اور کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔لڑکیوں کی خرید وفروخت ہندوستان میں عام بات ہے۔لیکن جس بے باکی سے اس ناول میں ہندوستان کی عورت کی بدترین حالت پیش کی گئی ہے وہ کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ناول ''گوری'' بیک گراؤنڈ کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور کہانی کو پیش کرنے کے لئے بیانیہ انداز اپنایا گیا ہے۔پیش کاری اتنی زبردست ہے کہ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کہانی کار ناول خود بیان کر رہا ہے۔

اس ناول میں ہندوستانی سماج کے دو پہلو پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ لڑکیوں کی پیدائش کا ہے۔ لڑکیوں کی پیدائش پر گھر میں ماتم چھا جاتا ہے۔ مرد سے زیادہ عورت، عورت کی دشمن ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر سب سے زیادہ دکھ ساس کو ہوتا ہے۔ دائی کو بھی بیٹی کی پیدائش پر انعام نہیں ملتا۔ اس لئے وہ بھی بیٹی کی پیدائش پر دکھی ہوتی ہے۔ ماں اپنی بیٹی کو کہتی ہے کہ خاندان چلانے کے لئے بیٹی نہیں بیٹا چاہئے۔

شنکر اس ناول کا واحد کردار ہے جس کے منہ سے مکالمے ادا ہوئے ہیں۔ گوری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے اردگرد پورا ناول گھومتا ہے۔ گوری ایک بدنصیب لڑکی ہے جو بادلِ نخواستہ پیدا ہوئی ہے۔ اُسے اپنے خاندان میں کسی کا پیار نہیں ملتا۔ اس کے گھر میں بکریوں کی اس سے زیادہ قدر ہے۔ صرف اس کی چچی دھنیا اس پر مہربان ہے۔ گوری گھر کے بیٹوں کے برابر کھانا مانگتی ہے یعنی وہ احتجاج کرتی ہے اور چچی دھنیا اس کی اس خواہش کو پورا کرتی ہے اُسے گھر کی افراد کی چوری سے کھانا کھلاتی ہے۔ لیکن وہی گوری جب بابورام کی ہوس کی شکار ہوتی ہے تو وہ بولتی تک نہیں۔

اس کے علاوہ جب اُس سے سوشیلا اس کا بچہ چھین لیتی ہے تو وہ چپ رہتی ہے۔ وہ کوئی احتجاج نہیں کرتی ۔ یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ ناول میں ایک بھی ایسا جملہ نہیں جس میں گوری اپنے بیٹے شنکر سے محبوب کا اظہار کرتی ہو۔ ماں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا وہ اپنی اولاد سے دوری برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اولاد کے لیے جان دے بھی سکتی ہے اور لے بھی سکتی ہے۔

گوری کو اپنے چچا کے بچپن میں اپنے چچا کے لائے ہوئے لباس بہت پسند تھے۔ یعنی وہ اچھے کپڑے پہننے کی شوقین ہے۔ لیکن بابورام کے پاس جا کر اس کا یہ شوق بھی دم توڑ دیتا ہے۔ اُسے کسی چیز کی چاہت نہیں رہتی۔ نہ دولت کی، نہ کپڑوں کی اور نہ ہی زیوروں کی۔ یہ باتیں بھی ایک عورت کی نفسیات کے خلاف ہیں۔

اس طرح اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں والدین، سماج، شوہر اور اولاد نے گوری پر ظلم کیے ہیں وہیں ناول نگار نے بھی اپنے ناول کی دھار کو اور تیز کرنے کی غرض سے گوری کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کو فراموش کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک لاش ہے۔ یقیناً یہ ناول کا ایک کمزور پہلو ہے۔

گوری آٹھ سال کی عمر میں بابورام کے ساتھ کلکتہ آ جاتی ہے۔ ناول کے آخر تک وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن کلکتہ کی زبان نہیں سیکھ پاتی جبکہ اس کے برعکس ناول نگار کہتی ہے کہ گوری بابورام کے گھر کے سبھی افراد کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اگر گوری ان کی زبان نہیں جانتی تو پھر وہ ان کی بات کیسے سمجھ پاتی ہے۔ اس طرح گوری کے کردار کو ناول نگار نے بھی بے حد مجروح کیا ہے یعنی ناول نگار نے بھی اس پر ظلم کیا ہے۔

اس ناول کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ناول نگار نے ناول کی کہانی پیش کرنے سے پہلے ناول کے آغاز میں جس خطّے کی کہانی پیش کرنی ہے تو اُس کا تفصیلی ذکر پیش کیا ہے۔ ناول نگار نے اس خطّے کے مسائل، وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، ان کی عادات، ان کے کاروبار اور ان کی رسموں رواجوں کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ تا کہ ناول کی کہانی بیان کرتے وقت اُسے کسی چیز کی وضاحت نہ کرنی پڑے جس سے ناول کی پیش کاری میں کسی طرح کا خلل محسوس ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ناول نگار نے خود جا کر اس خطّے کے ایک ایک پہلو کو نوٹ کیا ہو۔

> ''بڑودہ اور نرمدا ندی کے درمیان اُجاڑ سنسان علاقہ میں ایک چھوٹا سا گانو تھا۔
>
> ریتیلا علاقہ۔ دُور دُور تک پھیلے ریت کے ٹیلے۔ نرم نہیں سخت راجستھان کی ریت کے ٹیلوں کی طرح نہ ڈھہتے نہ تپتے۔ نیچے سخت زمین اور اوپر ریت ہی ریت، پتھریلی سی بھوری ریت۔
>
> ہر ایک ٹیلہ کی اوٹ میں بنے دو چار گھروں کا ایک گانو۔ دو چار گھروں کی بستی جن

> کے بزرگ شاید ایک ہی ہوں گے۔ کسی اکیلے آدمی نے وہاں جھگی بنائی ہوگی اور پھر
> اگلی اور اس سے اگلی اور اس سے اگلی نسل کے ساتھ اور گھر بنتے چلے آئے ہوں گے۔
> مٹّی کی دیواروں کے گھر۔ کھپریل چھتوں کے گھر۔ تاڑی کے درختوں کے پتّوں اور
> شاخوں کو جوڑ کر بنی چھتیں۔ (ناول ''گوری''، ص۱۰)

اس ناول کے مترجم پروفیسر خالد محمود اردو ادب کی جانی مانی شخصیت ہیں۔ موصوف اردو دنیا میں بطور نقاد جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس ناول کا ترجمہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ کہیں سے ایسا نہیں لگتا کہ یہ ناول پہلے پنجابی میں لکھا گیا تھا۔ ناول کے مکالمے، زبان و بیان نہایت عمدہ اور سلیس ہے۔ قاری کو ناول پڑھتے وقت کسی بھی جگہ پنجابی پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

اجیت کور کو منظر نگاری پر بھی قدرت حاصل ہے۔ لیکن وہ بے جا منظر نگاری کی قائل نہیں ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہیں وہ اپنے اس ہنر کا استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ آج کل کے ناول زیادہ طویل نہیں ہوتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوری پنجابی ادب کا ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ادب کا ایک بہترین ناول ہے۔ جس میں اجیت کور نے ہندوستانی عورت پر ہو رہے مظالم سے ہمیں آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کام میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ناول ''گوری'' کی کہانی نہایت دلخراش ہے۔ پڑھتے وقت قاری بار بار جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ناول ''گوری'' ہندوستانی سماج کا حقیقی آئینہ ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا اصل عکس پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

باب چہارم:

مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارنامے

۱۔ نانک سنگھ

۲۔ امرتا پریتم

۳۔ اجیت کور

ا۔ نانک سنگھ

نانک سنگھ کی سوانح اور کارنامے

نانک سنگھ سرزمین پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اوراورنانک سنگھ کا جنم ضلع جہلم کے گاؤں چک حمید میں لالہ بہادر چندسوری کے گھر چار جولائی 1897ء میں ہوا۔آپ کی والدہ کا نام لچھمی تھااور آپ کا بچپن کا نام ہنس راج تھا۔

ان کے والد کی کریانہ کی دوکان تھی مگرنانک سنگھ ابھی چوتھی پانچویں جماعت میں تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔گھر کی ساری ذمہ داری نانک سنگھ کے کاندھوں پرآن پڑی کیوں کہ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔

اس طرح خوردسنی میں ایک یتیم کی دکھ بھری زندگی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔دوکان ان کی ان کے چچاؤں کے ساتھ مشترکہ تھی۔لالچ بُری بلا ہے۔سو چچاؤں نے لالچ میں آکر یتیم بھتیجوں اوران کے بہن بھائیوں کی دکھ بھری زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چند دنوں میں ساری دوکان لوٹ کھوٹ کر برابر کردی۔دوکان بند ہو گئی۔اب نانک سنگھ کام کی تلاش میں نکلے۔اس نے برتن دھونے سے لے کرکئی چھوٹے چھوٹے کام کئے مگر کسی سے فائدہ نہ ملا۔سووہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔

اچانک باطن سے شاعری کے سوتے پھوٹ پڑے۔ان کی اولین تخلیق ''ستگو رومہما'' نام کا گٹکا ہے۔ ستگو رومہما کے الفاظ (شبد) اس قدر مقبول ہوئے کہ نانک سنگھ 'نکڑا' شاعر کے نام سے مشہور ہو گئے۔ان کا اولین شعری مجموعہ ''سی حرفی ہنس راج'' 1910ء میں شائع ہوا۔اس کی فروخت سے ہونے والی آمدنی نے انہیں

اقتصادی بُحران سے باہر نکالا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ان کا عشق ساوتری نام کی بال وِدھوا لڑکی سے پروان چڑھا۔ ساوتری ادب وموسیقی کی پرستار تھی۔ اس لیے نانک سنگھ نے ادب تخلیق کیا اور موسیقی کی تعلیم حاصل کی مگر قدرت نے ساوتری کو نانک سے جلد ہی دور کر دیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد اس کی والدہ اپاہج ہو گئی۔ انہوں نے اپنی والدہ کی بہت خدمت کی مگر ان کی والدہ بھی انہیں داغِ مفارقت دے گئی۔ گہری چوٹ نے نانک سنگھ کو اوباش لڑکوں کی صحبت میں ڈال دیا۔ اس لیے مذہبی رجحان سے وہ گراوٹ کی طرف جانے لگے۔ گورودوارے جانا ترک کر دیا۔ مذہبی گیت لکھنے اور باترنم پڑھنے ترک کر دیے۔

انہیں دنوں میں وہ گیانی باگھ سنگھ کے رابطے میں آئے۔ اس عظیم انسان کی تحریک سے نانک سنگھ دوبارہ اچھا انسان بننے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ مکمل گورسِکھ بن گئے اور بُری صحبت چھوڑ دی۔ مذہبی امور میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے نیکی، سچائی اور پاکیزگی والی زندگی اختیار کر لی۔ مذہبی گیت لکھنے شروع کیے جنہیں ''ستگورو گُٹکے'' کی شکل میں شائع کروایا۔ یہ نانک سنگھ کی زندگی کا نیا موڑ تھا۔

اسی زمانے میں گیانی شیر سنگھ نے راولپنڈی میں ایک پریس لگوائی اور نانک سنگھ کے سپرد سارا کام کر دیا۔ گیانی جی گرفتار ہوئے اور پریس کا کام چھوڑنا پڑا۔ انھیں انہی ایام میں نانک سنگھ کی ملاقات ایک نِرمل سادھو سے ہوئی جس کو بعد میں غلط کام کرتے ہوئے نانک سنگھ نے دیکھ لیا۔ اسی وجہ سے انھیں ایسے لوگوں سے نفرت ہو گئی۔

روحانی مسرت کے حصول کی غرض سے نانک سنگھ رِشی کیش گئے مگر پھر پشاور آ گئے۔ اپنے گورو گیانی باگھ سنگھ کی پناہ میں۔ اسی زمانے میں گورو کا باغ مورچہ لگا اپنے گورو کی تحریک پر نانک سنگھ اس مورچے میں شریک

ہوئے اور گرفتار ہو کر جیل گئے۔ جیل میں تنہائی میسر ہوئی۔ منشی پریم چند کے ناول پڑھے جن سے انھیں لکھنے کی تحریک ملی اور ان کے اندر تخلیق ادب کا خیال جاگ پڑا اور انہیں اپنی زندگی کا مقصد مل گیا۔ انھوں نے ناول لکھنے شروع کر دیے۔

ان کی دوستی شوبھا سنگھ آرٹسٹ کے ساتھ ہوئی۔ 1936ء میں گوربخش سنگھ پریت لڑی کے رابطے میں آئے۔ ان کی طرف سے قائم شدہ ''پریت منڈل'' کی ''پریت سینا'' کا اولین ممبر نانک سنگھ بنا اور کچھ اور ممبر بھی بنے۔ یہ پریت قافلہ دو سال لاہور رہنے کے بعد امرتسر آ گیا۔

نانک سنگھ بچپن سے ہی سنجیدہ مزاج تھے۔ انھوں نے غربت اور بے کسی کی بھری زندگی کی مشکلات دیکھی تھیں اس لیے پریت نگر کی بیرونی غربت، مزدوروں کی بے بسی انھیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ ٹھنڈے پانی کی سبیل لگاتے، مزدوروں کے گھروں میں جا کر ان کے دکھ سکھ بانٹتے۔

1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات نے تو نانک سنگھ کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قتلِ عام اور عورتوں کی عصمت دری آنکھوں کے سامنے گھروں کو نذرِ آتش ہوتے ہوئے دیکھ کر نانک سنگھ کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ دن رات دکھیوں اور زخمیوں کی خدمت میں لگے رہتے۔ آخر 1971ء عیسوی میں چل بسے۔ نانک سنگھ نے بہت سے ناول، ڈرامے اور کہانیاں لکھیں جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

ناول:

چٹا لہو	۱۹۳۲ء	غریب دی دُنیا	۱۹۳۲ء
گنگا چلی وچ شراب	۱۹۴۷ء	کاگ تاں دی بیڑی	۱۹۳۴ء
پیار دی دُنیا	۱۹۳۸ء	غریب دی دُنیا	۱۹۳۹ء

ادھ کھڑیا پُھل	۱۹۴۰ء	پوتر پاپی	۱۹۴۲ء
جیون سنگرام	۱۹۳۴ء	دور کنارا	۱۹۴۵ء
لومیرج	۱۹۴۵ء	ٹوٹی وینا	۱۹۴۶ء
گنگا جل وچ شراب	۱۹۴۷ء	خون دے شعلے	۱۹۴۸ء
اگ دی کھیڈ	۱۹۴۸ء	منجھدار	۱۹۵۰ء
چتر کار	۱۹۵۱ء	آدم خور	۱۹۵۱ء
کٹی ہوئی پتنگ	۱۹۵۲ء	سومن کا نتا	۱۹۵۲ء
ناسور	۱۹۵۳ء	سنگم	۱۹۵۴ء
بنجر	۱۹۵۵ء	آستک ناستک	۱۹۵۷ء
پجاری	۱۹۵۸ء	جھلاواں	۱۹۵۹ء
ان سیتے زخم	۱۹۵۹ء	پتھر دے کنبھ	۱۹۶۰ء
ورنہیں سراپ	۱۹۶۲ء	اک میان دو تلواراں	۱۹۶۴ء
کوئی ہریابورٹ رہیوری	۱۹۶۴ء	سراپیاں روہاں	۱۹۶۵ء
گگن داماما باجیاں	۱۹۶۷ء		

کہانیوں کے مجموعے:

ہنجواں دے ہار | ٹھنڈیاں چھاواں | سدھراں دے ہار
سنہری جلد | مدھے ہوئے پُھل | سوپنیاں دی قبر
سورگ تے اُس دے وارث | تاش دی عادت | چونیوی کہانی
چھے چھیکڑلی ریشم | بڑا ڈاکٹر دی ہور کہانی | تصویر دے دوویں پاسے
پھوا

ڈرامے:

بی۔اے۔پاس | پاپ دا پُھل | چوڑ چانن
دھوبی دا کُتا

سوانح حیات:

میری دُنیا

ترجمے:

سولاں دی سیج | پت جھڑ دے پنچھی | رجنی
تصویر دے دواں پاسے | پتھر کمبیا | فرانس داڈاکو

انعامات:

١٩٢٦میں تاریخی ناول ''اک میان دوتلواراں'' میں ساہت اکادمی ایوارڈ انعام سے نوازہ گیا۔

١٩٨٦میں پوتر پاپی پرایک ہندی فلم بن چکی ہے۔

نانک سنگھ کا جنم اس وقت ہوا جب ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئے پچاس سال گزر چکے تھے اور یہ حکومت پنجاب میں اپنے پیر جمانے کے لیے کوششیں کررہی تھی۔ دوسری جانب یہ زمانہ دراصل تبدیلی کا زمانہ تھا۔ جب کہ آزادی کے متوالے غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان میں اٹھنے والی عوامی تحریکوں سے ثابت ہوتا ہے۔

1849ء میں پنجاب میں انگریز حکومت کی ابتداء کے ساتھ ہی پنجاب کے سیاسی، اقتصادی، سماجی و ثقافتی حالات میں ایسی تبدیلی آنی شروع ہوئی جس نے خاص طور پر پنجاب کے حکومتی انتظام اور اقتصادی پالیسی کے ماڈل کی شکل ہی بدل دی۔ چودھویں صدی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت کو وسیع کرنے کی پالیسی کے تحت چھوٹے چھوٹے آزاد صوبوں پر قبضہ کرلیا تھا اسی پالیسی کا نتیجہ 1857ء کا غدر تھا جسے حکومت نے بڑی بے دردی کے ساتھ کچل دیا امید تھی کہ اب ہندوستانی آزادی کے لیے کسی قسم کی جدوجہد نہیں کریں گے مگر جیسے جیسے حکومت ہندوستانیوں پر مظالم ڈھائے گئے ویسے ویسے ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کے تئیں بیداری بڑھتی گئی۔

اپنی سیاسی پالیسی کے مدِنظر برٹش حکومت نے مذہبی سطح پر فرقہ پرستی کو ہوا دے کر ہندو، مسلمان اور سکھ میں تفرقہ ڈالنا شروع کردیا۔ انگریزوں نے مذہب کی بنیاد پر لوگوں میں پھوٹ ڈالنا شروع کردی۔ انہوں نے خود کو

مسلمانوں کا رکھوالا کہا اور زمینداروں اور پڑھے لکھے طبقے کی سرپرستی کرنے لگے۔

انگریز حکومت نے ہندوستانی طریقہ تعلیم کو مغربی خطوط پر چلایا جس کی بدولت ہندوستانیوں کا مغربی علوم کے ساتھ رابطہ بڑھا اور تعلق استوار ہوا۔ حکومت کے ان اقدام کی وجہ سے چاہے ہندوستان کا کامل نظام ٹوٹ گیا مگر دوسری جانب نئی بیداری کی ابتداء ہوئی۔ انگریزوں نے تمام ہندوستان کو سیاسی اکائی میں باندھ دیا۔ نتیجتاً ذات پات اور مذہبی اختلافات میں منقسم ہندوستانیوں کو کثیر تعداد میں وحدت کا احساس کروانے والے ممکنہ حالات پیدا ہوگئے۔ اس وقت اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ اساتذہ، وکیلوں اور کلرکوں کی شکل میں اہلِ دانش متوسط طبقہ وجود میں آیا۔ ایک طرف نوکری پیشہ جماعت کی تعداد بڑھی اور دوسری طرف سرمایادار تاجر طبقہ وجود میں آیا جس نے جدید زمانے کی اقدارِ زندگی کو وجود دینے اور رواج دینے میں اپنا حصہ ڈالا۔ زمیندار سرداروں کے بعد پنجاب کی نمائندگی شہری متوسط طبقہ کے ہاتھ میں آئی۔ اس طبقے نے ملک کی ترقی میں رکاوٹ کی وجہ مذہبی تغافل اور معاشرتی رواجوں کو مانا اور مذہبی اصطلاحات کی طرف جھک گئی۔ سنت سنگھ سیکھوں کے مطابق:

> ''انہیں مناسب وجوہات کا علم نہیں تھا۔ وہ انگریز حکومت اور سرمایاداروں پر
> اپنی ترقی نہ ہونے کی ذمہ داری ڈالنے میں ہچکچاتے تھے۔ بلکہ اپنے تاریخی
> کرداروں، معاشرتی اور مذہبی اخلاقیات کو اس کا مجرم مانتے تھے۔''

(سیکھوں، سنت سنگھ: بھائی ویر سنگھ تے اُہناں دا یگ، صفحہ 21)

نانک سنگھ کے ناولوں کے پسِ پردہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا دور ہے۔ اس دور کا خاص اختلاف حکومت اور عوامی افکار کے درمیان تھا۔ پنجاب میں یہ اختلاف تین اشکال میں ظاہر ہوا۔ اس کی پہلی شکل مذہبی اصلاحات کی تحریکات تھیں جنھوں نے ہندوستانیوں کی غلامی کی وجوہات کو اپنے اسلاف کے ورثے سے ٹوٹ جانے میں تلاش کیا اور اس کا حل ان اقدار کی بازیافت میں طے کر دیا۔ دوسری شکل ان تحریکات میں تھی

جس کا بنیادی عنصر عوامی وسیع المشر بی تھا۔ان تحریکات نے معاشرتی اختلافات کے خلاف اور ملک کی آزادی کے حصول کے لیے ہندوستان کے مختلف اداروں کی جانب سے ڈالے ہوئے تفرقے کو دور کر کے تمام ہندوستانیوں میں قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔تیسری شکل ان تحریکات کی تھی جو ہندوستان کو سامراج سے آزاد کروانا چاہتی تھیں، وہیں ہندوستانی معاشرے کی طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے غیر منقسم معاشرہ تشکیل دینے کی خواہش مند تھیں۔ نانک سنگھ کے ناولوں میں ان تمام تحریکات کا ہی اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ بنیادی اعتبار سے نانک سنگھ انسانیت کا پرستار تھا جس کی وجہ سے اس نے ہر ایک تحریک کے اعلیٰ نمونوں کو غیر جانبداری کے ساتھ انسانیت کی شکل میں اپنایا۔نانک سنگھ کے فنِ ناول نگاری کا ارتقاء پنجاب کی معاشرتی تاریخ کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔ جہاں معاشرتی،تہذیبی، مذہبی اور بھائی چارے کی تبدیلیاں حالات اور عوامی تحریکات کا اثر متاخرین ناول نگاروں نے سیدھے طور پر قبول کیا وہیں متوسطین ناول نگاروں کی تخلیقات پر بھی ان کے اثر کی جھلک دیکھنے کوملتی ہے۔ادب اور سماج کا اٹوٹ رشتہ ہونے کی وجہ سے ہر سماجی تبدیلی کا اثر فرد پر پڑتا ہے اور ادیب تو ان اثرات کو بہت تیزی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اپنے ادبی شہ پاروں میں پیش کرتا ہے۔نانک سنگھ کے متعلق تو یہ عام رائے ہے کہ معاشرے میں ہونے والا کوئی بھی حادثہ ایسا نہیں جس نے اسے نہ جھنجھوڑا ہو۔اس نے ان حادثات کی بنا پر ہی اپنے ناولوں کے لیے نوع بنوع موضوعات منتخب کیے،جس کا کھلا ثبوت اس کا ناول 'سفید خون'، 'ادھ کھِلا پھول'، 'پیار کی دنیا'، 'غریب کی دنیا'، 'سنگم'، 'آدم خور' اور 'کٹی پتنگ' ہیں۔نانک سنگھ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ان کی والدہ کا پڑا جس کے متعلق اس نے خود لکھا ہے:

''قدرت کے مہربان ذخیرے نے صرف ایک ہی ایسا انمول عطیہ مجھے بخش دیا تھا
جس پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے اور یہ تھی میری بدنصیب ماں۔''

(میری دنیا،صفحہ 15)

اپنی والدہ کے اوصاف اور اخلاقیات کی بلندی سے وہ جس حد تک متاثر ہوئے اس کا بیان 'میری دنیا' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس کی روحانی بلندی اس کے ضبط اور اس کی نسوانیت کا سب سے بڑا چمتکار جو میں نے دیکھا، جس نے نہ صرف میری ماں کے لیے بلکہ دنیا بھر کی خواتین کے لیے میرے دل میں دائمی احترام کا جذبہ پیدا کر دیا، وہ ایک ایسا حادثہ تھا جس کا افسوس کہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔''

(میری دنیا، صفحہ 15)

مگر اس حادثے کا ذکر اس نے 'دور کنارا' ناول کی تمہید میں لکھتے ہیں:

'' کیسے اس کی ماں نے ناری دھرم کے تحفظ کے لیے اور سمبندھی کی جنسی خواہش سے بچنے کے لیے چھت سے چھلانگ لگا دی اور دونوں ٹانگیں تڑوالیں۔''

(نانک سنگھ: دور کنارا' ص ۱۹)

اس طرح یہ اس کی والدہ کے کردار کی بلندی کی منہ بولتی تصویر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گئی مگر اپنی عزت پر آنچ نہ آنے دی۔ اس حادثے کی وجہ سے اس کے دل میں ماں کے تئیں عقیدت اور پیار اور بڑھ گیا۔ اپاہج ماں کی خدمت جس لگن کے ساتھ اس نے کی اس کے متعلق اس کا اپنا خیال ہے لکھتے ہیں:

''میری زندگی کا اگر کوئی کامیاب دور گزرا ہے تو وہ وہی چند سال جب میں دن رات اپنی اپاہج ماں کی خدمت میں جٹا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ زندگی میں اسے جو عزت اور شہرت ملی وہ اس کی ماں کی دعاؤں کا ثمر ہی تھی۔''

(نانک سنگھ: میری دنیا، صفحہ 19)

ماں نے جہاں اسے ممتا سکھائی وہیں انسانیت کی خدمت، غریبوں سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ بھی اس نے اپنی ماں سے لیا۔ نانک سنگھ کی شخصیت کی تعمیر میں اس کی والدہ لچھمی نے سچ مچ ایسی کوششیں کیں جو نانک سنگھ کو آئیڈیل انسان بننے اور بعد میں کامیاب ناول نگار بننے میں بے حد معاون ہوئیں۔

'میری دنیا' میں نانک سنگھ نے ساوتری نام کی لڑکی کے ساتھ اپنے اولین رومانس کی بات بھی کی ہے۔ ساوتری جلدی ہی موت کی آغوش میں سما گئی۔ اس کے بعد نانک سنگھ کا دل گہری اداسی میں ڈوب گیا۔ محبوبہ کے بعد اس کی سب سے عزیز ہستی اس کی والدہ کو بھی موت کا بلاوا آ گیا۔ دکھوں کے بھنور میں پھنسا نانک سنگھ کئی بری عادتوں کا شکار ہو گیا۔ سگرٹ، شراب اور چوری جیسی بری عادتوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایسے وقت میں اس کی زندگی میں گیانی باگھ سنگھ کی آمد ایک بڑا اہم موڑ تھی۔ اس عظیم انسان کی محبت نے اسے شراب، سگرٹ اور چوری کی دنیا سے باہر نکال کر ہنس راج کے بجائے نانک سنگھ بنایا اور ایک نیا زندگی کا راستہ دکھایا۔ نانک سنگھ میری دنیا میں لکھتا ہے:

> ''گرتے پڑتے دل کے لیے ان دنوں میں اگر کوئی سہارا تھا تو گیانی باگھ سنگھ کی محبت، زندگی موت کا فن تو قدرت کے ہاتھ میں ہے مگر میرا یقین ہے کہ اگر اس وقت مجھے گیانی جی کا تعاون نہ ملتا تو نہ صرف اپنے دل کو ہی سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو جاتا بلکہ میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔''
>
> (میری دنیا صفحہ 70)

گیانی جی کے رابطے میں آنے کی وجہ سے اس کا زندگی کے مثبت پہلو میں یقین پختہ ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جو ڈگمگاتی زندگی کی کشتی کو کنارے لگانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ نانک سنگھ چونکہ خود ایک بھلے انسان سے متاثر ہوا تھا اسلئے اس نے اپنے ناولوں میں چند بھلے انسانوں کی انفرادی و

اجتماعی جدوجہد کو بھی پیش کیا ہے جو معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دور کر کے دنیا کو بدل دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سندر داس اور شانتی (کاغذ کی بیڑی)، سکھبیر اور کامنی (کٹی ہوئی پتنگ)، سفید لہو کا بابا روڈو، ادھ کھِلا پھول کا وریام سنگھ (کال چکر) میں سنت سوم پرکاش، (دور کنارا) میں پیارو۔ (گنگا جل میں شراب) میں ایڈیٹر ملک، (خون کے شُعلے) اور (آگ کا کھیل) میں بابا بھانا دراصل گیانی باگھ سنگھ ہی ہے۔

فنکار نانک سنگھ بچپن سے ہی دوکانداری میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ تجارتی ہیرا پھیری سے اس کا دل باغی تھا۔ آخر اس نے دوکانداری کا کام چھوڑ دیا اور وہاں کے خالصہ اسکول میں مذہب اور موسیقی کا استاد لگ گیا۔ مگر دل یہاں بھی نہ لگا۔ آخر اپنے گورو کے کہنے پر وہ پشاور سے راولپنڈی گیانی شیر سنگھ کی پریس میں چلا گیا۔ گیانی شیر سنگھ ایک ماہنامہ ''گورمت پرچارلڑی'' شائع کرتے تھے۔ مگر نانک سنگھ کا دل اس پریس میں بھی نہ لگا۔ گیانی شیر سنگھ کی گرفتاری کی وجہ سے پریس بند ہو جانے کی وجہ سے نانک سنگھ روحانیت کی تلاش میں امرتسر آ گئے۔ راولپنڈی میں رہتے ہوئے نانک سنگھ کی ملاقات امرتسر کے ایک نرمل مہاتما سے ہوئی تھی اور اس کی محبت میں ہی اس کو خدا کے نام کا وِرد کرنے کی چاٹ لگی۔ اس کا ذکر نانک سنگھ نے میری دنیا میں کیا ہے۔

اس لئے اب اس نے پریس کے جھمیلوں سے نکل کر اسی مہاتما کے درشن کرنے کے لئے امرتسر میں ڈیرہ لگا لیا مگر یہاں کچھ عرصہ قیام کے دوران اس نے اس مہاتما کی اخلاقی گراوٹ والے ایک قصہ کو دیکھا تو اس کی روحانی زندگی کے متعلق بلند خواہشات کا خواب اور محل زمین بوس ہو گیا اس واقعہ سے اُسے صرف اس مہاتما سے ہی نفرت نہیں ہوئی بلکہ اسے ہر ایک سادھو سنت پاکھنڈی اور اداکار لگنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے بہت سے ناولوں میں ایسے سنت مہاتماؤں کے مذہبی، اخلاقی اور اقتصادی پاکھنڈوں کا زبردست مذاق اڑایا ہے جو بظاہر تو پوجا پاٹ کرتے ہیں اور نیکی کی تلقین کرتے ہیں مگر بباطن ان کی زندگی گناہوں کا مجسمہ ہوتی ہے۔ مذہب

کی یہ مروجہ اصلیت زوال پذیر معاشرے میں ایک حقیقت بن کر ابھرتی ہے۔

نانک سنگھ کا دل اُداس ہی رہتا تھا۔ گیانی باگھ سنگھ کے کہنے پر آپ اکالی لہر کے ''گرو کا باغ'' مورچے میں لدھیانہ کے ایک جتھے میں شامل ہو کر لاہور بوسٹر جیل گئے جہاں آپ کی ملاقات ایک سیاسی قیدی پنڈت جگن ناتھ سے ہوئی جنہیں ادبی مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وہیں نانک سنگھ نے منشی پریم چند کے ناول پڑھے۔ یہ ناول پڑھ کر انہیں محسوس ہوا کہ ان کا فن ناول نگار کے طور پر ابھر سکتا ہے۔ اس کی خود کی رائے کے مطابق:

''اس ادب کے بدولت مجھے زندگی کے ایک نئے راستے، ایک نئے موڑ کی جانب
چلنے کی زبردست تحریک ملی۔''

(میری دنیا صفحہ 88)

منشی پریم چند کے ناول پڑھ کر نانک سنگھ کے دل میں ناول نگار بننے کی امنگ پیدا ہوئی اور ساتھ ہی معاشرے کے لئے کچھ کرنے کی خواہش بھی اس کے دل میں جاگی۔ وہ خود مانتا ہے کہ:

''اس تحریک نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ اب تک میں جو کچھ کرتا رہا وہ اندھیرے میں
بھٹکنے یا ہوا میں لٹھ چلانے جیسا ہی عمل تھا۔'' (میری دنیا صفحہ 88)

جیل میں ہی نانک سنگھ نے ''ادھ کھِلی'' نام کا مختصر ناول تخلیق کیا۔ پھر جیل سے رہا ہو کر چار مختصر ناول تخلیق کئے۔ ان کا اصل تخلیق کا دور ۱۹۲۹ء سے مانا جاتا ہے جب انہوں نے سفید خون نام کا ناول تحریر کیا۔

نانک سنگھ نے اپنے دورِ زندگی میں گوربخش سنگھ پریت لڑی کا اثر بھی قبول کیا۔ وہ پریت قافلے کا بننے والا پہلا ممبر تھا۔ وہ آٹھ سال پریت نگر رہے لکھتے ہیں:

''گوربخش سنگھ ایسا انسان ہے جس کے تعلق میں میں نے پورے آٹھ سال
گزارے۔ نتیجتاً نہ صرف میری طرزِ تحریر نے اس کا اثر قبول کیا بلکہ میری ذات نے

بھی۔''

(میری دنیا صفحہ 109)

اسے گوربخش سنگھ کے پریت فلسفے، وسیع المشربی، وسیع سماجی نظریے، معاشرے کے لئے کچھ کرنے کی لگن، ایک خوبصورت دنیا کا تصور وغیرہ خیالات نے متاثر کیا اور یہ خیالات اس کے ناولوں میں جا بجا موجود ہیں۔ نانک سنگھ نے گوربخش کے قول وفعل میں تضاد دیکھا مگر وہ گوربخش سنگھ کے افکار و خیالات، اصول وضوابط سے تو متاثر ہوا۔ شخصیت کے اثر سے دور رہا۔ نانک سنگھ ایک حساس اور جذباتی انسان تھا جس کا خواب ایک بہتر معاشرے کی تشکیل تھا۔ وہ اچھے انسانوں کا قدردان تھا۔ اس کی دوستی کے دائرے میں شوبھا سنگھ آرٹسٹ اور بلراج ساہنی جیسے فنکار شامل تھے۔

نانک سنگھ اپنے عہد کی تحریکات، حادثات اچھے یا برے سے متاثر ہوا۔ سنگھ سبھا لہر، جلیاں والے باغ کا سانحہ، اکالی آندولن، ہندو مسلم فساد اور وطن کی تقسیم کے اثرات، سفید خون، ادھ کھلا پھول، غریب کی دنیا، پیار کی دنیا، آگ کا کھیل، خون کے سوہیلے، منجھدار اور چتر کاری ناولوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ادب کی تخلیق میں مواد ادیب کا تجربہ ہوتا ہے مگر جب ہم تجربے کی فطرت کی تشریح کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں:

''تجربہ اصل زندگی کے کسی واقعے، کردار یا چیز کے تئیں ادیب کا ذاتی ردِعمل ہے۔''

(ونود۔ ٹی۔ آر (ڈاکٹر) ساہت اتے چنتن صفحہ 109)

اسی بات کو ڈاکٹر جوگندر سنگھ راہی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''دراصل ہر اچھے ناول میں مشکل تجربہ ایک طرح سے اپنے اوپر گزرا ہوا تجربہ ہوتا

ہے۔گزرا ہوا تجربہ اپنے بنیادی روپ میں بالکل غیر متشکل نہیں ہوتا بلکہ ابتدا سے ہی

اس کی خام شکل کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔'' (پنجابی ناول صفحہ 19)

مندرجہ بالا ناقدین کی رائے کے مطابق ادب کا مواد، حقیقت کا وہ جُز ہے جو ادیب کے ذریعے دیکھا، پرکھا اور طے کیا جاتا ہے۔ادیب کا تخلیقی نظریہ اس کام میں بھی جاری رہتا ہے۔اس لئے کوئی بھی تخلیق ادیب کے نظریے یا زندگی کے فلسفے سے آزاد نہیں ہوسکتی۔ادیب کا نظریہ طے کرتے وقت اس کی کل تخلیق کا مطالعہ ضروری ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ادیب کس قسم کے اثرات کے زیرِ اثر نظریے میں تبدیلی کا حامل ہوا ہے۔

ادیب کے نظریے کے پسِ پشت تین قسم کے اثرات کام کرتے ہیں۔اخلاقی اقدار، ماحول اور تجربہ۔یہ تین محرکات مل جل کر ایک نئی تخلیق کو جنم دیتے ہیں جسے ہم ادیب کا نظریہ کہتے ہیں۔

دراصل نظریے کو طے کرنے والے یہ تین اثرات ناول نگار کے ان معاشرتی حالات میں ہی موجود ہوتے ہیں جن میں رہ کر ناول نگار ناول کی تخلیق کرتا ہے۔وہ اپنی دلچسپی اور فن کے مطابق ان اثرات کا کوئی جُز قبول کر کے اسے اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔ناول کو انہیں مفاہیم میں زندگی کا آئینہ یا عکس کہا جاتا ہے۔سو کسی ناول نگار کا زندگی کا نظریہ طے کرتے وقت نہ صرف اس کی تخلیقات میں موجود نظریات کا فیصلہ کرنا چاہئے بلکہ اس کا تعلق ناول نگار کے ہمعصر نظریات کے ساتھ بھی جوڑنا چاہئے۔

نانک سنگھ کے متوسط معاشرے میں مذہبی اصلاحی تحریکات کے علاوہ پنجاب کی منڈیوں، قصبوں اور شہروں میں گاندھی وادی قومی تحریک بھی اپنے پاؤں جما رہی تھی۔اس کے علاوہ روسی معاشرتی انقلاب کے زیرِ اثر معاشرتی افکار بھی بیدار ہونے لگے تھے۔کچھ مغربی اعلیٰ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے نوجوان فرائڈ کے نظریے سے متاثر ہو کر جنسی آزادی کو بھی اپنا رہے تھے لکھتے ہیں

نانک سنگھ کا دور مذہبی دور تھا کیوں کہ سائنس کو اس قدر وسعت نہیں ملی تھی کہ ہم اسے سائنسی دور کا نام دے سکیں۔ جب پنجابی ناول کے ابتدائی نقوش کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی ناول کی تخلیق مذہبی تاریخی اعتبار سے کی گئی تھی۔ ان ناولوں کا پس منظر اور تحریک وہ مذہبی تحریکات تھیں جن کا مقصد مذہبی اقدار کی بازیافت تھا۔ سکھ مذہب زوال پذیر تھا اور اس میں ظاہری رسم ورواج شامل ہو رہے تھے۔ مذہب کے باطنی اثرات کی بجائے ظاہری اثرات کا بول بالا زیادہ تھا۔ عوام پرستی کا شکار ہو کر گمراہ ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں ابتدائی ناول نگار مذہبی بازیافت کی طرف مڑے اور ناول کو اپنے مقصد کے حصول کا آلہ بنایا۔

ابتدائی دور کا پنجابی ناول سکھ مذہب کی اقدار کو قائم رکھنے کے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا۔ ان کے پس منظر میں سنگھ سبھا لہر کے اصول کارفرما تھے جو صاف طور پر سکھ مذہب کی نابود ہو چکی مذہبی اور سیاسی خوبصورتی کو پھر قائم کرنے کے لئے بے چین تھے لکھتے ہیں:

''یہ اپنی حکومت کھو چکی سکھ قوم کی تحریک تھی جسے غلامی کے حالات کا دکھ تو تھا مگر علاج سمجھ نہیں آتا تھا۔''

(سیکھوں سنت سنگھ، بھائی ویر سنگھ اتے اوہنا دا یگ، صفحہ 98-97)

اس لئے اس تحریک نے پوجا پاٹھ اور مذہبی راہ وریت کی تبلیغ کو ہی اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ پنجابی کے اولین ناولوں میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں سکھ مذہب کی فوقیت بتلائی گئی ہے اور دوسرے مغربی اثرات کی مذمت بھی۔ بنیادی اعتبار سے یہ ناول فرقہ پرستی کی حدود میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے متعلق ڈاکٹر جوگندر سنگھ راہی یوں رقمطراز ہیں:

ان ناولوں کا تخلیقی نظریہ سکھ معاشرے کے ماضی یا حال کا شعور بخشنے کی بجائے فرقہ وارانہ احساس برتری کی نظریاتی یا ملت یا مذہبی نشانات کی نظریاتی تخلیق یا عقیدے

کی مضبوطی کے لئے تدبیر کرنے کی جذباتیت میں سکڑ کر رہ جاتا ہے۔''

(راہی جوگندر سنگھ (ڈاکٹر) پنجابی ناول، صفحہ 159)

نانک سنگھ کی تخلیقِ ناول کی ابتدا سے ہی چاہے بھائی ویر سنگھ کے ابتدائی مذہبی دور کا خاتمہ اور حقیقت پسندی دور کی شروعات ہوتی ہے مگر نانک سنگھ مذہبی عقیدے کے نظریات سے آزاد نہیں ہوتا۔ اس کا مذہب کے باطن میں یقین تھا اور اس کے متعدد ناولوں میں یہ مذہبی نظریہ دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں سے یہ فرق ضرور ہے کہ ابتدائی ناول اگر نظریاتی عقیدے تک محدود تھا وہیں نانک سنگھ نے اسے تنگ نظری، جانبداری اور فرقہ وارانہ نظریات سے آزاد کر کے وسعت عطا کی۔ جبکہ ڈاکٹر راہی کی رائے ہے کہ لکھتے ہیں

''اس کا تخلیقی نظریہ مذہبی رواداری ہے مگر مذہب مخالف نہیں۔''

(راہی جوگندر سنگھ (ڈاکٹر) پنجابی ناول، صفحہ 163)

وہ ہر مسئلے کا حل انسانوں کے کایا کلپ میں تلاش کرتا ہے جو مذہبی عقیدے کی بنیاد ہے۔ ویسے مذہبی روا داری کے جو معنی ہندوستانی دانشوروں نے لئے ہیں ان پر نانک سنگھ کھرا اُترتا ہے۔ اسلئے وہ مذہبی طور پر روادار تو ہے مگر مذہب مخالف نہیں ہے۔

نانک سنگھ اپنے ابتدائی ایام زندگی میں ہندو خاندان سے تھا پھر وہ پشاور سے تعلق رکھتا ہے جہاں مذہبی منافرت نہیں تھی۔ پشاور میں عام طور پر مرد گوردوارے جاتے تھے اور عورتیں مندر جاتی تھیں اسلئے اس کے خون میں ملے جلے تمدن کی بو تھی۔ کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار کو ترک کر کے خدمتِ خلق، رحم، محبت، خودداری، ایثار اور انکساری جیسے اوصاف اپنا لئے۔ اس نے سکھ مذہب اپنایا اور اس کے اثرات کے زیرِ اثر کسی خاص کٹر نظریہ کا حامل نہ بنا۔ وہ کسی خاص فکری یا اخلاقی نظریے کا پیروکار بننے کی جگہ انسانیت کو سب سے اعلیٰ مذہب سمجھتا تھا۔ اس کا یقین بنیادی انسانی جذبے میں تھا۔ اس نظریے سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ناولوں میں دھرم

ادھرم اور پاپ پُن کے مسائل پیش کئے ہیں مگر مذہبی عقیدے کا پرچار نہیں کیا بلکہ مذہب کے متعلق ان باتوں کا خلاصہ پیش کیا ہے جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔اس نے غیر جانبداری سے تمام مذاہب کی اعلیٰ اقدار کی تعریف کی غیر مذہبی رسوم کی مذمت کی ۔نانک سنگھ نے خود اعتراف کیا ہے لکھتے ہیں

''میں مذہبی ہوتے ہوئے بھی فرقہ پرست نہیں ہوں فرقہ پرست آدمی کبھی بھی مذہبی نہیں ہوسکتا۔''

(میری دنیا صفحہ 234)

اس کا یقین اس مذہب میں تھا جو انسانیت کے حق میں ہو اور اُسے اونچا اٹھائے نہ کہ مذہب کے نام پر اُسے پامال کرے۔

نانک سنگھ فرضی جنت، دوزخ یا تناسخ (آواگون کے چکر) کو نہیں سمجھتا بلکہ اس کے مطابق تو:

''مذہب ایک ایسے ذاتی رشتے کا نام ہے جو ہماری زندگی میں شامل ہو کر ہمارے اندر مسرت و انبساط پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔جب ہم (باطن کی پاکی کے لئے) کسی مذہبی مقام پر جاتے ہیں تو ہمارے حواس میں ایک خاص قسم کے وجد، انکساری اور پاکیزگی کا احساس جاگنے لگتا ہے۔'' (میری دنیا صفحہ 233)

یعنی مذہبی مقامات پر جانے کا مطلب یہ نہیں کہ خدا ہم پر مہربان ہو کر ہمارے گناہوں کو بخش دے بلکہ وہاں جا کر کلام پڑھنے سے روحانی سکون ملتا ہے۔

نانک سنگھ کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کے عقیدے کا حامی نہیں بلکہ وہ معاشرے میں رہ کر انسانیت کے دکھ درد کو بانٹنا سب سے بڑا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔انہیں عقائد پر پورا اترتا گیانی باگھ سنگھ جیسے مثالی کردار جو بھی ناولوں میں پیش کئے وہ انہیں اوصاف کے مالک تھے۔ چاہے وہ کردار خصوصی اوصاف کی وجہ سے آئندہ روپ

دھارن کرتے ہیں مگراس سے نانک سنگھ کا مثبت انسانی اقدار میں کامل یقین ظاہر ہوتا ہے۔اس طرح نانک سنگھ نے مذہب کوانسانی فلاح کے معنی ومفہوم میں بیان کرتے ہوئے ان خدا کے منکروں کی بھی تعریف کی جو مذہبی رسوم وقیود میں یقین نہیں رکھتے مگر ایثاروقربانی کے لئے ہرلمحہ تیار رہتے ہیں جیسے ''آستک ناستک'' کا ایک کردار راج سنگھ۔اس کے برخلاف مذہبی رسوم کے پابند کردار کی حد سے زیادہ مذمت کی ہے جو پاکھنڈی، لالچی اور مطلبی ہیں جیسے ''پیار کی دنیا'' میں اونکار ناتھ۔اس نے اچھے کرداروں کے ذریعے مثبت انسانی اقدار،قول وفعل کی یکسانیت اوراس کے اعلیٰ اطوار کو پیش کیا ہے۔ یہ کردار ادیب کی ستیم،شوم،سندرم عقیدے کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس طرح مذہبی نظریے سے نانک سنگھ، بھائی ویر سنگھ کی روایت سے ٹوٹتا نہیں بلکہ اسی روایت کو بدلے ہوئے نظریے کے ساتھ آگے لے جاتا ہے۔ بنیادی اعتبار سے وہ متوسط طبقے کا اصلاحی اور رومانی تحریک کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہےاور وسطی عہد کے مذہبی عقیدے کے زیرِ اثر معاشرتی اصلاح کا تصور پیش کر کے ہر مسئلے کا حل حالات کی تبدیلی کے بجائے شخصی تبدیلی میں تلاش کرتا ہے۔

یہ دور پنجاب میں جدوجہد آزادی کے علاوہ ایک قسم کا اصلاحی دور تھا جب معاشرے میں کئی برائیاں جگہ پا چکی تھیں جیسے عورتوں کے تعلق سے پیدا ہوئی کشمکش کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوئے مسائل۔بچپن کی شادی، بے میل شادی، ایک سے زیادہ شادیاں،لڑکیوں کوفروخت کرنے کا رواج، بیوہ عورتوں کے مسائل۔اس کے علاوہ،فرقہ پرستی، چھوت چھات، ذات پات کی تفریق جیسی ناپسندیدہ روایات کا بول بالا تھا۔

ملک کے اس معاشرتی وتمدنی ماحول کومغربی اثرات نے جھنجھوڑا۔مغربی تعلیم کے زیرِ اثرعوام میں سماجی بیداری آئی۔مغربی تہذیب کے پھیلاؤ کے ساتھ سائنسی نظریہ پھیلنے لگا جس سے زندگی کی نئی اقدار نے جنم لیا اور نئے افکار نے جگہ پائی۔

پنجاب میں کئی مذہبی تحریکیں ، آریہ سماج، سنگھ سبھا لہر اور اکالی لہر وجود پذیر ہوئیں جن کا خاص مقصد مذہبی، سیاسی اور سماجی بے راہ رویوں کو نیست و نابود کرنا تھا۔

نانک سنگھ بھائی ویر سنگھ والے قومی جذبے سے آزاد تھا۔تخلیق کی دنیا مذہبی رواداری والی دنیا تھی جس میں ذات پات، مذہب یا نسل کی بنیاد پر کوئی تفرقہ نہیں تھا بلکہ وہ ہندو، مسلم، سکھ کا سانجھا جہاں تھا جو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔جان قربان کرتے تھے سارے دکھاوے کے رسوم و قیود کو ختم کر دیتے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ

''پلاٹ خواہ مختلف ہوں مگر مقصد تمام تخلیقات کا ایک ہی رہا ہے، ہندو، مسلم، سکھ کی یکجہتی کی تمنا اور فرقہ پرستی کی خطرناکیوں سے چوکنے رہنے کی ترغیب۔''

(میری دنیا،صفحہ185)

نانک سنگھ نے ہندو مسلمان ایکتا کی وکالت کی یہاں تک کہ اس کے مسلم کردار ہندوؤں سے بلند اخلاق کے مالک ہوتے ہیں جیسے احمد خان (ادھ کھلا پھول) کرم دین (غریب کی دنیا) رحیم بخش (خون دے شعلے)وغیرہ مگر ملک کی تقسیم نے نانک سنگھ کے حساس دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس کے ردِعمل پر اس نے مندرجہ بالا چار ناول لکھے جو اس کے ضمیر کی آواز تھے۔

نانک سنگھ کسی بھی 'ازم' سے وابستہ نہیں تھا مگر وہ انسانیت کے تخلیقی نظریہ سے آزاد نہیں تھا۔اس کی تخلیق کا مقصد اور مذہب اور سب کچھ انسانیت تھا جس کی فلاح کے لئے وہ آئیڈیل تخلیق کرتا تھا۔اس کے اپنے الفاظ میں رقمطراز ہیں:

''میں اور میرا سماج، میں اور میرا انسانی جذبہ، ہم ایک دوجے میں ایسے جذب ہیں کہ ان سے علاحدہ ہوکر میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔'' (میری دنیا،صفحہ246)

المختصر نانک سنگھ کے انسانی نظریے کی وجہ سے ہی اس کا مقابلہ فرانیسسی ناول نگار بالزاک کے ساتھ کیا
جاسکتا ہے۔

☆☆☆

امرتا پریتم حیات اور کارنامے

گیان پیٹھ ایوارڈ (۱۹۸۲) حاصل کرنے والی امرتا پریتم پنجابی ادب کی وہ ادیبہ ہے جس نے اپنے جذ
بات کو الفاظ کے ذریعے اظہار کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔امرتا پریتم نے گیت،نظمیں لکھ کر انسانی زندگی کے مختلف
پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔مستقبل میں نہ مٹنے والی تصویر کی تخلیق کرتی ہے۔اس طرح امرتا پریتم ۳۱ اگست ۱۹۱۹
ءمیں دریائے چناب کے کچھ فاصلے پر آباد گجرانوالہ شہر میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام کرتار سنگھ ہتکاری اور
والدہ کا نام راج بی بی تھا۔کرتار سنگھ اسکول میں پنجابی کے اُستاد تھے اور ایک گُردوارے کے پرکھ بھی تھے ر۔وہ

جذبۂ انسانیت کے مالک اوراوراچھے مصنف تھے۔ پہلے برج زبان میں لکھتے تھے اور پھر پنجابی میں لکھنے لگے ۔رات کوتحریری کام کرتے اور دِن میں سوتے رہتے ۔امرتا پریتم صرف گیارہ برس کی تھیں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔لاہور میں کتابوں سے بھرے گھر میں امرتا اپنے والد سے پنجابی پڑھتی رہیں اور ساتھ ساتھ سکھ گروؤں کی بانی اورصوفی منظوم کہانیوں کی تعلیم ملی ۔ماں کی ممتا بھری یاداوراپنی تنہائی سے امرتا پریتم کی شاعری اُبھرکرسامنے آئی ۔اُسکے والد نے ہمیشہ مذہبی شاعری کی تلقین کی ۔لیکن اُس نے اپنی مرضی کی شاعری پرعمل پیرا ہونا شروع کردیا۔امرتا پریتم کا نہ کوئی بھائی بہن اور نہ کوئی رشتہ دار تھا۔اُس نے اپنے آپ کو چاروں طرف کتابوں سے گھیر رکھا تھا۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

''مجھے ایسامحسوس ہورہاتھا کہ میں خودایک کتاب ہوں ۔مگرکورے کاغذوں والی
کتاب میں نے اس کتاب کے سامنےBlank papersپرلکھنا شروع کیا''

(امرتا پریتم،لال گلاب،صفحہ۲۸)

تقسیمِ ملک سے پہلے امرتا پریتم کی ملاقات بہت بڑے شاعروگیت کارساحرلدھیانوی سے ہوئی اوران سے عشق میں گرفتار ہوگئی لیکن ان کی محبت معاشرتی مشکلات کی وجہ سے پروان نہ چڑھ سکی اور ساحر ہمیشہ اُداس رہنے لگے۔ بدقسمتی سے ساحر کے گھر والوں نے امریتا کومذہبی عقائدکی بناپرقبول نہ کیا۔امرتا پریتم کی شادی پریتم سنگھ سے ہوئی اور۱۹۳۶ء میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ لاہور چلی گئی۔امرتا پریتم نے کبھی اپنے گھر والوں کی مرضی سے کی ہوئی شادی کو دِل سے قبول نہ کیا۔ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوش گوار ثابت نہیں ہوئی اوران کو دِل کو سکون اُس وقت ملا جب انہوں نے اپنے خاوند سے۱۹۶۰ء میں طلاق لی۔ پھران کی ملاقات مشہور ومعروف مصورامروز سے ہوئی اورآہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے اور کچھ عرصے بعد دنوں رشتہ ازدواج میں منسلک رہے۔

امرتا پریتم صرف گیارہ برس کی تھی انہوں نے اپنی پہلی نظم لکھی ۔جب وہ اسکول جارہی تھی اُس کے والد نے یہ نظم بستے سے نکالی۔اس بارے میں امرتا اپنی کتاب ''کرچی لکیریں''میں رقمطراز ہیں:

''اُس کے والد نے رعب دار لہجے میں پوچھا؟ یہ نظم تو نے لکھی۔نہیں میں نے نہیں لکھی۔میری سہیلی نے لکھی ہے۔مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ہونٹ بھی کانپنے لگ گئے ۔والد نے میرے کانپتے ہوئے ہونٹوں میں میرے جھوٹ کو پکڑ لیا اور میرے بائیں رُخسار پر پورے زور سے تھپڑ رسید کر دیا جھوٹ بولتی ہو یہ نظم آپ نے لکھی ہے ۔منہ سے کچھ نہ بولا گیا۔یہ راجن کون ہے؟ پتہ نہیں.......میں ڈر حقیقت سچ بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا انہوں نے اگلے پل میں لکھا ہوا کاغذ ریزہ ریزہ کر دیا اور میں روتی ہوئی سکول چلی گئی ۔اس طرح میں اپنی پہلی نظم لکھ کر دوسرے کے نام چھپوانا چاہتی تھی۔لیکن دوسرے کا نام برداشت نہیں ہوا بلکہ اس کے عوض مجھے تھپڑ کھانا پڑا''

(امرتا پریتم' کرچی لکیریں،صفحہ۱۷)

اس طرح ایک شاعرہ نے جنم لیا۔جس نے اپنی نظم کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔شروعاتی دور میں اپنا نام اور اپنا کام بھی چھپاتی تھی ۔ان کے والد پہلے انسان تھے جنہوں نے اس کو پہچان لیا اور حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کو نظمیں لکھنے کا شعور بخشا۔عروض کی باریکیوں سے شناسا کر دیا۔خُدا کے ساتھ محبت اور انسانی زندگی کے غم والم کو برداشت کرنا سکھایا ۔اس طرح امرتا پریتم نے اپنے والد کی رہنمائی میں نظم لکھنی شروع کی ۔سب سے پہلے انہوں نے نظمیں لکھیں پھر جذبۂ حب الوطنی کی بعد ازاں سماجی زندگی کے متعلق لکھا اس طرح ایک شاعرہ نے جنم لیا جس نے نظم کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔شروعاتی دور میں اپنا نام اور اپنا کام بھی چھپاتی تھی۔ان کے والد پہلے انسان تھے

جنہوں نے ان کو پہچان لیا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔عروض کی باریکیوں سے شناسا کیا ۔خُدا کے ساتھ محبت اور انسانی زندگی کے غم والم کو برداشت کرنا سکھایا۔اس طرح امرتا پریتم نے اپنے والد کی رہنمائی میں نظم لکھنی شروع کردی۔سب سے پہلے مذہبی نظمیں لکھیں اور پھر جذبۂ حب الوطنی کی بعدازاں سماجی زندگی کے متعلق نظمیں لکھیں ۔امرتا پریتم بہت بڑی شاعرہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔۱۹۴۷ء میں جب پنجاب کی سرزمین خون سے بھری پڑی تھی۔ ہرطرف ظلم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔امرتا پریتم نے ایک ایسی لازوال نظم لکھی جو آنے والے وقتوں میں پنجابی زبان کا سرمایہ کے طور پر ہمیشہ دہرائی جائے گی۔ان کی نظم کے چند مصرعے پیش کئے جارہے ہیں:

آج آکھاں وارث شاہ نوں ،کتوں قبراں وچوں بول

تے اج کتابے عشق داکوئی اگلا ورقہ پھول

اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لِکھ لِکھ مارے وَین

اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث نوں کہن

اٹھ دردمنداں دیا دردِیا،اٹھ تک کر اپنا پنجاب

امرتا پریتم کو بابا فرید،شاہ حُسین، بُلّے شاہ،ٹیگور سے خاص عقیقدت تھی ان کے گھر میں امروز کی بنائی ہوئی تصویریں موجود تھی اوران کے کمرے میں بُلّے شاہ اور سلطان باہو کے مزاروں کی چادروں سے سجا ہوا تھا۔امرتا پریتم کی زندگی کے نظریات قدرے مختلف ہیں۔موصوفہ کی کتابوں ''رسیدی ٹکٹ''،''کرچی لکیریں ''اور''کالا گلاب''میں اپنے جنم،والدین کی رہنمائی اور گریلو زندگی کی عکاسی کی ہے۔پنجاب کی پہلی اعزازیافتہ خاتون شاعری کے بعد کہانی کار،ناول نگار،مضمون نگار کے طور سے جانی جاتی ہے۔امرتا پریتم نے تقریباً ۶۰ سال میں قلمی سفر جاری وساری رکھا۔ان کی بعض کتابوں کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی کیا جاچکا ہے۔ان کی تمام

تحریر کردہ تمام کتب کا ذکر کرنا تو مشکل ہے لیکن ان کی چند اہم کتب جن کا ذکر 'امرتا پریتم نمبر' میں ہے وہ اس طرح ہے:

شعری مجموعے:

ٹھنڈیاں کرناں (۱۹۳۵) امرت لہراں (۱۹۳۶) جیوندا جیون (۱۹۳۹)

تریل دھوتے پھول (۱۹۴۱) او گیتاں والیا (۱۹۴۲) بدلاں دے پلے وچ (۱۹۴۳)

سجھ دی لالی (۱۹۴۳) نکی جیہی سوغات (۱۹۴۴) لوک پیڑ (۱۹۴۴)

پتھر گیٹے (۱۹۴۶) لمیاں واناں (۱۹۴۷) میں تواریخ ہاں ہندوی (۱۹۵۰)

سرگھی ویلا (۱۹۵۱) سنیہڑے (۱۹۵۵) اشوکا چیتے (۱۹۵۷)

کستوری (۱۹۵۹) ناگ منی (۱۹۶۴) کاغذ تے کینوس (۱۹۷۰)

کہانیوں کے مجموعے:

چھبی ورھے بعد (۱۹۴۳) کنجیاں (۱۹۴۴) آخری خط (۱۹۵۶)

گوجر دیاں پریاں (۱۹۶۰) چانن دا ہوکا (۱۹۶۲) جنگلی بوٹی (۱۹۶۸)

اجنبی (۱۹۷۰) ہیرے دی کنی (۱۹۷۷) لٹیاں دی چھوکری (۱۹۷۷)

پنج ورھے لمبی سڑک (۱۹۷۸) اک شہر دی موت (۱۹۷۸) تیسری عورت (۱۹۷۸)

نثر نگاری:

بھارت دے اسریئے (۱۹۵۸) | موم بتیاں دے بھید (۱۹۶۰)

کرچی لکیریں (۱۹۶۳) | کالا گلاب (۱۹۶۸)

سفرنامہ (۱۹۷۳) | عورت اک درشٹی کون (۱۹۷۵)

اِک اداس کتاب (۱۹۷۶) | اپنے اپنے چار ورھے (۱۹۷۸)

کیہڑی زندگی کیہڑا ساہت (۱۹۷۹) | کچے اکھر (۱۹۷۹)

اک ہتھ مہندی اک ہتھ چھالا (۱۹۸۰) | محبت اک دشٹری کون (۱۹۸۰)

میرے کال مکت سمکالی (۱۹۸۰) | شوق صراحی (۱۹۸۱)

عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے (۱۹۸۶) | نو پھل بے اتھا (۱۹۸۸ ہندی)

اکشد کنڈلی (۱۹۸۸ ہندی) | من مرزا تن صاحباں (۱۹۹۰ ہندی)

یہ قلم یہ کاغذ یہ اکھشر (۱۹۹۰ ہندی) | ست مسافر (۱۹۵۵)

سفرنامے:

باریاں جھروکے (۱۹۶۱) | اگ دیاں لیکاں (۱۹۶۹)

اِک پیتاں دا گلاب (۱۹۷۳)

سوانح:

رسیدی ٹکٹ (۱۹۷۶)

دستاویز (امرتا امروز دے خط)

لال دھاگے دا رشتہ امرتا دے سپنے (۱۹۸۹)

ترتیب و تالیف:

نئی دُنیا ماہنامہ میگزین (۳۸۔۱۹۳۷)

ہتکاری (جون ۱۹۴۷)

ناگ منی (ماہنامہ مئی ۱۹۵۲)

پنجابی دی آواز (لوگ گیت ۱۹۵۵)

آسماں (دنیا کے لوک گیت ۱۹۶۰)

اج دی پنجابی کویتا (۱۹۷۲)

گیتاں دی چنگیر (۱۹۷۲)

دردمنداں دیاں آہیں (نظمیں ۱۹۷۴)

پوڑیاں (۱۹۷۹)

انگریزی میں ترتیب و تالیف:

پنجابی پوئٹری (۱۹۷۴)

تراجم:

تیاگ پتّر (جین اندر کا ناول ۱۹۵۵)

خودنوشت (۱۹۵۸)

جیوی (۱۹۶۳)

تامل کہانیاں (۱۹۷۱)

جرمن ساہت دی پرمپرا (۱۹۷۳)

ناول:

ڈاکٹر دیو	پنجر	آلھنا
اشوکا	اک سوال	بند دروازہ
رنگ دا پتہ	چک نمبر چھتی	دھرتی ساگر دی سپیاں
پکی حویلی	جیب کترے	جلاوطن
اگ دی لکیر	کچی سڑک	ایہہ سچ ہے
تیرھواں سورج	کورے کاغذ	ہرت داز زندگی نامہ
نہ رادھا نہ رکمنی	اک دا بوٹا	کوئی نہیں جاندا
اوہناں دی کہانی		

اعزازات وانعامات:

امرتا پریتم کو اپنی قابلیت اور کارناموں سے بہت سارے انعامات سے نوازہ گیا۔ امرتا پریتم پہلی خاتون ہیں جن کو (۱۹۵۶) میں ساہتہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ ۱۹۶۹ء میں بھارت کا بہت بڑا ایوارڈ پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازہ گیا بہت ساری یونیورسٹیوں مثلاً دِلی یونیورسٹی (۱۹۷۳) جبل پور یونیورسٹی وغیرہ سے ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگریوں سے نوازہ گیا۔

آخر کار ۸۳ سال کی عمر میں امرتا پریتم کو گرنے کا حادثہ پیش آیا اور آستہ آہستہ چلنے پھرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی اور دیوالی کے دِن ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں اس جہان فانی سے رُخصت ہوگئی۔

اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے امرتا پریتم نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔ان کی تخلیقات کا دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جیسے ہندی، انگریزی، اُردو، مراٹھی، سندھی، روسی جاپانی، اسامی وغیرہ۔ان کے ادب کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کی امرتا پریتم نے اندرون اور بیرون کے ادباء میں اپنا مقام بنایا ہے۔کئی حضرات نے ان کے ادب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔انہوں نے خود بھی ٹالسٹائے، وان گاگ، ٹیگور، گور بخش سنگھ، سعادت حُسین منٹو اور کرشن چندر وغیرہ کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔امرتا پریتم نے اپنی تخلیقات میں ہندی، بنگالی، اُردو، مراٹھی، تامل کے ادباء کی کتابوں کے جابجا حوالے دے کر اپنی تحریروں کی خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے۔ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ محبت ہے۔محبت کے متعلق جتنا ذکر امرتا پریتم نے کیا ہے اتنا کسی اور پنجابی ادیب وشاعر نے نہیں کیا۔نظریاتی طور پر امرتا پریتم کی شاعری مجموعی طور پر عورت کے مسائل کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔عورت محبت کی بناء پر آئے دن مشکلات اور تذبذب کا شکار رہتی ہے۔محبت کے راستے میں مشکلات میں گرفتار ہونا ان کی شاعری کا خاص محور ہے۔امرتا پریتم اپنی تخلیقات کی بناء پر زندگی نہیں گزارتی بلکہ زندگی کے تلخ تجربات کو اپنی شاعری میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔شروع میں بطور شاعرہ نام کمایا پھر ناول نگاری کی دُنیا میں قدم رکھ کر نمایاں کارنامے انجام دیتی رہی اور ناول نگاری کی دُنیا میں تہلکہ مچا دیا۔۱۹۴۶ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان لکھے گئے مشہور ناول اس طرح ہیں:

جے شری (۱۹۴۶)	ڈاکٹر دیو (۱۹۴۹)	پنجر (۱۹۵۰)
اک سوال (۱۹۵۹)	بلاوا (۱۹۶۰)	بند دروازہ (۱۹۶۱)

رنگ دا پتہ (۱۹۶۵)	دل دیا گلیاں (۱۹۶۸)	ایکتا تے ایریلی (۱۹۶۹)
جلاوطن (۱۹۷۰)	پکی حویلی (۱۹۷۲)	اگ دی لکیر (۱۹۷۳)
کچی سڑک (۱۹۷۴)	کوئی نہیں جاندا (۱۹۷۵)	اونہاں دی کہانی (۱۹۷۵)
کورے کاغذ (۱۹۲۸)	وغیرہ قابل ذکر ہیں۔	

امرتا پریتم کے تحقیق وتنقید کے اہم مضامین نفسیاتی کے متعلق ہیں۔اب ان کے مشہور ناولوں کی تخلیص دی جارہی ہے جس سے ان کے ناولوں میں کیا کیا موضوعات تھے بخوبی پتہ چل سکے۔

بے شری:

امرتا پریتم کا یہ پہلا ناول ہے جوشہری زندگی کے بارے میں ہے۔اس میں ایسی عورت کے جذبات کو اجاگر کیا گیا ہے جوروپے سے بنا ہوا شوہر نہیں چاہتی۔وہ ایسے سماج،ایسے انسان اور ایسے رسم ورواج سے نفرت کرتی ہے جوایسی شادی کو تجارت قرار دیتی ہے۔وہ ایسی شادی کو سودے بازی کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔اس ناول میں اہم ہیرو اور ہیروئن بے شری کے درمیان پیار کی داستان ہے۔ہیروئن کی اس کی مرضی کے خلاف سریش سے منگنی کر دی جاتی ہے۔بمبئی جاتے ہوئے اچانک سفر میں اُن کی ملاقات ہوجاتی ہے تو ملاقات اور بات چیت کے بعد دوریاں ختم ہوجاتی ہے۔مصنفہ نے اس ناول میں جہیز کی لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ناول میں زیادہ رومانی پہلو نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر دیو:

یہ امرتا پریتم کا دوسرا ناول ہے۔جس میں بیاہ شادی،محبت،پیار اور سماجی بُرائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے

۔اس کے اہم کردار ڈا اور ممتا ہیں۔ڈاکٹرا اور ممتا دونوں باہمی تعلقات کی بناء پر شادی کر لیتے ہیں جس کو سماج قبول نہیں کرتا۔اگر چہ شادی مذہبی رسومات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ان کی شادی زیادہ دیر تک قائم اس لیے نہیں رہتی کیونکہ معاشرہ ایسی شادی کو تسلیم نہیں کرتا۔سماج کے لوگ ایسی شادی کو کھیل سمجھتے ہیں۔شادی سے پہلے کے تعلقات کی بناء پر ان کے یہاں بیٹا جنم لیتا ہے۔اس ناول میں امرتا پریتم نے انسان کی سوچ اور زندگی کے ساتھ جُڑے ہوئے مسائل کو عیاں کیا ہے۔یہ ناول مسائل زمانہ، مصائب، اور پریشانیوں کا مرکز معلوم ہوتا ہے۔

پنجر:

تقسیم وقت کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول اپنی مثال آپ ہے۔جو تقسیم وطن کے سانحہ کی المناک کہانی بیان کرتا ہے۔اس ناول میں امرتا پریتم نے ایک اغوا کی گئی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔جس کو اس کے والد، والدہ قبول نہیں کرتے ہیں۔اس ناول میں پشت در پشت ہورہے عورت پر مظالم کو اُجاگر کیا ہے۔اور بدلے کی آگ میں پارو ہمیشہ پنجر بن کر رہ جاتی ہے۔پارو جو ایک پرانی دشمنی کا شکار ہو جاتی ہے۔جو اس کے خاندان کی مسلمانوں کے ایک خاندان کی دونسلوں پہلے سے چلی آرہی ہے۔اگر کسی نے پھوپھی اغوا کر لی تو انتقامی جزبہ کے تحت کسی نے اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا۔رشید کی پھوپھی کو چار دن گھر میں رکھنے کے بعد مار پیٹ کر کے اس کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔اس کے بالمقابل رشید نے اس کے بدلے میں کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔پارو کو ان کے پریوار والوں نے معاشرے کے ڈر سے تسلیم نہیں کرتے۔جبکہ اس کا قطعاً کوئی قصور نہیں۔رشید پارو کو اپنا لیتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے۔رشید کی اچھائی بھی پارو کا دِل نہیں جیت سکی۔پارو بے گناہ، لاچار اور بے بس سمجھ کر خود کو ایک پنجر تسلیم کرتی ہے۔دن میں پارو حمیدہ کے بھیس میں اور رات کو پارو ہی رہتی ہے۔مگر وہ سوچنے پر مجبور رہتی ہے کہ درحقیقت نہ وہ حمیدہ ہے نہ ہی پارو وہ ایک پنجر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی جس کی نہ کوئی شکل ہے نہ

صورت اور اس کے بطن سے ایک اولا جنم لیتی ہے جس کا نام جاوید رکھا گیا۔ یہ انفرادی المیہ تھا کہ بے قصور عورت کے ساتھ کیا کیا ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت پارو اکیلی ہی نہیں بلکہ ایسی بے شمار عورتیں اس کا شکار ہوئیں۔ ناول میں امرتا پریتم نے معاشرہ پر طنز کیا ہے کہ پاکیزہ سیرت کی مالکہ پارو جب اپنے گھر واپس جاتی ہے تو اس کو کوئی قبول نہیں کرتا ہے۔ امرتا پریتم نے اس ناول کے ذریعہ معاشرہ کی تصویر پیش کی ہے۔ امرتا پریتم کا ناول ''پنجر'' کے بارے میں خورشید احمد لکھتے ہیں:

> ''میں نے تقسیم کے حوالے سے بہت سے رائٹر کی تحریریں (زیادہ تر جذباتی) پڑھ رکھی ہیں لیکن جو مزا اس ناول نے دیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا ''یاخُدا'' پڑھنے پر کرشن چندر کا ''ان داتا'' ثابت ہوا۔ جبکہ امرتا پریتم کا ناول ''پنجر'' سوفیصد اوریجنل (original) اور غیر جذباتی تحریر ہے۔ یہی کسی بڑے شاہکار یا عالمی ادب کا حصہ بننے والی تخلیق کی سب سے بڑی نشانی ہوا کرتی ہے۔''
>
> (امرتا پریتم نمبر، فضل راز، ص۔۲۵۱)

آلنھا (گھونسلہ):

ناول میں عام زندگی کی پریشانی کو بیان کیا گیا ہے۔ پورے ناول کی کہانی نیشا، نینا اور تیج کے درمیان گھومتی ہے۔ ننیا اور تیج دونوں ڈاکٹر سلوجہ کے یتیم خانہ میں دِن کاٹتے ہیں۔ ڈاکٹر سلوجہ کی اہلیہ راج ونتی تیج کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پیار کرتی ہے۔ نینا اور ڈاکٹر سلوجہ کی لڑکی ہم عصر ہیں۔ نینا کو کرشنا دیوی اور دیوراج گود لیتے ہیں۔ جوان تیج کا دل نینا کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ نینا بھی تیج کو پیار کرتی ہے۔ مگر جب یہ پتہ چلتا ہے کہ وینا بھی تیج کو دل سے چاہتی ہے ایسی حالت میں وہ راستہ میں حد راہ نہیں بننا چاہتی بلکہ کہیں اور جگہ اپنی شادی

کروالیتی ہے۔ نینا کا یہ قربانی والا رویہ ہمارے دل میں اس کے تئیں ہمدردی مزید بڑھا دیتا ہے۔اس کے شوہر کی تکلیف اور زیادتی نینا کو اور بھی قابل تعریف بنا دیتی ہے۔یتیم ہونے کی وجہ سے تیج کو ڈاکٹر سلوچہ کا گھر آلنھے (گھونسلے) کی شکل میں مل جاتا ہے۔مگر یہ آلنھنا نینا کو نصیب نہیں ہوتا۔ نینا پھر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اپنی بیٹی کا نام نینا رکھتی ہے

آشو:

امرتا پریتم کا ایک اہم ناول ہے جو موسیقی کی ماہر آشو نامی لڑکی کے ارد گرد گھومتا ہے۔آشو، راجن نامی شاعر سے پیار کرتی ہے۔مگر راجندر کمار آشو کو صحافت سے جوڑنا چاہتا ہے۔راجندر آشو کو ترقی کی منازل پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔اس دوران راجن خاموشی سے آشو کے دل سے نکل جاتا ہے۔علاوہ ازیں آشو کی شادی راجندر کے ساتھ نہیں ہوتی۔آشو اپنی مہارت کے بل بوتے پر زندگی گزارتی ہے۔راجن کا انتظار بھی کرتی ہے۔بالآخر آشو راجن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔جب وہ بیماری کی وجہ سے باہر جانے کی کوشش کرتا ہے۔آشو ایک محبت بھری کہانی ہے جس میں عورت محبت کرنے کی بناء پر پریشانی کے عالم میں زندگی گُزارتی ہے۔اس کی والدہ بھی ایسی عورت تھی جس کو اپنی محبت کو حاصل کرنے کیلئے معاشرہ اور رسم ورواج اور والد کے خلاف کھڑی ہوگئی۔آشو پر ایک رقاصہ کی لڑکی ہونے کا بھی الزام ہے۔آشو اس سے بچنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔مجموعی طور پر یہ ناول آشو کی روحانی تسکین اور نفسیاتی جذیات کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔

اک سوال:

اک سوال ناول امرتا پریتم کا ایک نفسیاتی ناول ہے۔جس میں ایک ماہر کلاکار کے اندونی جذبات کو

سمجھانے اور ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جگد یپ کی عزت وشہرت کا چرچا ہے۔ مگر وہ سب کچھ حاصل کر کے سب کچھ برباد کر دیتا۔ نوراں صرف اس کے خیالوں میں ہی رہی۔ خیالات جب حقیقت میں بدل جاتے ہیں۔ تو نوراں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ریکھا بھی اس کو اچھی لگتی ہے۔ اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی شادی تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ اس ناول میں انسانی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کی زبان و بیان شاعرانہ رنگ میں رنگی ہے۔ جو قدرتی امر ہے اور ہیرو کے شوق کی نشاندہی ہے۔

بُلاوا:

بلاوا ایک مرد پردھان ناول ہے۔ جس میں ایک شخص اپنی محنت اور مہارت سے کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ پھر ایک یہودی لڑکی سے اس کے تعلقات ہو جاتے ہیں۔ وہ اُس لڑکی کے عشق میں اندھا ہو جاتا ہے۔ صوفی کہتی ہے کی میں شادی کے لیے تیار ہوں لیکن اُس کی والدہ نہیں مانتی۔ اس کے بعد ایک وقت آتا ہے کہ صوفی فیض کو خود شادی کرنے کیلئے کہتی ہے۔ اب فیض اُس سے شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ صوفی کسی اور مرد کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔ صوفی کے بعد محبت کے راستے میں فلورا جیسی کئی لڑکیاں اسے ملتی ہیں مگر وہ شادی کسی سے نہیں کرواتا ہے۔ اپنی پوری زندگی بغیر شادی شدہ رہ کر گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بند دروازہ:

بند دروازہ امرتا پریتم کا اہم ناول ہے اس میں عورت کی دردناک کہانی کو بیان کیا ہے۔ جو کئی جنموں سے درد و غم میں زندگی گزارتی ہے۔ اس ناول میں امرتا پریتم نے عورت کو مختلف کرداروں میں پیش کیا ہے۔ کبھی بیٹی

، کبھی بیوی، کبھی محبوبہ اور کبھی والدہ ان چاروں کرداروں میں عورت کے لئے دروازے بند ظاہر کئے گئے ہیں۔والد کی زیادتی، شوہر کا لالچ اور بدمعاش ہونے کی بناء پر محبوب کا والدین کی طرف زیادہ جھکاؤ اور والدہ کا معاشرہ کی بدعنوانیوں کی بناء پر پریشان رہنے کو پیش کیا گیا ہے۔اقتصادی آزادی بھی عورت کو خوش نہیں رکھ سکتی ۔ہیروئن ان تمام رسم ورواج کو بالائے طاق رکھنے کا پیغام دیتی ہے۔مرد کے چلائے غلط طور طریقے کے خلاف زندگی گزارتی ہے۔اس کے باوجود بھی وہ مطمئین نہیں۔عورتوں پر ہورہے مظالم اور بے کسی پر امرتا پریتم نے بڑے اچھے الفاظ میں طنز کیا ہے کہ:

''اور کہتی ہے کہ عورت کی بچہ دانی کبھی خالی نہیں رہے گی۔ایسا ہوا تو یہ مرد زندگی کے حالات کے ساتھ کیسے کھیلے گا۔''

(بند دروازہ، امرتا پریتم۔ص ۱۲۸)

رنگ دا پتا:

اس ناول میں امرتا پریتم نے بے جوڑ شادی کی داستان بیان کی ہے۔جس میں کھتریوں کی لڑکی کیلی نہایت خوبصورت ہے۔مگر اس کی شادی ایسے آدمی کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔جو اس سے عمر میں کافی بڑا تھا۔یہ شادی اس بناء پر کر دی جاتی ہے کہ وہ آدمی کافی دولت مند ہوتا ہے۔شروع میں کیلی اس شادی کی بغاوت نہیں کرتی ۔اس رئیس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اس کے تین بچے بھی تھے۔کیلی والدہ کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے شروع میں زبان سے کچھ نہیں بولتی۔امرتا لکھتی ہیں:

''لڑکیاں اپنی زبان سے کچھ نہیں بولتیں ان کے جنم کے بعد زبان کاٹ دی جاتی ہے ....اور مرد کا بوجھ کیسے دیکھتی ہے۔''

(رنگ دا پتا' امرتا پریتم' ص ۸)

بعدازاں جب مکھی شاہ اس کو بیمہ کمپنی کے آفیسر کی ہوس کا شکار ہونے کے لئے کہتا ہے۔تو وہ گھر سے نکل جاتی ہے۔لاہور میں دیپک نامی مصور کے پاس بغیر شادی کے دن کاٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ دیپک اس کو سسرال میں ملتا ہے۔جس سے وہ وقتاً فوقتاً پیار کی باتیں کرتی رہتی تھی۔اس ناول میں امرتا پریتم نے سماج کی بُرائیوں کو نظر اجاگر کیا ہے اور بے جوڑ شادی کے نتیجے پر روشنی ڈالی ہے۔ بلاشبہ ''رنگ دا پتا'' ایک بہترین ناول ہے۔جس میں امریتا کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

اک سی انیتا:

امریتا کا ایک اہم ناول ہے۔ جو انیتا نام کی ایک عورت کے ارد گرد گومتا ہے۔انیتا ایک شادی شُدہ عورت ہے۔ جو ساگر سے مُحبت کرتی ہے۔کئی سال ساگر کی محبت کی یادوں کے سہارے گزار دیتی ہے۔اُس کے بعد اس کو اقبال سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ محبوبہ ہندوستانی ہونے کی بناء پر ایک پیغام دینا چاہتی ہے کہ ہندوستانی عورت کو صرف ایک مرتبہ ہی پیار ہوتا اور وہ اُسے جابجا ظاہر بھی کرتی ہے۔مگر ساگر کے پیار کو وہ خُدا سے پیار کرنے کے مترادف سمجھتی ہے۔مگر ساگر کی محبت اُسے کوئی کنارہ نہیں دکھاتی۔جس کی بناء پر وہ اقبال سے محبت کرنے لگتی ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔انیتا ان محبوبہ عورتوں میں شامل ہے جو اپنی شادی جسم و جان کی طرح سمجھتی ہے۔روایتی چیزیں انھیں قطعاً پسند نہیں ہے۔ساگر بھی انیتا سے پیار کر کے زندگی میں راحت وسکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔مگر انیتا پرانے رسم ورواج پر جمی رہتی ہے اور ساگر کی خواہش کو ٹھکرا دیتی ہے۔ساگر اس سے ناراض ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔ایسی حالت میں انیتا کو اپنا جسم بے مطلب محسوس ہوتا ہے۔اس ناول کی

ہیروئن ایک وقت میں دو زندگیوں کو جینا چاہتی ہے۔سارے ناول میں ہیروئن کی دماغی حالت کواُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انیتا نازک مزاج عورت ہے۔جس کی سوچ مرد کو حاصل کر لیتی ہے۔وہ مرد کی تلاش میں سماجی اصولوں کی مخالفت بھی کرتی ہے۔انیتا اپنے آپ میں سچی عورت دکھائی دیتی ہے۔اس سچ کو اپنے شوہر کے سامنے بھی ظاہر کر دیتی ہے کہ وہ مطمئین نہیں ہے۔عمر میں چھوٹا اقبال زیادہ عمر کی انیتا سے تنگ آ جاتا ہے۔وہ ساگر کے دوست کے پاس چلی جاتی ہےاور وہیں مر جاتی ہے۔

اس ناول میں امرتا پریتم نے اپنی زندگی کے سچے واقعات وجذبات کو ناول کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ناول میں انیتا امرتا کی شکل میں ہے۔اقبال امروز ہےاور ساگر کو ساحرلدھیانوی کی شکل میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

چک نمبر چھتی:

یہ امرتا پریتم کا متنازعہ اور گندہ ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس ناول کی ہیروئن القا امیروں کی لڑکی ہے۔جو امرتسر سے پالم پور کی وادی میں کمار نامی ایک مشہور ومعروف کلاکار کے بنائے ہوئے چک نمبر چھتی میں کلا سیکھنے کیلئے جاتی ہے۔کلاکار کی عمر جوانی سے بڑھاپے کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔یہ خود جوان ہے۔اس کلاکار نے اپنی زندگی میں اپنی خود ساختہ اُمنگیں قائم کی ہوتی ہے۔ان تمام باتوں کے پیش نظر وہ آزاد رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔کلاکار بھی عزت سے بیزار عورت سے آزاد رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔وہ کسی عورت کے سامنے اپنی آزادی بیان نہیں کرنا چاہتا جب اُس عورت کے ساتھ محبت کا جذبہ بے دار ہوتا ہے وہ شہر میں اس عورت کے پاس جاتا ہے جو صرف بیس روپے لے کر اس کی ہوس کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ قیمت کے طور پر اس سے آزادی نہیں

مانگتی لیکن الکا کمار پر اس قدر قربان ہو جاتی ہے کہ کمار سے کہتی ہے کہ

''کاش میں وہ عورت ہوتی جس کے پاس تم بیس روپے دے کر جاتے تھے۔''

(چک نمبر چھتی، امرتا پریتم۔ص۹)

پھر الکا اور کمار کے مختلف نظریات جو آپس میں تضاد رکھتے ہیں بیان کیا ہے جن کی بناء پر بحث و مباحثہ اور نوک جھونک چلتی رہتی ہے لکھتی ہے:

''جو ہاتھ اجسام کی کھیل میں مصروف ہو جائیں وہ کام نہیں کر سکتے میں زیادہ اندھیروں میں گُم ہو جانا نہیں چاہتا۔'' الکا کہتی ہے'' میرا خیال ہے کہ زندگی کا راستہ جسم کی روشنی سے ملتا ہے۔'' (چک نمبر چھتی، امرتا پریتم۔ص۱۹)

دھرتی ساگر اور سیپیاں:

اس ناول میں مستورات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔جس کے ذریعہ امرتا پریتم نے عورتوں کے اندرونی جذبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔عورت کے ذاتی مسائل پر مرکوز ہے۔ یہ ناول جہاں عورتوں کے مسائل پر بحث کرتا ہے وہیں عورتوں کے جنسی خیالات کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ناول کی ہیروئن اقبال سے تعلقات بنا لیتی ہے اور ماں بن جاتی ہے۔ چیتنا اقبال کو دل سے چاہتی ہے۔اقبال بھی اس کو یقین دلاتا ہے کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح پیار دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ چیتنا اقبال کی مجبوری سمجھتی ہے وہ اس کو شادی کیلئے مجبور نہیں کرے گی اور کہتی ہے:

''میں اور کچھ نہیں چاہتی میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ عورت کو مرد سے جو تجربہ ملتا ہے پہلی مرتبہ اُس مرد سے جو غیر کو نہ دیکھے......اور میں زندگی میں پہلی مرتبہ یہ تجربہ کسی

اور سے نہ کر سکوں گی۔"

(دھرتی ساگر تے سپیاں، امرتا پریتم۔ص ۴۸)

اس تجربہ کے طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جس بہادری سے چیتنا پختہ ارادہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا بچہ غیر شادی شدہ ماں کی حیثیت میں پیدا ہوا اس کو تسلیم کرتی ہوئی لوگوں کو ظاہر نہیں ہونے نہیں دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ اقبال کا بچہ ہے۔ ناجائز بچوں کے آشرم میں اس بچے کو داخل کرا کر خود ایک انجان عورت بن کر قانونی طور پر اس کو گود لیتی ہے۔ اب اس کو معاشرہ کی بندشوں کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کا کسی اور مرد سے بیاہ ہوتا ہے کہ نہیں۔ اس ناول میں چیتنا کے علاوہ چمپا اور شکنتلا کی پیار کی کہانی بھی ساتھ چلتی رہی ہے جو شادی کے متعلق اپنے آپ فیصلہ لے لیتی ہے۔

دل دی گلیاں:

یہ ناول امرتا پریتم نے شہری زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ جس کا ہیرو ناصر ایک آرٹسٹ اور ہیروئن کامنی ایک اخبار کی صحافی ہیں۔ جو دل کی گلیاں نام کا ایک کالم لکھتی ہے اور ناصر کے اسٹوڈیو میں آکر اس کا انٹرویو لیتی ہے۔ اس طرح دونوں کی جان پہچان ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ناصر اور کامنی محبت کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں انہیں نہ کوئی روک ٹوک ہوتی ہے نہ سماج کی بندیش ان کے درمیان حائل ہوتی ہے۔

ایکتا اور ایریلی:

یہ دو ناولٹ ہیں جو امرتا پریتم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ایکتا ناولٹ میں ایک طرف پریم بیاہ غالب ہے

اور دوسری طرف محبت کو ایک طرف رکھ کر والدین کی مرضی کے ساتھ کی گئی شادی کی جھلک ہے۔ پریا اور ایکتا جو ہم جماعت تھیں پریا نکھل رائے چودھری سے پیار کرتی ہے مگر اُس کی شادی ایک شادی شدہ وکیل سے ہوتی ہے ۔ایکتا بھی مرد کی بے وفائی سے دکھی ہے۔ وہ رگھو سے اس بناء پر طلاق کی مانگا کرتی ہے کہ ان دس سالوں میں اس نے اُسے برداشت کیا ہے۔

جلاوطن:

اس ناول میں امرتا پریتم نے دو پیڑھیوں اور ان کے اچھے اوصاف کو قابل تعریف ڈھنگ سے نکھارا ہے۔ تریجہ اور ان کا ساتھی موجودہ دور میں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی دوستی کو غلط تصور نہیں کرتے۔ ملک ان کا ساتھی ہے مگر وہ ان باتوں سے بے خبر ہے۔ نئی نسل جہاں ہر چیز کو غیر ذمہ داری کے ساتھ لیتی ہے وہیں ملک بہت سنجیدہ اور سمجھدار ہے۔ اس کو باہری چمک دمک پسند نہیں اس لئے امرتا پریتم اس کو جلاوطن سے مخاطب کرتی ہے۔

''اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ رہنے Existence کا خطرناک راز مجھ سے کوئی میں
اس کے وجود سے دور ہوں۔ میں جلاوطن ہوں۔''

(جلاوطن، امرتا پریتم۔ ص ۶۴)

یاتری:

اس ناول میں امرتا پریتم نے مرد و زن کے درمیان بچہ پیدا کرنے کی تکنیک کو بڑے اچھے انداز میں پیش

کرنے کی کوشش کی ہے۔سارا ناول بچے کے اردگرد گومتا ہے۔ ہر میاں بیوی کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ اُن کے ہاں بچہ پیدا ہو۔مرد سے زیادہ عورت میں یہ تڑپ ہوتی ہے۔اس بات کو پایہ تکمیل تک پہچانے کیلئے نامرد دینا ناتھ اپنی اہلیہ کو بچہ پیدا کرنے کیلئے کرپا ساگر کے پاس چھوڑ آتا ہے۔اُس طرح ناجائز تعلقات بنانے کی بناء پر جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام بھی کرپا یاتر کھا جاتا ہے۔کرپا یاتر کے کردار کو امرتا پریتم یاتری کے روپ میں بہت ہی اچھے اور انوکھے ڈھنگ میں پیش کرتی ہے۔

اس ناول میں اس کی زندگی کے نشیب وفراز،مشکلات و پریشانی،احساس کمتری کا شکار سچ بولنے کے بعد زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو نفسیاتی تجزیہ کی شکل میں انفرادیت حاصل ہے لکھتی ہیں:

> ''کل میں ساری رات بلی کو پکڑنے کے لیے خوب بھاگ دوڑ کرتا رہا۔حالانکہ بلی کو پکڑنے کیلئے میں کسی کا ساتھ نہیں لیتا۔مگر خواب میں چھوٹے بڑے خطروں سے گزرتا رہا اور بلی کے پیچھے دوڑتا رہا۔میرے آگے دوڑنے والی چیز کبھی وہ بلی بن جاتی کبھی ماں۔''

(یاتری،امرتا پریتم،ص ۱۸۔۱۹)

سارے ناول میں ہیرو ذہنی پریشانی کا شکار نظر آتا ہے۔مختصر یہ سارا ناول نفسیاتی ناول تسلیم کیا گیا ہے۔

جیب کترے:

اس ناول میں امرتا پریتم نے طالب علموں کو موضوع بنایا ہے۔ان طلباء کا بالخصوص ذکر کیا ہے جو مایوس ہو کر بیٹھ چکے ہیں۔اسی مایوسی میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔جن کو اپنے مستقبل پر کوئی یقین نہیں رہا۔یہ

طبقہ اپنے اردگرد کے حالات سے مطمئین نہیں۔آزادی کی طلب کر دیتے ہیں۔ مذہبی کتابوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔اس ناول میں بچوں اور بزرگوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بزرگوں کو شکوہ ہے کہ وہ پرانے رسم ورواج کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بچوں کو شکایت ہے کہ ہمارے بزرگ موجودہ زمانے سے بہت پیچھے رہ چکے ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں میں تضاد ہے۔ دراصل اس ناول میں امرتا پریتم نے نوجوان طبقہ کو نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ طبقہ غیر ملکی تہذیب کا شکار ہے۔جنہوں نے اپنے آباواجداد کی راہ ورسم ترک کر کے نیا راستہ اختیار کر لیا ہے۔مختصر یہ کہ اس ناول میں Modernism کو خاص پر بیان کیا گیا ہے۔

پکی حویلی:

ناول میں امرتا پریتم نے عورتوں پر ہورہے مظالم اور ماں کی ممتا کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اُرمی چھوٹی سی بچی ہے جس کی والدہ کو اپنے مکان کے پیچھے ایک کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اپنی بیٹی کو بیٹی کہہ کر نہیں بلا سکتی بلکہ وقتاً فوقتاً اپنی بیٹی کو دیکھنے کیلئے چلی جاتی ہے۔جب اُس کی بیٹی اس کے کمرے میں جاتی ہے تو اُس کو اچھی اچھی لذیز چیزیں کھانے کو دیتی ہے۔جس سے ماں کی ممتا ظاہر ہوتی ہے۔

اک دابوٹا:

اس ناول کی ہیروئن ارمی اپنے گاؤں کے لڑکے گوتم سے پیار کرنے لگتی ہے۔شادی سے پہلے حاملہ ہوجاتی ہے۔اس بات کا علم اُس کے والدین کو بھی نہیں ہوتا۔ چھوٹا بھائی اس بات سے واقف ہے۔ والدین اسکی شادی کسی اچھے گھر میں کرانا چاہتے ہیں۔اُرمی شادی کے بعد اپنے محبوب کے ساتھ شہر میں رہتی ہے۔اس کی وجہ

یہ ہے کہ اس کا شوہر پیسے کمانے کے لیے باہر ملک چلا جاتا ہے۔ اُرمی شادی کے بعد اپنے محبوب کے ساتھ رہنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتی جب کہ اس کا سسر اور باپ اس کی اس بات کو غیر اخلاقی بات سمجھتے ہوئے اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس قتل کو امرتا پریتم نے اُرمی کے بھائی اور عاشق کی آہ وزاری کے ذریعے معاشرے کے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے عورت کی نفسیات اور دل کی آزادی کا احترام کرنا چاہئے۔ انہی باتوں کو امرتا پریتم نے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر میں یہ کہنا چاہتی ہے کہ عورت کو یہ آزادی ملنی چاہئے کہ وہ کس کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔

کچی سڑک:

اس ناول میں امرتا پریتم نے مینا نامی چست و چالاک ہیروئن کی کہانی بیان کی ہے جو زمانے کے ہیر پھیر سے واقف نہیں ہے۔ اس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد اس کے اصلی والد نہیں ہیں۔ اس کے والد یہ کہتے ہیں کہ تو میری لڑکی ہے تو مینا سوچے سمجھے بغیر اس بات پر یقین کر لیتی ہے اور جذباتی ہو جاتی ہے۔ دریں اثناء اپنے والد کو اعتماد میں لئے بغیر جھوٹ بول کر کسی آدمی کے ساتھ لندن بھاگ جاتی ہے اور ان کے لئے ہیرے لانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس دوران اس کے اصلی والدین کو اس بات کوئی احساس نہیں ہونے دیتی۔ اس کے والدین بھی اس کی ہر بات کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ سبھی اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ اس ناول کا موضوع اگر چہ بہت ہلکا ہے لیکن اس میں اصل نقل میں امتیاز کرنے کیلئے ایک پیغام چھوڑا ہے۔

اونہاں دی گلیاں:

اس ناول میں امرتا پریتم نے بیوہ عورت کی مشکلات کو اُجاگر کیا ہے۔اس ناول میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کو بچپن میں ہی ڈاکو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اس کو فروخت آگے کر دیتے ہیں۔ یہ عورت رتنا سے چمپا بنتی ہے اور رقاصہ کی شکل میں زندگی گذارنے پر سمجھوتہ کرتی ہے۔اُس کے بچپن کا ساتھی راجو اسی ڈاکو کے ظلم کا شکار ہو کر ڈاکو بن جاتا ہے۔ایک دن اس کی ملاقات اچانک رتنا کے ساتھ ہوتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔جب اس کو راجو مل جاتا ہے تو وہ ایک دم یہ زندگی سے تنگ آکر مصیبتوں سے پُر زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ بدقسمت عورت ہے جو حالات کا شکار ہوئی بازار میں نیلام ہونے کیلئے تیار ہو جاتی ہے جس کی روح پاک ہے۔راجو کے ملنے سے رتنا حاملہ ہو جاتی ہے۔ذہنی توازن سے چھٹکارا پا لیتی ہے۔ایک طرف وہ ماں بننے سے خوش نظر آتی ہے مگر دوسری طرف بچے کے مستقبل کے بارے میں فکرمند نظر آتی ہے۔اس کے یہاں ایک بچی جنم لیتی ہے وہ اس بچی کے سنہرے مستقبل کو لے کر فکرمند ہو جاتی ہے۔اس کے سنہرے مستقبل کیلئے بچی کو ساہنی کے سپرد کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں جنہوں نے ماضی میں اس بچی کو بچایا تھا ۔رتنا اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی۔آخر میں اپنی ممتا کو قربان کو کر دیتی ہے۔ بچی کی جدائی اُسے ہر وقت پریشان کرتی ہے۔ جب بچی جوان ہو جاتی ہے تو اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔المختصر امرتا پریتم نے اس ناول میں سماج کے غلط عناصر کو عیاں کرنے کی بات کی ہے۔

ایہہ ہے سچ:

ناول کا کردار سنجے ہے جو رات کو سوتا ہوا ایک نئی زندگی میں رات گُزارتا ہے۔ جو تنہا رہتا ہے۔ وہ ایک خوفناک پرندہ خواب میں دیکھتا ہے۔ پورے ناول کا دائرہ کار اور وقت چوبیس گھنٹے ہے اور اپنے آپ گزرا ہوا

ایک دن ۔گھر میں مدت سے بند پڑے ہوئے ایک کمرہ کا اندھیرا،ایک خاص چیز پر پڑی ہوئی دھول،کالج کے دنوں میں کھیلا ہوا،پیش کیا ہوا ایک ناٹک کی یاد،برآمدے میں اخبار کے گرنے کی آواز،کافی کے پیالے سے نکلتی ہوئی ہوئی بھاپ،ٹیلی فون کی گھنٹی سے عالمی شور شرابہ،کسی وقت سُنی ہوئی کہانی کی یا،دنیا بھر کے خودکشی کرنے والے لوگوں کا غرور،دروازے پر آیا ہوا ایک عام مسئلہ،کار کے شیشے پر پڑ رہی بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں،ان کے پاؤں میں پڑا ہوا کئی بوندوں کے سفر کا اوس اس کی سوچ کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔اس ناول میں ہیرو کی نفسیات اور ردِعمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تیرھواں سورج:

اس ناول میں امرتا پریتم نے ایک ایسی عورت کا کردار پیش کیا ہے جو دماغی توازن کھو چکی ہے۔مینکا ایک شادی شدہ عورت ہے جو سنجے سے ملتی جلتی ہے۔اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کر کے بھی اس کے دل میں گناہ کا احساس نہیں ہے بلکہ ناول کے اہم کردار سنجے کو خود یہ کہتی ہے کہ اس کا شوہر کچھ دنوں کیلئے باہر جارہا ہے اس لئے وہ اس کے گھر میں آجائے۔

یہ وہ جدید طرز کی عورت ہے جو عیش وعشرت کو ترجیح دیتی ہے۔علاوہ ازیں امرتا پریتم نے اس ناول میں دیگر حالات و جذبات کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔کریم اور سنجے کی گفتگو کا بھی اس ناول میں ذکر کیا گیا ہے۔پرانے رسم ورواج،مختلف مہینوں،مختلف سورجوں کا تصور کا ذکر کیا گیا ہے۔اسطرح ناول کے ہیرو کے ذاتی نظریات کو بخوبی سراہا گیا ہے۔وہ کہتی ہیں:

”میرے ساتھی تمھارا یہ سارا درد پیشانی کا نور ہے۔اس نور کو میں تیرھواں سورج کہتا

ہوں اور انسان کی نسل کو دُعا دیتا ہوں کہ یہ تیرھواں سورج ہمشہ اُسکے آسمان پر چڑھتا

رہے گا۔''   (تیرھواں سورج' امرتا پریتم۔ص ۱۴۸)

انجان دِن:

یہ ناول مصری طرز پر تحریر کیا گیا ہے جس میں اُنچاس دنوں کے بعد کریم کی روح اُس کے جسم میں واپس آجاتی ہے۔ناول کا ہیرو کریم دو دن بیہوشی کی حالت میں رہتا ہے۔ان دو دنوں کی مصر کی فلاسفی اور نفسیات کی حقیقت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔اس کے علاوہ امرتا پریتم کا ناول کورے کاغذ بھی فلسفیانہ ناول ہے۔جس کا پلاٹ روشنی کی تلاش میں نکلتے ہوئے انسان کی کہانی کے اردگرد بنا گیا ہے۔

امرتا پریتم کے مذکورہ تمام ناولوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ سارے ناولوں کا مضمون ادھورا پیار،عورت کے مسائل ،عورت کے دُکھ درد اور ان کے ساتھ ہو رہے مظالم ہیں۔ان ناولوں کی کہانیاں میں زندگی کی حصولیاتی اور انفرادیت اور زندگی کے مسائل کے نظریہ حیات کو پیش کیا گیا ہے۔وہ اپنی زندگی کے تجربات کی بنیاد پر ان ناولوں کو تحریر کرتی چلی جاتی تھی۔ان ناولوں میں عورتوں کے دبے کچلے جذبات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔امرتا پریتم عورت ہونے کے باوجود مردوں کے کردار کو اس طرح پیش کرتی ہے جیسے وہ خود مرد ہیں۔امرتا پریتم نے ناولوں میں عورت پر سماج میں کیئے گئے ظلم کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔امرتا پریتم کے تقریباً تمام ناولوں میں مشکلات یکساں نظر آتی ہے۔ان کو خود مصنفہ نے اپنے ناولوں میں اندرونی نفسیات کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امرتا پریتم کے ناولوں میں نفسیاتی مطالعہ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔امرتا پریتم کو ان ناولوں میں ماہر نفسیات مانتے ہوئے اندرونی جذبات وخیالات کے عمیق مطالعہ کی

ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

☆☆☆

اجیت کور حیات اور کارنامے

اجیت کور پنجابی ادب کی مایہ ناز خاتون تسلیم کی جاتی ہے۔اجیت کور ۱۶ نومبر ۱۹۳۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام مکھن سنگھ بجاج اور والدہ کا نام جسونت کور تھا۔آپ کے والد پیشے سے ڈاکٹر تھے اور والدہ ہمیشہ بیمار رہتی تھیں اجیت کور کا ایک بھائی تھا جس کا نام جسبیر رکھا گیا۔کافی عرصے سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جب ہمارے سماج میں بیٹی کے بعد جب بیٹا جنم لیتا ہے تو اس بیٹی کو سب قسمت والی سمجھتے ہیں۔اجیت کور کے ساتھ بھی یہی ہوا وہ کوڑا کباڑا میں لکھتی ہیں:

> ''یہ تو بہت خوش نصیب بچی ہے۔اس کے قدم مبارک ہیں۔اپنے پیچھے بھائی لے کر آئی ہے۔یہی تو اس گھر کی رونق ہے۔بیٹیوں کا کیا ہے'یہ تو چار دن کے لیے ماں باپ کے گھر کی زینت ہوتی ہیں۔پھر انہیں پرائے گھر جانا ہے۔دوسروں کا گھر بسائیں گی جا کر۔چڑیوں کی طرح بابل کی منڈیروں سے اُڑ جائیں گی۔''
>
> (کوڑا کباڑا۔ص ۱۱)

جب اجیت کور آٹھ سال کی تھیں اُن کے دادا جی نے اُن کو گرو گرنتھ صاحب جی کا پاٹھ کرنا سکھایا تھا۔اجیت کور نے اپنی تعلم سیکرڈ ہارٹ اسکول میں حاصل کی۔اجیت کور نے امرتا پریتم کے والد گیانی کرتار سنگھ

سے بھی تعلیم حاصل کی ۔ان کی صحبت کا اثر ان کی زندگی میں کافی معنی رکھتا ہے ۔گیانی جی پنجابی کے اُستاد تھے انھوں نے اجیت کور کو پنجابی پڑھانا شروع کر دیا اور گیانی جی نے اپنی بیٹی امرتا پریتم کی کتاب ''امرت لہراں'' جو اُس وقت پنجابی کے نصاب میں شامل تھی وہ پڑھانی شروع کر دی۔آٹھ سال کی عمر میں اجیت کور نے وارث کی ہیر رانجھا، ہاشم کی سسّی پنوں اور کئی عشقیہ ناول پڑھ لئے تھے ۔اس کے بعد اجیت کور کا داخلہ خالصہ اسکول میں ہوا۔نو سال کی عمر میں اجیت کور نے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنی شروع کر دی اور پھر یہ نظمیں گیانی جی کو اصلاح کی غرض سے پیش کرتی تھی اور گیانی جی کہتے ہیں:

''جو لوگ اپنی تخلیق کو حرف آخر مان لیتے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتے وہ کبھی بڑے تخلیق کار نہیں بن سکتے ۔اُردو کے سبھی شعراء سالہا سال تک اپنے کلام پر اُستادوں سے اصلاح لیتے رہیں۔''

(کوڑا کباڑہ۔ص ۲۶)

اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے حالات خراب ہوئے تب اجیت کور اور اس کے خاندان کے سبھی افراد شملہ چلے گئے اور انہیں یہ خیال تھا کہ جب حالات میں بہتری ہوگی تب واپس لاہور اپنے گھر چلے جائیں گے ۔لیکن انہیں کیا معلوم تھا قسمت کو یہ منظور نہ تھا اور لاہور پاکستان میں چلا جائے گا۔شملہ سے انھوں نے جالندھر کا رُخ کیا۔اجیت کور کے گھر والے ان کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن اجیت کور کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔جب ملک تقسیم ہوا تھا تو کافی مسلمان پاکستان چلے گئے اور کئی ہندو، سکھ ہندوستان آ گئے ۔اسطرح اجیت کور کے گھر والوں کو جالندھر میں مسلمانوں کے گھر میں رہنا پڑا۔اس گھر میں اُردو کی کئی کتابیں موجود تھیں اجیت کور کافی دلچسپی سے ان کتابوں کو پڑھتی تھی ۔اس کے بعد اجیت کور اور گھر کے سبھی افراد جالندھر سے دلی چلے گئے ۔دلی میں اجیت کور نے دلی کالج میں بی.اے میں داخلہ لیا اسی دوران اجیت کور کو بلدیو جو انگریزی کے اُستاد تھے

۔ان سے محبت ہوگئی۔اجیت کور لکھتی ہیں:

''ان دنوں میں بلدیو سے دیوانگی کی حدتک محبت کرتی تھی،اور وہ مجھے ناسمجھ بچی سمجھتے تھے۔بلدیو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔مجھے اپنی نجی لائبریری سے ڈھیروں کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔اُن کے ڈراموں کی ایک کتاب انھوں نے مجھے تحفے کے طور پر بھی دی تھی۔وہ کتاب میں نے آج بھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔''

(کوڑا کباڑا۔ص۵۱)

بلدیو سے محبت کے دوران اجیت کور نے بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں ''نویاں قیمتاں''،لکھی اور ''لوک ساہتہ'' اور'' پریت لڑی'' جیسے رسالوں میں شائع ہوئیں۔اجیت کور کی کہانیاں بہت مقبول ہونے لگیں انہیں نانک سنگھ،بلراج ساہنی،سردار گوروبخش سنگھ کے خطوط آنے لگےاوراس بات پر اجیت کورکوفخر محسوس ہونے لگا۔لیکن آخرکار بلدیو سے محبت ناکام ثابت ہوئی اوراجیت کورکواس بات کا بڑا دُکھ تھا۔

اجیت کور کی شادی ہریانہ کے کرنال ضلع میں راجندر سنگھ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔۔اس کے بطن سے دولڑکیاں ارپنا اور کینڈی نے جنم لیا۔جس کی وجہ سے ان کے شوہر اُن سے کافی ناراض ہوئے۔شادی کے بعد اجیت کور نے اپنے شوہر کے کہنے پر دلی یونیورسٹی سے بی.ایڈ کی ڈگری حاصل کی اور دلی میں ایک اُستانی کا عہدہ سنبھالا۔اجیت کور نے زندگی میں کافی دُکھ برداشت کئے۔شادی سے پہلے اُن کے گھر والوں نے ہمیشہ اُن کو جو حکم کیا اوراس نے اطاعت کی اور شادی کے بعد بھی ہمیشہ اس کے شوہر نے ظلم کیےاور وہ برداشت کرتی رہی جس کی وجہ سے اجیت کور کی شادی شدہ زندگی زیادہ خوشحال نہیں رہی اور نتیجے کے طور پر انہوں نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ۔اجیت کور کی چھوٹی بیٹی کینڈی کا انتقال فرانس میں آگ کے حادثے میں ہوگیا اور بڑی بیٹی ارپنا ہندوستان کی

بہت بڑی تصویر نگار مانی جاتی ہے۔اجیت کور ثقافتی ادارہ اکادمی آف فائن آرٹس اینڈ لٹریچر کی بانی ممبر اور چیئر پرسن بھی رہی ہیں۔اس انجمن کے زیر اہتمام سارک خطہ میں کئی ادبی محفلیں سجائی جا چکی ہیں۔دہلی، کٹھمنڈو اور ڈھاکہ میں تین بڑی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔

اجیت کور نے بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے جن کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہوئیں ۔اجیت کور نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے دُکھ درد کو پیش کیا ہے کیونکہ عورت ہمیشہ دُکھ درد برداشت کرنے کی عادی رہی ہے ۔عورت جس کو والدین پرائی امانت سمجھتے ہیں اور شادی کے بعد شوہر اور اس کے گھر والے جائیداد سمجھتے ہیں اس پرائے گھر میں اس کے ساتھ ہو رہے بُرے سلوک کو بھی عورت چُپ چاپ برداشت کرتی رہتی ہے۔اس دُکھ درد کو اجیت کور اچھی طرح سمجھتی تھی اور کہا جاتا ہے کہ جب انسان کو خود دُکھ سہنے پڑتے ہیں تب ہی وہ دوسروں کے دُکھ درد کو محسوس کر سکتا ہے اجیت کور نے اپنی زندگی میں بہت سارے مصائب کا سامنا کیا ہے جس کا ذکر ان کی خودنوشت ''خانہ بدوش''اور''کوڑا کباڑا''میں کیا ہے۔اس لیے اجیت کور نے عورتوں کی درد بھری کہانیوں کو اپنے قلم کا حصہ بنایا اور اسی طرح کہانیوں کا سفر آہستہ آہستہ چلتا رہا جو آج تک جاری وساری ہے۔آج کل اجیت کور دلی میں اپنی زندگی کے دِن کاٹ رہی ہے اور ان کی عمر لگ بگ ۸۲ سال کی ہے۔اجیت کور کی بہت سی کہانیاں 'ناول شائع ہو چکے ہیں۔

خودنوشت:

۱۔خانہ بدوش (۱۹۸۲)

۲۔کوڑا کباڑا

ناول

۱۔ دُھوپ والا شہر (۱۹٦۸)

۲۔ پوسٹ مارٹم (۱۹۷۳)

۳۔ کٹیاں لکیراں ٹوٹے تر کون

۴۔ اپنے اپنے جنگل

۵۔ گوری (۱۹۹۱)

کہانیوں کے مجموعے:

گُل بانو (۱۹٦۰) مہک دی موت (۱۹٦٦) فالتو عورت (۱۹۹۲) موت علی بابے دی (۱۹۸۵) اپنے اپنے جنگل (۱۹۹۴) نومبر چوراسی (۱۹۵۵) ون ز یرو ون۔ کالے کوہ۔ سفید تے کالی ہوا دی داستان ۔ حادثیاں دا ہجوم۔ کوگا تے سمندر ۔ قصہ اک قیامت دا۔ اک مریا ہوا پل ۔ کمرہ نمبر اٹھ۔ پنج روپے والا کم۔ ہارڈ وائز بوٹل ۔ مہک دی موت۔ سولی اتے لٹکے پل۔ مامی۔ ماں پتر۔ اِک پوٹریٹ۔ میرا کمرہ۔ دیور بھابی۔ ہارٹ واٹر بوٹل

سفرنامہ:

۱۔ کچے رنگاں دا شہر لندن

تراجم

۱۔ ستیا کانت مہاجر کی کوتیا

۲۔ رما کانت کی کوتیا اور انو واد

اعزازات وانعامات:

۱۔(۱۹۷۹) پنجاب سرکار شرومنی ساہت کے ایوارڈ سے نوازہ گیا۔

۲۔(۱۹۸۳) پنجابی اکادمی دلی ساہت ایوارڈ دیا گیا۔

۳۔(۱۹۸۶) اجیت کور کی سوانح خانہ بدوش ساہت اکادمی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔

۴۔(۱۹۸۶) بابا بلی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔

۵۔(۱۹۸۹) بھارتی بھاشا پریشد ایوارڈ دیا گیا۔

اس کے علاوہ اجیت کور کی کہانیوں گُل بانو' اے مامی' چوکھٹ پر ٹیلی فلمیں بنائی گئیں۔

خانہ بدوش اجیت کور کی خودنوشت ہے۔مصنفہ کو اس خودنوشت سوانح کے لیے ۱۹۸۶ء میں ساہتہ اکادمی ایوارڈ سے نوازہ جا چکا ہے۔اس میں اجیت کور نے اپنی پوری زندگی کے حالات کو بیان کیا ہے۔اجیت کور اپنے آپ کو خانہ بدوش مانتی ہے۔خانہ بدوش کا ترجمہ دُنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔خانہ بدوش کی پہلی کہانی جس کا نام ''ون زیرو ون'' ہے۔''ون زیرو ون'' میں اجیت کور اپنے دُکھ درد' آنسوؤں کو بڑے دردناک انداز میں بیان کرتی ہے۔اس میں اجیت کور نے اپنی چھوٹی بیٹی کینڈی کی موت کا خوف زدہ واقعات کو بیان کیا ہے ۔اجیت کور کہتی ہیں اس کی اپنی بیٹی کے موت کے حادثے نے اُس کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔وہ آج بھی اس کی یاد میں ہر روز آگ کی چنگاریوں میں جلتی رہتی ہے کیونکہ ان کی بیٹی کی موت آگ کے حادثے میں ہوئی تھی ۔ان کی بیٹی کینڈی ۲۷ مئی ۱۹۷۴ میں فرانس گئی تھی۔اجیت کور نے جب اپنی بیٹی کے جلنے کی خبر سُنی وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی اور فرانس چلی گئی جہاں اُس کی بیٹی لیو (LEO) اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی ۔اس کہانی کو اجیت کور نے ''ون زیرو ون'' کا نام اس لیے تجویز کیا ہے کیونکہ ون زیرو ون ایک ہلپ لائن نمبر ہے

اجیت کورون زیرو ون کو بار بار اپنے من ہی من میں ڈائل کرتی جاتی ہے تا کہ آگ بُجھ جائے اور اس کی لختِ جگر بیٹی بچ جائے۔ اجیت کور لکھتی ہیں کہ:

''پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو میرے پیروں تلے سے شروع ہو کر دور تک صرف آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں جی کرتا ہے کہ ڈائل کرتی جاؤں وون زیرو ون۔''

(خانہ بدوش، اجیت کور۔ص ۹)

آخر میں اجیت کور اس کہانی میں بیان کرتی ہے کہ میں بار بار اس آگ سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہی جس میں کینڈی جل گئی تھی لیکن اس آگ سے باہر نکلنا بہت مشکل تھا۔ جتنا بھولنے کی کوشش کرتی ہوں اتنی ہی زیادہ یاد آتی اور آج بھی اس حادثے کی یاد میں ''ون زیرو ون'' ڈائل کرتی ہوں۔

سفید تے کالی ہوا دی داستان:

یہ اجیت کور کی سوانح حیات ''خانہ بدوش'' کی دوسری کہانی ہے۔ اس میں اجیت کور نے اپنے عشق کی داستان کو قلمبند کیا ہے۔ جب وہ کالج میں پڑھا کرتی تھی تب اُسے انگریزی کے اُستاد بلدیو سے محبت ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اجیت کور کی عمر چھوٹی تھی۔ بلدیو سے کی گئی محبت نے اُس کی دُنیا بدل دی نہ اُس کو دن چڑھنے کی خبر ہوتی ہے نہ رات ڈھلنے کا پتہ چلتا ہے۔ اجیت کور لکھتی ہیں کہ:

''بلدیو کی محبت خُدا کی بندگی تھی بہت زیادہ خوبصورت پیار جس میں صرف سچائی تھی۔''

(خانہ بدوش، اجیت کور، ص ۵۴)

اس کہانی میں اجیت کور یہ بھی ذکر کرتی ہے کہ کہانی لکھنے کا سفر کالج سے شروع ہوا۔ انہوں نے کالج کے

ایک پروگرام میں ایک کہانی پڑھی جو قابل تعریف تھی یہ کہانی رام سنگھ نامی ایک آدمی کو چھپوانے کے لیے دی۔اسطرح اجیت کور کہانی نویس کی حیثیت سے ہمارے سامنے نظر آتی ہے۔اجیت کور اس کہانی کے آخری صفحوں میں یہ اپنی محبت کی ''کالی ہوادی داستان'' کو بیان کرتی ہے کہ کس طرح اس کی محبت ناکام ہوگئی تھی اُس کی قسمت نے اُس کا ساتھ نہیں دیا ان کو اس بات کا بہت دُکھ تھا اجیت کور بلدیو کے جُدا ہونے کو اپنی زندگی کا بڑا حادثہ تسلیم کرتی ہے۔

خانہ بدوش:

اجیت کور کی سوانح حیات کا تیسرا حصہ ہے۔خانہ بدوش (جو ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں جن کا کوئی گھر نہیں ہوتا) اسطرح اجیت کور اپنی زندگی کو خانہ بدوش سے تشبیہ دیتی ہے۔اس میں اجیت کور اپنے بچپن جو (لاہور پاکستان میں گُزرا) اور باقی زندگی (جو تقسیم ہند کے بعد کے حالات) کو قلمبند کرتی ہے۔اجیت کور نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔اجیت کور نے اپنے بچپن کے حالات بزرگوں کے حالات جو اجیت کور پر لکھنے کی پابندی لگاتے تھے ان سب حالات کو موصوفہ نے اپنی کتاب ''خانہ بدوش'' میں قلمبند کیا ہے۔اس میں انہوں نے نقلِ مکانی کا بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے لاہور میں کئی مکان بدلے یہی نہیں بلکہ تقسیم کے بعد شملہ چلے گئے اس کے بعد وہ جالندھر آگئے آخر میں دِلی کے پٹیل نگر میں قیام کیا۔اس کے علاوہ اس میں انہوں نے اپنی شادی کا بھی ذکر کیا ہے ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشحال ثابت نہیں ہوئی۔اس کے بطن سے دو بیٹیوں نے جنم لیا تو ان کے شوہر ان سے کافی ناراض ہو گئے۔آخر کار اجیت کور اپنے شوہر کو چھوڑ کر بیٹیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے اور ایک (Working hostel) میں رہنا شروع کر دیتی ہے

اور بیٹیوں کو شملہ کے ایک اسکول میں داخلہ کروا دیا اور خود دلی کے ایک اسکول میں وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئیں اور ساتھ ساتھ کہانیاں اور ترجمے کا بھی کام کرتی رہتی تھی۔ان سب پریشانیوں کے باعث انہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری ہمیشہ مصیبتوں کا سامنا کیا ہے۔اس کے بعد ان کی چھوٹی بیٹی فرانس چلی جاتی ہے وہاں آگ کے حادثے میں کینڈی کی موت ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتی اور ہمیشہ کینڈی کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہے کیونکہ دُکھوں کے ساتھ ان کا گہرا رشتہ قائم ہوا تھا۔اجیت کور کو آج بھی گھر کے اندر خانہ بدوشی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔اجیت کور لکھتی ہیں:

''لیکن.....اب بھی کسی کسی وقت ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ جیسے پلیٹ فارم پر بیٹھی ہوں۔

پھر اس احساس کو میں شور کرتی ہوئی مکھی کی طرح اُڑا دیتی ہوں

لیکن.....خانہ بدوشی کا یہ عالم ہے دوستو! گھر کے اندر بیٹھے خانہ بدوشی کا احساس''

(خانہ بدوش، اجیت کور۔ص ۱۳۰)

حادثیاں دا ہجوم:

اجیت کور کی خودنوشت کا چوتھا حصہ ہے۔اس میں اجیت کور ۱۹۷۲ کی پنجاب سرکار (جس وقت گیانی ذیل سنگھ پنجاب کے کانگرس پارٹی کے وزیراعلیٰ تھے) جس میں اجیت کور کو افسروں سے ہزاروں روپے کا نقصان ہوا تھا۔جس کا ذکر اجیت کور نے حادثیاں دا ہجوم میں بخوبی کیا ہے۔اجیت کور دلی میں انٹرنیشنل (international) میلے ''ایشیا ۷۲ میں ایک دوست ہربنس اور ان کی بیگم ابان کے ساتھ مل کر ایک میگزین شروع کیا تھا ''روپی ٹریڈ''!اس میگزین میں ہندوستان اور یورپ کے ملکوں کے بیچ ہونے والی بات

چیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جب ''ایشیا۷۲'' کی تیاری ہورہی تھی تو اجیت کور نے سوچا کہ ہر سٹیٹ state نے لاکھوں روپے خرچ کر کے "publicity material" چھپوائی لیکن باہر سے آنے والے خریداروں کو ان کی زبان میں بات کو سمجھائے تو اس کے لیے sales promotion بہتر ہوگا۔اس لیے انہوں نے ۵۷ سٹیٹس states کو خط لکھا کہ اگر وہ publicity material انگریزی، جرمن، فرنچ، رشین زبانوں میں چھپوانا چاہتے ہیں تو ہماری services حاضر ہیں۔سب سے پہلے ہریانہ سرکار نے منظوری دی اس کے بعد اجیت کور پنجاب سرکار کے دفتر گئی گیانی ذیل سنگھ کے خاص سیکریٹری special secretary ''ہربن سنگھ ساہنی سے ملاقات ہوئی نتیجے کے طور پر پنجاب سرکار نے بھی میگزین کی منظوری دے دی۔آخر کار اجیت کور کو پنجاب سرکار سے ہزاروں روپیوں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔

کوگاتے سمندر:

اجیت کور کی سوانح حیات کا پانچواں حصہ ہے اس میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ اپنے خاوند سے جھگڑا کر کر کے تنگ آ جاتی ہے۔اس کا شوہر اس کے کردار character پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔اجیت کور ہمت و حوصلہ کر کے شوہر کا گھر کا چھوڑ کر بیٹیوں کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہے۔اس وقت اجیت کور محکمہ تعلیم میں بطور اُستانی کے عہدے پر فائز تھی۔اُس وقت محکمہ تعلیم کا افسر جس کا نام ''اوما'' تھا اجیت کور سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن اجیت کور کو یہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔اور آہستہ آہستہ اجیت کور کو اوما سے دوستی ہوگئی اوما نے اجیت کور کی کئی پبلیشرز Publishers سے ملاقات بھی کروائی اجیت کور اور اوما ہمیشہ ایک دوسرے سے ساتھ ملتے رہتے گھومتے رہتے۔اوما اجیت کور سے کافی متاثر ہوجاتا ہے۔اور اجیت کور پہلی بار اس جذبے کو گہرائی سے

محسوس کیا تھا۔

ست نیم کش تیر:

اجیت کور کی سوانح حیات کی چھٹا حصہ ہے اس میں اجیت کور نے اپنے اور اوما کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ وہ ایک کمرے میں رہتی تھی اور اس کی دونوں بیٹیاں ہوسٹل میں پڑھتی تھیں۔ اکثر اوما اور اس کا دوست سریندر اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ اس نے اوما کے ساتھ ہندوستان کی مختلف جگہوں کی سیر کی۔ جب کبھی اوما کو کام کے سلسلے میں جانا پڑتا تو اجیت کور کو ساتھ لے جاتا تھا۔ ایک بار جب ایک شہر جاتے ہیں تو گھومتے گھومتے ان کی نظر ایک پُرانی عمارت پر پڑتی ہے وہاں پر ایک مندر بھی تھا اس عمارت کی سیڑھیاں کافی اونچی تھیں جب اجیت کور نے یہ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی جب اجیت کور کو ہوش آیا وہ اوما کی باہوں میں رو رہی اور کانپ رہی تھی۔

قصہ اک قیامت دا:

اجیت کور کی سوانح حیات کا آخری حصہ ہے جس میں اجیت کور نے اوما کے ساتھ بچھڑنے کا ذکر کیا ہے ۔اجیت کور کو اوما سے کافی لگاؤ تھا وہ ہمیشہ اس سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی تھی ۔ایک بار اوما اور اجیت کور کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا اوما نے اجیت کور کو رات کے وقت اکیلے راستے پر چھوڑ دیا اوما کی اس حرکت پر اجیت کور کو بہت غصہ آیا۔لیکن وہ اوما کو کھونا نہیں چاہتی تھی وہ پاگلوں کی طرح اُس کو تلاش کرتی رہی اجیت کور نے اس کے دوست کو بھی پوچھا لیکن ملنے کی کوئی خبر نہیں ملی ۔اجیت کور یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر وہ اس کی بیوی ہوتی تو دنیا

اس کی ہمدرد بن جاتی لیکن یہ تو ایک ناجائز رشتہ تھا۔ وہ اوما کو ڈھونڈنے کے لیے شہر شہر بھٹکتی رہی لیکن اوما کے ملنے کی کوئی خبر نہیں اور اپنے آشیانے کی طرف افسوس کُن حالات میں لوٹ آتی ہے۔

کوڑا کباڑا:

اجیت کور کی دوسری سوانح حیات ہے۔ اس میں اجیت کور نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ کوڑا کباڑا میں اجیت کور یہ بیان کرنا چاہتی ہے کہ عورت ہمیشہ ڈری سہمی رہتی ہے۔ کیونکہ عورت کی زندگی کا ہر فیصلہ شادی سے پہلے اس کے والدین لیتے ہیں اور شادی کے بعد اس کا شوہر اجیت کور کہتی کہ عورت جسے ہمیشہ کوڑا کباڑا سمجھا جاتا ہے۔ عورت ایک نڈر، بے خوف اور حوصلہ مند بن سکتی ہے۔ اس بات کا ذکر اجیت کور نے اس سوانح حیات میں کیا ہے۔ اسی Transformation بدلاؤ کی داستان کو اجیت کور نے ''کوڑا کباڑا'' میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

دُھوپ والا شہر:

اجیت کور کا ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول اجیت کور کے دوسرے ناولوں اور کہانیوں سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اجیت کور نے زیادہ تر اپنے ناولوں اور کہانیوں کے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے لیکن اس ناول میں مصنفہ نے ایک مرد کے اکیلے پن کو کہانی میں بیان کیا ہے۔ اس ناول میں ڈان DON نامی ایک اہم کردار ہے۔ ڈان شیکاگو کا رہنے والا تھا اور گیتا جو ہندوستان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس ناول کا ایک کردار گوتم ہے گوتم گیتا کو ڈان سے ملاتا ہے گیتا سوچتی ہے کہ:

''میں کیوں گوتم کی باتوں میں آ گئی؟ کوئی آئے، کوئی جائے، مجھے کیا؟''

(اجیت کور دا گلپ بود۔ڈاکٹر بینت کور،ص۔۱۰۸)

ڈان اپنی بیوی کو ہر طرح خوش رکھتا تھا۔اُس کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے اکیلے پن کو کبھی بھی دور نہ کر سکے۔ڈان کی ملاقات جب گیتا سے ہوتی ہے تو وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ڈان ایک حقیقت پسند انسان تھا اُس کو دکھاوا بالکل پسند نہیں اس لیے ڈان کو گیتا میں صاف گوئی نظر آتی ہے۔وہ گیتا سے کہتا ہے:

''تمھاری ہمدردی ننگی ہمدردی نہیں۔ایکز ہیبیشن والی! اس کے بیچ جو نئی نئی گھاس اُگتی ہے، یا شاید بیگھی ہوئی مٹی کی خوشبو ہے!''

(اجیت کور دا گلپ بود۔ ڈاکٹر بینت کور،ص۱۰۹)

جس طرح ڈان کی زندگی میں اکیلا پن محسوس ہوتا ہے اس طرح گیتا کی زندگی میں بھی اکیلا پن ہے۔ ان دونوں کی ایک قسم کی پریشانی تھی وہ تھا اکیلا پن یعنی LONELINESS۔اور آخر میں جب گیتا ڈان کو الوداع کرنے جہاز اڈے پر جاتی ہے دو آدمی گیتا کے بارے میں غلط بیانی کرتے ہیں اسی بات پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اس ناول میں اجیت کور نے یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ انسان اگر الگ الگ ملک سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشکلات Problems ایک جیسی ہو سکتی ہیں اور انسان اگر الگ الگ تہذیب، کلچر سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی مشکلات کو دور کر سکتے ہیں جیسے ڈان اور گیتا ایک دوسرے کے اکیلے پن کو دور کرتے ہیں اور دونوں دھوپ والے شہر کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔اجیت کور لکھتی ہیں:

''جیسے وہ گُم ہوئے بچے کسی میلے میں روتے روتے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں وہ دونوں گُم ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اُلٹے

ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہیں اور لوگوں کی بھیڑ سے ادھر اُدھر کے بھاگے جانے
والے پیروں سے الگ الگ ایک جگہ پر بیٹھ کر ریت کا گھر بنا کر ہنسنے لگ جاتے
ہیں۔'' (اجیت کور دا گلپ بوڈ ڈاکٹر بینت کور، ص ۱۰۱)

پوسٹ مارٹم:

یہ اجیت کور کا دوسرا اہم ناول ہے۔ یہ ناول ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ناول The man who died کے ساتھ ملتا جُلتا ہے۔ اس ناول میں میرا اور اوِیناش دو اہم کردار ہے۔ جس میں عورتوں اور مردوں کے رشتوں کے بارے میں اجیت کور نے بحسن خوبی قلم اُٹھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جنسی تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرا اوِیناش سے محبت کرتی ہے اور ساتھ ہی وہ اوِیناش سے جنسی تعلقات بھی قائم کرنا چاہتی ہے لیکن اوِیناش اسکی یہ خواہش پوری نہیں کر پاتا اس بات پر میرا کو بہت دُکھ ہوتا ہے۔ میرا اپنے آپ کو سوالیہ نشان کی طرح سمجھتی ہے۔ میرا اوِیناش سے کہتی ہے:

''جو سلوک تم میرے ساتھ کرتے ہو اگر تم اپنے پالتو کتے کے ساتھ کرو گے وہ بھی تم
سے نفرت کرے گا۔''

(اجیت کور دا گلپ بوڈ ڈاکٹر بینت کور، ص ۱۰۴)

گیتا کے دل میں طرح طرح کے خیالات اُبھر آتے ہیں کبھی یہ سوچتی ہے کہ شاید اوِیناش اس لیے جنسی تعلقات قائم نہیں رکھتا کہ وہ گیتا سے عمر میں چھوٹا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاید بیوی کا ڈر ہو۔ لیکن اوِیناش اس لیے جنسی تعلقات قائم نہیں رکھ سکا کیونکہ وہ سولہ سال کی عمر سے جنسی لذت میں گرفتار تھا۔ اس نے کالج کے

دوران بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔جس عورت کے ساتھ اوبناش شادی کرتا ہےاُس کے ساتھ شادی کرنا اوبناش کی مجبوری تھی کیونکہ اوبناش کا بچہ اس کے کوکھ میں تھا۔اوبناش کی بیوی ٹائپسٹ ہے۔اس کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشحال نہیں رہتی۔اس لیے اوبناش اس کا تبادلہ لکھنو کراتا ہے۔تاکہ اپنی زندگی آرام سے بسر کرسکے۔آخر کار اوبناش میرا کے سامنے اپنی Mental Situation کو پیش کرتا ہے کہ اگر اوبناش میرا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرے تو اوبناش کی نظروں میں میرا کی عزت ختم ہو جائے گی۔کیونکہ وہ میرا کی بہت عزت کرتا ہے وہ میرا کو دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں سمجھتا تھا۔

اس ناول میں اجیت کور نے ناول کے دو پہلو بیان کیے ہیں پہلا یہ کہ میرا ہر حال میں اوبناش کا ساتھ دیتی ہے۔وہ اوبناش کے ہر دُکھ میں اس کے ساتھ چلتی ہے۔لیکن اوبناش اس کی تمنا کو پورا نہیں کرتا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اجیت کور نے یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان پیار کے ساتھ جنسی لذت بھی ہو وہ زیادہ خوشحال زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

آخر میں اجیت کور نے self pitty اپنے آپ پر ترس کھانے والے مردوں کو رد کر دیا ہے اور اجیت کور یہ سوال کرتی ہے کہ آخر میں ساری تکلیفوں کے باعث عورت کیوں ایک خالی پیالی کی طرح رہ جاتی ہے ا عورت کو ہی کیوں ہمیشہ حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

کٹیاں لکیراں ٹوٹے ترکون:

یہ اجیت کور کی ایسی ناولٹ ہے جس کی کہانی اور تکنیک اس کی دوسری کہانیوں سے جُڑی ہوئی ہے۔اس

ناول میں عورت کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس ناول میں اجیت کور نے سمی نامی عورت کا ایک اہم کردار ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔سمی Middleclass مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور کالج میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہے۔اسکو یہ احساس تھا کہ وہ زندگی میں ایک ہی جگہ پر رُکی ہوئی ہے۔یہ رُکی ہوئی زندگی سمی کو اجنبی پن اور پریشانی سے جوڑتی ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں کوئی بدلاؤ نظر نہیں آتا۔کئی سالوں سے سمی اپنی فیملی کے لیے کماتی ہے اور گھر کے سارے اخراجات کی ذمہ داری پوری کرتی ہے۔اس کے بھائی کی شادی ہو چکی ہے اس کے تین بچے ہوتے سمی کی شادی نہیں ہوئی ہے اور اس کے گھر والوں نے بھی اس مسئلے کبھی غور وفکر نہیں کیا جبکہ سمی شادی کرنا چاہتی ہے۔سمی کی دوستی سندیپ نام کے ایک آرٹسٹ Artist سے ہو جاتی ہے سمی اس سے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن سندیپ شادی شُدہ ہوتا ہے اسکی بیوی کا خیال کر کے سمی اپنی حدود میں رہنا چاہتی ہے۔سمی کا دماغی توازن اس ناول میں صاف نظر آتا ہے۔وہ سندیپ سے دور ہو جاتی ہے۔اس حادثے نے اس کے اندر جس بے نیازی کو قائم کیا وہ سمی کے دماغی توازن کا حال بیان کرتا ہے۔

دوسری بار سمی کی ملاقات ایشو سے ہو جاتی ہے جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھاتا ہے۔ایشو جب ممبئی چلا جاتا ہے تو سمی کو ایشو سے محبت کا احساس ہوتا ہے وہ ایشو کے خط کا انتظار کرتی رہتی ہے۔جب ایشو واپس آتا ہے سمی اس کو اسٹیشن لینے کے لیے جانا چاہتی ہے لیکن وہ منع کر دیتا ہے۔لیکن ایشو سمی سے پہلے جس لڑکی سے محبت کرتا ہے اس سے ملنے چلا جاتا ہے۔اور سمی سے ساری سچائی کا خلاصہ کر دیتا ہے اور سمی کو یہ احساس ہوتا ہے ایشو بھی بہت ساری لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور اور وہ بھی ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ہے اور سمی کو دوبارہ اکیلا پن بیدار ہو جاتا ہے اس لیے سمی بغیر پرواہ کیے ایشو کے ساتھ گیسٹ ہاؤس Guest house چلی جاتی ہے جہاں ایشو اور سمی کے درمیان جنسی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں آخر کار سمی کے اندر یہ اکیلا پن' ڈر' اجنبیت ہمیشہ کے

لیےختم ہوجاتی ہے۔سمی اب پہلے والی سمی نہیں رہی تھی وہ دوبارہ اویناش کو ملنے کے لیےفون کرتی ہےاوراویناش اس کے ڈرکودورکرنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے

اس ناول میں اجیت کور نے جدیداورسماجی رشتوں اورسمی کوsymbol کےطور پر پیش کیا ہے۔اجیت کور نے یہ بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے آج کل کی عورتوں اور مردوں کے فلسفے بالکل مختلف ہیں جووقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اپنے اپنے جنگل:

یہ ناول اجیت کور کا دیگر ناولوں کے مقابلے میں مختلف ناول ہے۔اس ناول میں اجیت کور نے عورتوں ومردوں کے ساتھ جُڑی کہانی کو پیش کیا ہے۔اس ناول کو اگر اجیت کور کا ایک سفر نامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اس ناول میں اجیت کوراس کی بیٹی ارپنااوراس کے شوہر ہریندرناول کے اہم کردار ہیں۔اس ناول میں چکوری نام کے ایک جنگل میں بنے ایک مہمان خانہ میں ٹھہرے چار خاندانوں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔اس ہاؤس میں پانچ کمرے ہیں پہلے کمرے میں دلی کا ایک وکیل اوراس کے بیوی بچے ٹھہرے ہوئے ہیں دوسرے کمرے میں کان پور کا ایک مل مالک اوراس کی بیوی رہتے ہیں تیسرے کمرے میں بہار سے آئے ہوئے میاں بیوی اوران کے بچے تھےاور چوتھے کمرے میں اس ناولٹ کی لکھنے والی اجیت کوراس کی بیٹی اوراس کا داماد رہتے ہیں۔اور پانچواں کمرہ بھی بُک تھا جو یو پی کے گورنر کے لیے ہے جب وہ وہاں رہنے کیلئے آتا ہے۔دھیرے دھیرے اس گھر میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگتے ہیں شام کوسب مل کر سیاسی، سماجی، رشوت خوری جیسے موضوعات پر بحث کرتے ہیں اور سرکاری عہدے جیسا کہ محکمہ بجلی، محکمہ تعلیم وغیرہ پر طنز کرتے ہیں اجیت کورایک جگہ جنگل کے

بارے میں رقمطراز ہیں:

''اس جنگل میں بیس دن بور نہیں ہوں گے واجپائی صاحب! جنگل کہاں نہیں؟ آپ سوچتے ہو گوالیار یا دِلی میں جنگل نہیں؟ ہر بندہ دوسرے کو دھکا مار کر گرا کے اُس کے آگے نہیں جانا چاہتا؟ دن رات یہی تو ہوتا ہے ہر بستی ہر شہر میں وہ نہیں جنگل کا قانون بلکہ جنگل میں تو آپ زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہو کیونکہ آپ کو پتہ ہے یہ لومڑی ہے، یہ شیر ہے، یہ بکری ہے، یہ گیدڑ ہے۔شہروں میں تو بکری کے بچے کی کھال پہن کر چلتے ہیں اُدھر زیادہ خطرہ ہے۔'' (اجیت کور دیاں گلپ رچناواں دی ناری وادی آلچونہ، ڈاکٹر نونیت کور دُگل۔ص ۱۴۶)

گوری:

اجیت کور کا ایک اہم ناول ہے۔اجیت کور کے باقی تمام ناولوں اور کہانیوں میں تقریباً عورتوں اور سماج سے تعلق سے رکھنے والی کہانیوں کو قلمبند کیا ہے۔اس ناول میں معاشرہ میں جو عورت پر ظُلم وستم صد یوں سے ہوتے آرہے ہیں مصنفہ نے بڑے خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے عورت پر سماج میں جو ظلم صدیوں سے چلتا آرہا ہے موصوفہ نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔گوری ناول میں اجیت کور نے جو حالات بیان کیے ہیں وہ قابل تعریف ہیں قاری ان کو پڑھ کر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ جو کچھ گوری کے ساتھ ہوتا ہے ہم سوچ بھی نہیں سکتے ہیں کہ ایک عورت بے زُبان جانور سے بھی بدتر ہوتی ہے۔اجیت کور کی ہر کہانی میں عورت کو مرد استعمال کرنے والی چیز سمجھتے ہیں اور صدیوں سے ایسا چلتا رہا ہے کہ عورت پر سماج میں طرح طرح کے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ناول میں ایک عورت کے دُکھ کے ساتھ ساتھ ایک ماں کی تکالیف کو بھی بیان کرنے

کی کوشش کی گئی ہے جس میں اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بیٹا اپنی ماں کی عصمت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔

ناول کا اہم کردار گوری ہے جس کے اردگرد یہ ساری کہانی گھومتی ہے۔ گوری کا گاؤں بڑودہ اور نرمدا دریا کے بیچ میں اُجڑے سنسان ایک ریتیلے علاقے میں واقعہ ہے۔ گوری کے والدین بہت غریب ہیں۔ گوری سے بڑی اس کی دو بہنیں ہیں اور گوری سب سے چھوٹی لڑکی ہوتی ہے۔ اس کے والدین بھی اس سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی تیسری بیٹی ہے گوری کا والد ہمیشہ گوری کی ماں کو دھمکی دیتا ہے اگر اس بار اور بیٹی پیدا ہوئی تو چھوڑ دوں گا لیکن کچھ عرصے بعد گوری کے بعد بیٹا جنم لیتا ہے۔ ناول میں ایک اور اہم کردار بابورام ہے جو گوری کی ساری زندگی کو بدل دیتا ہے۔ بابورام گوری کے گاؤں میں سڑک بنانے کے سلسلے میں آتا ہے۔ گاؤں میں غریبی کے باعث گوری اور اس کے گھر کے افراد سڑک بنانے کا کام کرتے ہیں۔ بابورام اپنے سسرال کے گھر رہتا ہے وہ اپنے سُسرال کا سارا کام کاج سنبھالتا ہے بابورام سُسر کی ساری جائیداد اپنے داماد کے سپرد کر دیتا ہے۔ بابو رام کی بیوی نہایت بدصورت عورت ہے اور نہ ہی اُسکے کوئی اولاد ہے۔ جب بابورام گوری کو دیکھتا ہے تو اس کے گھر والوں سے اجازت لے کر اُسکو گاؤں سے اپنی بیٹی بنا کر کلکتہ شہر لے آتا ہے وہ گوری کے ساتھ نوکر جیسا سلوک کرتا ہے وہ ہر وقت ایک بے زبان جانور کی طرح کام میں مصروف رہتی ہے۔ گوری ایک کم گو زبان لڑکی ہے وہ چُپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی رہتی ہے۔ جب گوری صرف آٹھ سال کی تھی بابورام نے اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالا اور جب گوری بارہ سال کی ہو جاتی ہے وہ بچی سے عورت بن جاتی ہے اور اپنے بطن سے بیٹے کو جنم دیتی ہے جس کا نام شنکر رکھا جاتا ہے شنکر پر گوری کا کوئی حق نہیں تھا۔ شنکر کو کبھی نہیں پتہ چلا کہ گوری اس کی ماں ہے بلکہ وہ سوشیلا کو اپنی ماں سمجھتا ہے گوری کے ساتھ نوکر جیسا سلوک کرتا ہے۔ ناول کے آخر میں شنکر بھی اپنے مرد ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور اپنی ماں ''گوری'' اپنے ہی بیٹے سے عصمت دری کا شکار ہو جاتی ہے گوری ایک

بے بس عورت کی طرح سب کچھ برداشت کرتی رہتی ہے اور گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔مجموعی طور پر گوری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عورت جو بچپن میں اپنے ماں باپ سے ڈری رہی پھر اُسے مرد ڈراتا رہا جو اُس کو باندی بنا کر رکھتا ہے۔اس باندی سے اپنا وارث پیدا کرتا ہے۔پھر اُس مرد سے ڈرتی رہی جو اس کا اپنا خون تھا جس نے گوری کے کوکھ سے جنم لیا تھا۔اُس نے بھی گوری کو وراثت میں ملی جائیداد کا مالک سمجھ کر اس کا استعمال کرتا ہے اور گوری کو کوڑا کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ اجیت کور کی کہانیاں مثلاً گُل بانو' مہک دی موت۔فالتو عورت۔موت علی بابے دی۔نومبر چوراسی۔اک مریا ہوا پل۔کمرہ نمبر اٹھ۔پنج روپے والا کم۔ہارڈ وائر بوٹل۔مہک دی موت۔سولی اتے لٹکے پل۔مامی۔ماں پتر۔اِک پوٹریٹ۔میرا کمرہ۔دیور بھابی۔ہارٹ واٹر بوٹل وغیرہ کہانیوں میں عورتوں کے جذبات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اجیت کور نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں عورتوں کے مسائل کو اُبھارا ہے۔انہوں نے عصمت چغتائی کی طرح اپنی کہانیوں میں زیادہ تر جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہے اور ان موضوعات کو نوکِ قلم کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔اجیت کور نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے حادثات کو بڑی نزدیکی سے دیکھا اور پرکھا ہے یہی پرکھ اور زندگی سے مایوس کُن حالات کو موصوفہ نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں قلمبند کیا ہے۔

باب پنجم:

پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ

۱۔ موضوعات کے حوالے سے

۲۔ تہذیبی وثقافتی حوالے سے

۳۔ زبان وبیان کے حوالے سے

۱۔ موضوعات کے حوالے سے

ادب اور زندگی ہمیشہ سے ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں۔ انیسوں صدی میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی شروع ہوگئی تھی۔ جس سے ادب میں تبدیلی آنا بھی فطری بات تھی۔ سماجی وتہذیبی اقدار میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے قلم کاروں کی ادبی سوچ میں بھی نئے نئے زاویے ابھرنے لگے تھے۔ ہندوستان ادب کی اہم ترین داستان جیسی بے جھول اور طویل صنف زوال پذیر ہونے لگی تھی اور ناول نگاری کو فروغ ملنے لگا۔

انیسویں کی آخری دہائی تک سبھی ہندوستانی زبانوں نے ناول نگاری کو قبول کرلیا تھا اور ان کے ادیبوں نے ناول لکھنے شروع کر دئے تھے۔ پنجاب میں انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد آخر میں ۱۸۵۰ء کے قریب داخل ہوئے تھے۔ جس کی بنا پر پنجاب میں ناول نگاری کی صنف دوسری زبانوں کے مقابلے میں دیر سے آئی۔ اردو میں انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں پہلا ناول لکھا گیا جبکہ پنجابی میں اس سے غالباً تیس سال بعد ۱۸۹۹ء میں پہلا پنجابی ناول وجود میں آیا۔

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے دو اہم مقاصد تھے۔

۱۔ بیوپار کے ذریعے مال ودولت کمانا۔

۲۔ عیسائی دھرم کا پرچار کرنا۔

انگریزوں نے عیسائی دھرم کی دعوت وتبلیغ کرنے کے لیے اشاعت وطباعت کو ذریعہ بنایا۔ پنجاب میں عیسائی دھرم کا پرچار کرنے کی غرض سے انھوں نے پنجابی میں ناول نگاری کا آغاز کیا۔ ابتداء میں پنجاب میں

ناول انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے گئے۔ عیسائی دھرم کے فروغ کے لئے ۱۸۵۹ء میں ایک ناول ''مسیحی مسافر دی یاترا'' انگریزی سے پنجابی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا جو کہ مشہور انگریز ناول نگار جان بنی کا تخلیق کردہ تھا۔ اس ناول میں عیسائی دھرم کو دنیا کا سب سے بہتر مذہب کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی عیسائی مذہب کا تعارف اور تعلیمات پیش کی گئی تھیں۔

پنجابی کا باقاعدہ پہلا ناول ۱۸۸۲ء میں ''جیوتر دیو'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ قابل ذکر ہے کہ یہ ناول عیسائی مشنریوں کی طرف سے شائع کیا گیا۔ جس کا مقصد بھی عیسائی مذہب کی تشہیر ہی تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں موضوع کے اعتبار سے ابتدائی دور کے پنجابی ناول مذہبی نوعیت کے تھے۔ جن کا واحد مقصد عیسائی مذہب کی بڑائی بیان کرنا تھا۔

سکھ مذہب کے دانشوروں اور قلم کاروں نے عیسائیت کے پرچار کو روکنے کے کئی اہم اقدام کئے۔ ٹھاکر سنگھ سندھاوالیا اور کلیر سنگھ نے ۱۸۷۳ء میں سنگھ سبھا تحریک قائم کی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر چرن سنگھ شہید اور بھائی ویر سنگھ نے بھگتی تحریک کو بنیاد بنا کر ناول لکھے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے پنجابی میں ناول نگاری کا آغاز کیا اور پنجاب کے سکھ قلم کاروں نے پنجابی میں ناول نگاری کی صنف کو قبول کرتے ہوئے اپنے ناولوں کے ذریعے جہاں عیسائیت کی کاٹ کی وہیں سکھ مذہب کے اصولوں اور تعلیمات کو اپنے ناولوں میں موضوع بنایا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی ناول کا ابتدائی دور عیسائی اور سکھ مذہب کے رنگ میں رنگا تھا۔

پھر کچھ عرصہ بعد میراں بخش منہاس نے اپنے ناول ''جٹ دی کرتوت'' کے ذریعے سماجی مسائل کو پہلی بار پنجابی ناول کا موضوع بنایا۔ اس طرح پنجابی ناول کا سفر مذہبی ناول سے سماجی ناول کی طرف گامزن

ہو گیا۔ بقول ناشر نقوی:

''پنجابی کے ابتدائی ناولوں میں بھائی ویر سنگھ جنہیں پہلا پنجابی ناول نگار مانا گیا ہے، کے ناول ''سندری'' اور وجے سنگھ کے ناول ''ستونت کور'' میں بھی مذہبی اور روحانی مزاج جلوہ گر ہے۔ مذہبی دائرے سے پنجابی ناول کو میراں بخش منہاس نے نکالا انہوں نے سماجی مسائل پر توجہ مبذول کرائی۔ منہاس کا ناول ''جٹ دی کرتوت'' پنجابی میں پہلا ناول ہے جس میں زندگی کی تصویر کشی ہوئی ہے۔''

(پنجاب اور اُردو افسانہ، ص۱۳)

بعدازاں چرن سنگھ شہید، بھائی ویر سنگھ اور موہن سنگھ وید نے تاریخی، سماجی اور رومانوی ناول لکھے۔ جس سے موضوعاتی اعتبار سے پنجابی ناول کا دائرہ وسیع ہو گیا اور نئے ناول نگاروں کے لئے نئی راہیں ہموار ہوئیں۔

انگریز بہت ظالم اور بے رحم تھے۔ وہ ہندوستانیوں پر بہت ظلم و جبر کرتے تھے۔ ہمارے قلم کاروں سے یہ زیادتیاں برداشت نہ ہوئیں جس کے نتیجے میں پنجابی ناول میں قومیت کے جذبے سے سرشار ناول لکھے جانے لگے۔ تاکہ قوم کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جا سکے اور انگریزوں سے آزادی حاصل کی جا سکے۔ کیسر سنگھ کے ناول قومیت کے جذبے سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ بقول گورلال سنگھ:

''ناول نگار کیسر سنگھ پنجابی ناول کی تاریخ میں ایک ایسا امتیازی نام ہے جس نے ہندوستان کی آزادی سے متعلق ایک اہم تحریک 'غدر' (تحریک) کو قومی نظریے سے اپنے تقریباً سبھی ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔''

(سہ ماہی ''پنجابی'' انٹرنیشنل ڈائریکٹری سیریز، کنیڈا، ص۹)

دیش میں آزادی کی لہر نے زور پکڑا تو پنجابیوں نے آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کی اس لڑائی میں پنجابی

کے ناول نگاروں نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ پنجابی ناول نگاروں نے جنگ آزادی میں پنجابیوں کے رول کو موضوع بنا کر ناول لکھے اور انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کو جہاں بیدار کیا وہیں اپنی مٹی کا قرض ادا کیا۔ جنگ آزادی کے موضوعات کو لے کر تحریر کردہ پنجابی ناولوں میں شہید اودھم سنگھ، لہر ودھدی گئی اور جنگی قیدی قابل ذکر ہیں۔

نانک سنگھ کا نام پنجابی ناول نگاری کے میدان میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف نے پنجابی ناول نگاری میں نئے نئے تجربات کئے اور نئے نئے موضوعات پر لکھ کر پنجابی ناول نگاری کو موضوعات کے اعتبار نئے آسمان فراہم کئے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستانی ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ پنجابی ناول بھی اس تحریک سے متاثر ہوا۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر سریندر سنگھ نرولا نے ناول ''رنگ محل''، جسونت سنگھ کنول نے ''رات باقی ہے''، اوم پرکاش گاسوں نے ناول ''پنچنا''، جسونت سنگھ راہی نے ناول ''ادھورا سفر'' اور رام سروپ انکھی نے ناول ''کوٹھے کھڑک سنگھ'' تحریر کیا۔

تقسیم وطن کے خونی سانحہ نے پنجاب کا ادبی، سیاسی، سماجی اور معاشی نظام ہی درہم برہم کر دیا۔ جس سے پنجابی ناول کا متاثر ہوا اور نتیجے کے طور پر پنجابی ناول نگاری میں ایک نیا موضوع ''سانحۂ تقسیم وطن'' آ گیا جس کے تحت تقسیم وطن کے دوران رونما ہونے والے واقعات وحادثات کو پنجابی ناولوں میں پرویا گیا۔ تقسیم وطن کے خونی واقعات کو ناول کی شکل دینے والوں میں کرتار سنگھ دُگل، سریندر سنگھ نرولا، امریتا پریتم اور سوہن سنگھ سیتل کے ناول قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا منظر نامہ بدل چکا تھا۔ جہاں ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی، زمینداروں اور جاگیرداروں سے نجات مل گئی تھی وہیں ملک کی از سرِ نو تعمیر کے مسائل منہ کھولے سامنے کھڑے تھے۔ اس

طرح آزادی کے بعد پنجابی ناول میں نئے نئے موضوعات کا اضافہ ہوا۔ حب الوطنی، جنسیات، عورت کی زندگی میں سدھار اور غریبی جیسے موضوعات پنجابی ناول نگاری کا حصّہ بنے۔ یہاں پر یہ واضح کرنا بے حد ضروری ہے کہ آزادی کے بعد پنجابی ناول دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ اس طرح دو الگ الگ ممالک میں لکھے گئے پنجابی ناول موضوعات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اگر آج کہ تناظر کی بات کی جائے و پنجابی ادب میں آج ہر قسم کے موضوعات پر ناول لکھے جا رہے ہیں۔ پنجابی ناول کا دائرہ اب ہندوستان اور پاکستان سے ہوتے ہوئے دنیا بھر میں پھیل گیا ہے جس کے نتیجے میں پنجابی ناولوں میں موضوعات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔

زیر بحث باب میں ہم نے پنجابی سے اردو میں درآمد ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔ پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کی فہرست کچھ یوں ہے۔

ناول	....	ناول نگار
مڑھی دا دیوا		گوردیال سنگھ
چٹا خون		نانک سنگھ
پوتر پاپی		نانک سنگھ
آدم خور		نانک سنگھ
بھابھی مینا		گوربخش سنگھ
بن بیاہی ماں		گوربخش سنگھ
دُوادشی		کلونت سنگھ ورک

پنجر	امریتا پریتم
ناگ منی	امریتا پریتم
بند دروازہ	امریتا پریتم
ساگر سپیاں اور ساگر	امریتا پریتم
گوری	اجیت کور

نانک سنگھ:

نانک سنگھ پنجابی ناول نگاری کا اہم ستون ہے۔ انہوں نے جب پنجابی ناول نگاری میں قدم رکھا تو اُس وقت پنجابی ناول پر عیسائیت اور سکھ مت کا رنگ غالب تھا۔ نانک سنگھ اس رنگ میں نہیں رنگے بلکہ انھوں نے سماجی، رومانی، معاشرتی، اصلاحِ نسواں، ذات پات، اونچ نیچ، غیر ضروری رسومات، حب الوطنی اور تقسیم وطن کے سانحہ جیسے موضوعات پر بے شمار ناول لکھ کر پنجابی ناول کو جہاں نئے نئے موضوعات اور نئے نئے تجربات سے ہمکنار کیا وہیں پنجابی ناول کو اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا۔

نانک سنگھ کے مندرجہ ذیل تین ناول پنجابی سے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

۱۔ چٹا لہو : نانک سنگھ کے ناول ''چٹا لہو'' کا اردو ترجمہ ''سفید خون' رتن سنگھ نے کیا ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے شائع کیا ہے۔

۲۔ آدم خور : نانک سنگھ کے ناول '' آدم خور'' کا اردو ترجمہ پرکاش پنڈت نے کیا ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے شائع کیا ہے۔

۲۔ پوتر پاپی: نانک سنگھ کے ناول ''پوتر پاپی'' کا اردو ترجمہ رام لعل نابھوی نے کیا ہے جسے بھاشا و بھاگ پنجاب، پٹیالہ نے شائع کیا ہے۔

''سفید خون'' سماجی قسم کا ناول ہے۔ جس میں رومانٹک ناول کے عناصر بھی شامل ہیں۔ پورے ناول کی کہانی کو تین الفاظ عشق، جنگ اور بدلے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سندری اور بچن سنگھ میں عشق ہوتا ہے، پالا سنگھ بھی سندری پر بری نظر رکھتا ہے اور بچن سنگھ کا دشمن بن جاتا ہے اور غلط کیس میں بچن سنگھ کو پھنسا کر پھانسی دلوا دیتا ہے۔ سندر گائل شیرنی کی طرح اپنے عاشق کی موت کا بدلہ لیتی ہے اور پالا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو زندہ جلا دیتی ہے۔

اس ناول کے ذریعے نانک سنگھ نے پنجابی ناول میں پہلی بار ہندوستانی عورت کو اس روپ میں پیش کیا ہے۔ ناول میں سکھ دھرم کی عقیدت گاہیں یعنی گوردواروں میں پاٹھی کی جانب سے نشہ کرانے کے معاملہ کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ناول ''سفید خون'' سماجی، رومانی اور اصلاحی عناصر کے خمیر سے تیار کیا گیا ناول ہے۔ ناول کے آغاز میں ناول نگار نے ادیبوں کی کسمپرسی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بقول پرنسپل تیجا سنگھ:

> ''جو کمال انھوں یہ ناول ''چٹا لہو'' (سفید خون) لکھنے میں دِکھایا ہے وہ پہلے نہیں دِکھایا تھا۔ پہلے تو وہ معاشرے کی کوئی ایک دو خامیوں کو لے کر ہی ناول لکھتے تھے۔ لیکن اس بار تو سارے کے سارے معاشرے کو مضبوط ہاتھ سے جھنجھوڑا ہے اور ہر طرف سے وہ چوٹیں لگائی ہیں کہ اس ناول کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا جائے تو سدھار کی اُمید کی جا سکتی ہے جہالت، چھوت چھات، منشیات کا استعمال، بیاہ شادی سے متعلق بری رسمیں، عورت ذات، خاص کر بیوہ پر ظلم، گوردواروں کی طرف سے لاپرواہی، بات بات پر جھگڑے، مقدمے بازی وغیرہ کی علّتیں اور بھیڑ چال، یہ

سب اِس خوبصورتی سے ناول میں گندھے ہیں کہ پڑھنے والے کے دِل پر بہت جلد

اور گہرا اثر پڑتا ہے۔''

(ناول ''سفید خون''، ص۱۰)

امریتا پریتم:

امریتا پریتم کا نام پنجابی ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ادب کے علاوہ عالمی ادب میں بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ امریتا پریتم نے ہر طرح کے موضوعات پر ناول لکھے ہیں۔ موصوفہ نے رومانی، سماجی، فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم وطن کا خونی سانحہ اور ہندوستانی عورت کی ناقابلِ برداشت حال اور مسائل کو اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اُن کے مندرجہ ذیل ناول پنجابی سے اردو میں ترجمہ ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

۱۔ پنجر ۲۔ ناگ منی ۳۔ بند دروازہ

۴۔ ساگر سپیاں اور ساگر

قابل ذکر ہے کہ ان میں ناول ''پنجر'' کو چھوڑ کر باقی سبھی ناول سٹار پاکٹ بکس، دہلی کی جانب سے شائع کیے گئے تھے۔

ناول ''پنجر'' مذہبی فرقہ پرستی اور تقسیم وطن کے خونی سانحہ کے موضوع پر مبنی ناول ہے۔ جس میں ہندو مسلمانوں کی پرانی رنجش کی شکار اُن کی عورتیں ہوتی ہیں۔ رشید نامی مسلمان نوجوان پارو کو اغوا کر کے اس سے شادی کرتا ہے کیونکہ پارو کے خاندان والوں نے ماضی میں رشید کی بوآ کا اغوا کر کے اس کو تین رات تک اپنے گھر میں رکھا گیا۔ پارو اس بدلے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اسی بیچ ملک تقسیم ہو جاتا ہے اور فرقہ وارانہ فسادات برپا

ہو جاتے ہیں۔ پارو اس موقع پر اپنے اُس پریوار کی بہو کو جس نے اُسے رشید کے گھر سے بھاگ جانے کے بعد اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ ناول ''پنجر'' میں پارو ہندوستانی عورت کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے جو ہر حال میں، مشکل سے مشکل حالات میں جینے کا ہنر جانتی ہے۔ امریتا پریتم ناول ''پنجر'' کے موضوع کا احاطہ کچھ یوں کرتی ہے:

> ''عورت کی بے بسی، محبت اور ایثار کی المناک کہانی......عورت جو سماج کی فرسودہ روایات اور انتقام کا شکار ہوئی۔ جو اپنے پرانے رشتے، ناتے اور کنُبے کو نہ بھلا سکی، جس کے بطن سے بیٹا پیدا ہوا لیکن اُسے وہ ماں کا پیار نہ دے سکی اور پھر موقع ملنے پر بھی اپنے اُسی بیٹے کی خاطر وہ واپس نہ جا سکی......اپنے کنُبے میں، اپنے سماج میں۔''
>
> (ناول ''خلش''، بیک کور، ہند پاکٹ بکس، دہلی)

امریتا پریتم کا ناول ''ناگ منی'' ہند پاکٹ بکس، دہلی کی جانب سے پنجابی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ 'ناگ منی' ایک رومانی ناول ہے جس میں محبت کو فن کے راستہ کی رُکاوٹ ماننے والے ایک مصّور......اور محبت پر اور محبت کی غیبی طاقت میں بے پناہ اعتقاد رکھنے والی ایک باغیرت، مجبور ہو کر بھی مستحکم اور بدلے میں بغیر کچھ پائے ہی سب کچھ دے دینے کے جذبے سے سرشار ایک انوکھی لڑکی کی کہانی ہے۔

امریتا کے ناول ''دو آوازیں'' کا پنجابی سے اردو میں ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے جو سٹار پاکٹ بک سیریز، دہلی کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ناول آپ بیتی کے انداز میں لکھا گیا ہے جو ایک معاشرتی ناول ہے۔ جس میں امریتا نے سماج کے ایک مخصوص اور اہم طبقے ایک آرٹسٹ کی نبض کو چھوا ہے۔ مخمور جالندھری اس ناول کے موضوع کے متعلق رقم طراز ہیں:

''دوآوازیں'' ان کی تازہ ترین تخلیق ہے جس میں انہوں نے ایک آرٹسٹ کی زندگی

کواپنے الفاظ میں ایک اور زندگی دی ہے۔''

(ناول ''دوآوازیں''، بیک کور، سٹار پاکٹ بک سیریز، دہلی)

امریتا پریتم کا ناول ''بند دروازہ'' مشورہ بک ڈپو، دہلی کی جانب سے پنجابی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ناول ''بند دروازہ'' سیرتی یا کرداری قسم کے ناول کے زمرے میں آتا ہے۔ناول نگار نے اس ناول میں ایک عورت کی درد بھری کہانی ہی پیش نہیں کی بلکہ یہ دنیا کی ہر عورت کی کہانی ہے۔کیونکہ قدم قدم پر پابندیوں کی زنجیر اُس کے پاؤں میں ڈالی جاتی ہے۔امریتا نے اس ناول میں عورت کے چار کردار بیٹی، محبوبہ، بیوی اور والدہ کے روپ میں پیش کیئے ہیں۔عورت ان چاروں کرداروں میں ظلم کی شکار ہوتی ہے۔اس لئے اس کے لئے زندگی کا ہر دروازہ بند ہے۔امریتا پریتم کے الفاظ میں:

''بند دروازے کے اُس پار کیا ہے؟

آنسو ہیں، سسکیاں ہیں.................

کہ خوشی و مسّرت ہے؟

کون جانے...........

(ناول ''بند دروازہ'' ص۱)

امریتا پریتم کا ناول ''دھرتی ساگر اور سپیاں'' ایک رومانی ناول ہے۔جس میں جنسیات کے عناصر بھی شامل ہیں۔اس ناول میں جینا نام کی ایک لڑکی ایک اقبال نام کے لڑکے سے جنسی تعلقات بناتی ہے جس کے نتیجے میں وہ ماں بن جاتی ہے۔اقبال اُس کے قریب آنے سے پہلے جینا سے یہ کہتا ہے کہ وہ اُس سے شادی نہیں کر پائے گا۔لیکن جینا اقبال کو بے پناہ پیار کرتی ہے اور اُس کو پوری طرح پانا چاہتی ہے اور وہ حد سے گزر جاتی

ہے۔ جینا ایک حوصلہ منداور ذہین لڑکی ہے۔ وہ اپنی ناجائز اولاد کو پہلے آشرم میں لاوارث کہہ کر بھرتی کروا دیتی ہےاور بعد میں خود ہی گود لے لیتی ہے۔اس طرح جینا کا سماج میں کنوارہ پن بھی برقرار رہتا ہےاور وہ اپنے بچے کو بھی پالتی ہے۔

اجیت کور:

آزادی کے بعد پنجابی میں ناول لکھنے والوں میں اجیت کور کا نام پیش پیش ہے۔انہوں نے پنجابی ناول میں اپنے ناولوں کے ذریعے نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔اجیت کور نے روایت سے ہٹ کر پنجاب سے متعلق لکھنے کی بجائے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے ایسے مسائل کو پیش کیا ہے جن کو پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔موصوفہ نہایت بے باک، بے جھجک اور حوصلہ مند ادیبہ ہے۔

اجیت کور کے ناول ''گوری'' کا پنجابی سے اردو میں ترجمہ خالد محمود نے کیا ہے جو کہ ایک معاشرتی ناول ہے۔اس ناول کی کہانی انسانی رشتوں اور حیوانی جذبات کے درمیان ایک لرزہ خیز مکالمہ ہے۔ناول ''گوری'' بلاشبہ ایک لڑکی گوری کی کہانی ہے۔لیکن ناول نگار نے اس ناول کے ذریعے ایک پورے معاشرے کی عورتوں کی حالت پیش کی ہے۔اس خطے میں ایک بکری کے بدلے میں عورت بیچ دی جاتی ہے۔ یہاں پرلڑکی کی پیدائش کی ذمہ دار ماں کو ٹھہرایا جاتا ہے لکھتے ہیں:

> ''چلو یار کی یاری کی خاطر ایک موقع اور سہی۔بس آخری موقع۔اگر چوتھی بھی لڑکی ہی ہوگی تو وہ ضرور کوئی لڑکا پیدا کرنے والی دوسری عورت بیاہ لائے گا۔آخر برادری کو بھی معلوم ہو کہ اس کی مردانگی میں کوئی کمی نہیں۔اس کا بیج تو ہمیشہ ہی عمدہ تھا لیکن

یہ زمین سالہ..........''

(ناول ''گوری'' ص۳۱)

ناول نگار نے بڑودہ اور نرمداندی کے درمیان اجاڑ سنسان علاقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کو موضوع بنایا ہے۔ جو دنیا جہان سے الگ تھلگ ہے۔ کھانے کے لئے صرف ابلے ہوئے چاول اور پینے کے تاڑی ہے۔ ناول ''گوری'' میں اجیت کور نے ہندوستان کے نہایت ہی پسماندہ علاقے کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اور سرکاری ایوانوں میں سو رہے ملک کے پہرے داروں کی توجہ اس طرف مرکوز کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلاشبہ اجیت کور کے ہاں موضوعات کی تازگی ہے ان کے موضوع بالکل منفرد ہوتے ہیں۔

گوردیال سنگھ:

گوردیال سنگھ کا شمار پنجابی ناول نگاری میں جدید رجحانات کو لانے والے ممتاز ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف نے پنجاب کی دیہاتی زندگی سے جڑے موضوعات کو اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ انھوں نے پنجابی ناول میں اپنے دور میں رائج رومانیت سے پرہیز کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اپنایا۔ بقول ڈاکٹر مدن لال ہسیجہ:

> ''اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو شہرت آپ کو ناول ''مڑھی دا دیوا' کے باعث حاصل ہوئی وہ کسی اور ناول کی وجہ سے نہیں ہو سکی.......اِس سے قبل پنجابی ناول زیادہ تر تصوریت اور رومانیت کے گرداب میں گھرا ہوا تھا۔ 'مڑھی کا دیوا' کے ساتھ پنجابی ناول نے وقت کی پکار کو سُنا اور زندگی کے حقائق اِس کا موضوع بنے۔ اِس کی تخلیق میں اِس دھرتی کی مخلوق کی دکھ درد کی داستان کو بڑے فنکارانہ طریقے

سے لوگوں کی اپنی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔''

(ناول ''مڑھی کا دیوا''، ص۴)

گوردیال سنگھ کے ناول ''مڑھی کا دیوا'' کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نریش نے کیا ہے جسے بھاشا وبھاگ پنجاب نے شائع کیا ہے۔ اس ناول کا موضوع پنجاب کے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے اردگرد گھومتا ہے۔ جس میں جگسیر کے دلت پریوار کو جاگیردار دھرم سنگھ کے پریوار سے ملی نسل درنسل زمین اُس کا بیٹا چھین لیتا ہے۔ جگسیر کا پریوار زمین سے محروم ہوکر اور غریب ہو جاتا ہے۔ جس سے جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے دو پریواروں کی صدیوں پرانی سانجھ اور اپنایت ختم ہو جاتی ہے۔

گوربخش سنگھ:

گوربخش سنگھ پریت لڑی کا شمار بھی پنجابی کے صف اول کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کا ادبی سفر کئی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ آپ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقی زندگی کے حقائق کو موضوع بنایا جس کی بنا پر وہ اپنے علاقے میں بدنام ہو گئے۔ گوربخش سنگھ اس ضمن میں خود رقم طراز ہیں:

> ''بن بیاہی ماں'' میرا وہ ناول ہے، جس نے مجھ سے میرے کئی ہمدرد چھین لئے، کئی احباب کے گھروں سے مجھے اور 'پریت لڑی' کو ہمیشہ کے لئے بے دخل کر دیا۔ کئی ایسے اصحاب سے جو مجھے شریف آدمی خیال کرتے تھے، بدمعاش کا لقب دلایا لیکن 'بن بیاہی ماں' اور کچھ بھی نہیں..... یہ میری روح ہے۔''

(ناول ''بن بیاہی ماں''، ص۱)

گوربخش کے ناول 'بن بیاہی ماں'' کا اردو ترجمہ ہند پاکٹ بکس، دہلی کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس

ناول میں ایک سماجی واقعہ کوموضوع بنایا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ناول ایک عورت کی کہانی پر مبنی ہے جو شادی کے بغیر ماں بننے والی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار پربھا نام کی ایک لڑکی ہے۔ جو شادی سے پہلے چترنجن سے جسمانی تعلقات بنالیتی ہے کیونکہ چترنجن کو پھانسی ہوجاتی ہے۔ پربھا کا والداس بچے کوگرانا چاہتا ہے۔لیکن پربھا نہیں مانتی اور بن بیاہی ماں بن جاتی ہے لکھتے ہیں:

''باپ کہتا ہے کہ وہ شدنی کی ساری شہادت راہ سے دور کرکے پربھا کی شادی کسی اچھے اور ہونہار نوجوان سے کردے گا اوراس واقعہ کی کسی کوکانوں کان خبر نہ ہوگی لیکن پربھا اپنے کئے کی پوری قیمت ادا کرنے پر بضد ہے۔ اپنی کوکھ کے بچے کوکسی کی امانت سمجھتی ہےاوراس امانت کی سچی امین بننے کے لئے ساری دنیا کا غیظ وغضب برداشت کرنے کوتیار ہوجاتی ہے۔''

(ناول ''بن بیاہی ماں''، ص۱۵)

المختصر یہ کہ پنجابی سے اردو میں درآمد ناولوں کے موضوعات زندگی کے مختلف شعبوں سے جوہری کی مانند منتخب کئے گئے ہیں۔لیکن بیشتر ناولوں میں ہندوستانی عورت کے مسائل کے علاوہ اس کے بڑھتی ہوئی ہمت اورطاقت کوبھی پیش کیا گیا ہے جو ہندوستانی سماج کے لئے خوش آئندہ بات ہے ورنہ صدیوں سے یہاں کی عورت مرد کے ساتھ ہی ستی ہوتی رہی ہے۔ ہندوستانی عورت کے کئی نئے روپ ان ناولوں کے ذریعے ہمارے سامنے آئے ہیں۔موضوعاتی اعتبار سے پنجابی سے اردو میں درآمد ناول اچھوتے ہیں۔اُمید ہے کہ اردو قارئین پنجابی ناولوں کی رنگارنگی سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔

☆☆☆

۲۔ تہذیبی وثقافتی حوالے سے

ادب سماج کا آئینہ ہے۔قلم کار اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات اور اپنے عہد کے مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔اس طرح وہ غیر شعوری طور پر اپنے خطّے کی تہذیب وثقافت کے عناصر کو مرتب کرنا چاہتا ہے۔تاریخ میں جہاں ہمیں کسی قوم یا تہذیب کے واقعات ہی پڑھنے کو ملتے ہیں وہیں اُس تہذیب

کے ادب میں اُس کی قوم کے رہن سہن، کھان پان، پہناوے، کاروبار اور بول چال کی زبان کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے ایک مقالے میں کلچر سے متعلق ٹائیلر کا نظریہ نقل کیا ہے:

''کلچر وہ کمپلیکس(complex) ہے جس میں علم' عقیدہ' آرٹ' اخلاق' قانون رسم ورواج اور وہ تمام صلاحتیں شامل ہیں جو آدمی نے سماج کے فرد کی حیثیت سے حاصل کی ہے''

(اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب' ڈاکٹر قامل قریشی' ص۸۲)

دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں کی طرح پنجابی ادب کے قلم کاروں نے بھی اپنے اردگرد کے حالات کو اپنی تحریروں میں پیش کیا گیا ہے۔اس طرح پنجابی ادب کے سینے میں پنجاب کا صدیوں پرانا تہذیبی وثقافتی اثاثہ محفوظ ہے۔ادب میں کسی خطّے کے تہذیبی وثقافتی اقدار کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ناول نگاری ہے۔ناول کسی بھی علاقے کی پوری تہذیب وثقافت کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے۔

پنجابی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔جس میں بیرونی علاقوں کے حملہ آوروں کی آمد کی وجہ سے وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔پنجاب کے باشندے روزِ اوّل سے ہی محنتی، نڈر، بے خوف اور اصولی زندگی جینے کے عادی رہے ہیں۔صدیوں پہلے سرزمین پنجاب پر تہذیبی وفکری اقدار نے جنم لے لیا۔جس سے ملک بھر کے علاقے متاثر ہوئے۔بقول راجندر سنگھ بیدی:

''وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھویں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی ہے.....پنجاب اور پنجابی ناش نہیں ہوسکتے۔نامعلوم انھوں نے کون سی امرکتھا سنی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے، زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری نہیں ہوتی۔وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں

رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کنگھال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں۔''

(ناول ''ایک چادر میلی سی''، ص ۵)

ہندوستان مختلف قوموں، تہذیبوں، مذہبوں اور مختلف رنگ ونسل کے افراد سے مل کر بنا ایک خوبصورت رنگا رنگ گلدستہ ہے۔ اس کے ہر خطّے، ہر علاقے کا رہن سہن، کھان پان، پہناوا، رسم و رواج، آب و ہوا، پھل، پھول، جغرافیائی اور تاریخی سطح سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ ہندوستان کی اسی انیکتا میں ایکتا ہے۔ انہی میں سے ایک منفرد قسم کا علاقہ پنجاب ہے۔ پنجاب اپنی جغرافیائی بناوٹ، تاریخ، تہذیب و ثقافت، زبان اور سیاسی اعتبار سے باقی کے ہندوستان سے بالکل مختلف ہے۔

پنجابی تہذیب وثقافت کی یہی خوبیاں پنجابی سے اردو میں درآمد ناولوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ضمن میں نانک سنگھ کا ناول ''سفید خون'' اور ''پوتر پاپی''، امریتا پریتم کا ناول ''پنجر''، ''بند دروازہ''، ''دھرتی ساگر دی سپیاں'' اور ''خلش''، گوردیال سنگھ کا نام ''مڑھی دا دیوا'' اور گوربخش سنگھ کا نام ''بن بیاہی ماں'' قابل ذکر ہیں۔ پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ یہ ناول پنجابی تہذیب وثقافت کے بہترین نمونے ہیں۔

پنجاب کو اگر جغرافیائی پہلو سے دیکھیں تو اس کی خوش حالی اور آسودہ مزاجی کا راز سمجھ میں آتا ہے۔ خدا نے پنجاب کو پانچ دریاؤں میں بڑے طویل زرخیز میدان عطا کئے ہیں۔ جن میں بے پناہ اناج پیدا ہوتا ہے اور ہندوستان کے بہت سے صوبے پنجاب کے اسی اناج سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ پنجاب کے بیشتر لوگ کھیتی کرتے ہیں اور خوش حال زندگی گزارتے ہیں۔ جسمانی کام کرنے اور کھل کر خوراک کھانے کی وجہ سے یہاں کے باشندے جسمانی طور سے طاقتور ہوتے ہیں۔ ناول ''سفید خون'' کے جیوا سنگھ، بچن سنگھ اور پالا سنگھ کسان ہیں جو کھیتی کرتے ہیں۔ اسی طرح ناول ''پنجر'' کا رشید، موہن لال اور پارو کا بھائی سبھی کھیتی کرتے ہیں۔ پارو بھی رشید

کے ساتھ کھیتی کرتی ہے۔ گھر کے کام کاج کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا لے کر وہ کھیتوں میں چلی جاتی ہے اور رشید کے ہمراہ کھیتی کرتی ہے۔ پنجاب کے مردوں کی طرح یہاں کی عورتیں بھی محنتی ہیں وہ مردوں کے ہمراہ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔

پنجاب میں زمین کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جس کے پاس جتنی زمین اُس کو اتنا ہی امیر سمجھا جاتا ہے۔ ناول ''مڑی دا دیوا'' میں جاگیردارانہ سماج کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جن کے لئے زمین سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں۔ جاگیردار دھرم سنگھ کا بیٹا اپنی فیملی کے وفادار مزدور پریوار جگسیر سے اس کو تحفے کے روپ میں دیا گیا کھیت چھین لیتا ہے کیونکہ اس کے لئے زمین سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اسی طرح ناول ''سفید خون'' کا لفنگا پالا سنگھ زمین بیچ بیچ کر کھاتا رہتا ہے۔

دودھ پنجابی کی سب سے اہم خوراک ہے بلکہ یوں کہئے پنجابی کلچر کا ایک اہم عنصر ہے۔ پنجاب کے لوگ ماضی میں بھی اور آج بھی اپنے گھروں میں بھینسیں رکھتے ہیں اور صبح وشام دودھ پیتے ہیں۔ ناول ''پنجر'' کی پارو اور ناول ''سفید خون'' کی سدا کورا اپنے گھر میں بھینسیں رکھی ہے۔ اسی دودھ کی طاقت سے پنجابی اپنے کھیتوں میں ہل جوتتے ہیں اور دن بھر محنت کرتے ہیں۔

پنجابی سے اردو میں درآمد تقریباً سبھی ناول صرف گوری کو چھوڑ کر آزادی سے پہلے لکھے گئے ہیں یعنی اُن ناولوں کا تعلق مشترکہ پنجاب سے ہے۔ اُس پنجاب سے ہے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ عام طور پر سبھی مذہب کے لوگ مل جل کر پیار سے رہتے تھے۔ لیکن جب کبھی کسی بات پر دشمنی بڑھ جاتی تھی تو یہ دشمنی نسل در نسل چلتی رہتی تھی۔ ناول ''پنجر'' میں پارو کو رشید اُن کی خاندانی دشمنی کی وجہ سے ہی اغوا کرتا ہے۔ کیونکہ پارو کے ایک چچا نے رشید کی بوا کو زبردستی اغوہ کر کے تین رات رکھا تھا۔ اب رشید کو خاندان کی طرف سے

حکم ہوا ہے کہ وہ پارو کو اُٹھا لے اور اپنے دادا کو دی قسم پوری کرے۔ اسی طرح ۱۹۴۷ء کی تقسیم میں پنجاب کے سبھی مذاہب کے لوگوں نے ایک دوسری کی بہو، بیٹیاں قبضہ لی تھیں۔

ناول ''سفید خون'' میں پنڈت رادھے کشن پہلے گوردئی کے سونے کے زیور بڑے طریقے سے لوٹتا ہے اور پھر انسپکٹر خواجہ کی مدد سے گوردئی کو تاراچند کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور پالا سنگھ، بچن سنگھ کی محبوبہ ''سندری'' پر آنکھ رکھتا ہے اور اُس کو اغوا کرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پنجاب میں عورت کی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اکثر وہ دشمنی کا شکار ہوتی تھی ناول ''پنجر'' میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی لڑکی اٹھالی تھی تو مسلمانوں نے لڑکی کے بدلے لڑکی اٹھا کر بدلہ لیا۔ بے شک اُس وقت پنجاب میں ہندو، مسلم اور سکھ اکھٹے رہتے تھے۔ لیکن ان میں ایکتا کی کمی تھی۔ ناول ''پنجر'' میں جب پارو پگلی کی موت پر اُس کے ننھے بچے کو اپنا لیتی ہے تو گاؤں میں کانا پھوسی شروع ہو جاتی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''جوڑ کر رکھے ہوئے اُپلوں میں جیسے دھیرے دھیرے آگ سلگتی ہے۔ گاؤں میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ پگلی ہندو تھی۔ اس کے بچے کو مسلمانوں نے سنبھال لیا ہے پورے گاؤں کو دیکھتے دیکھتے مسلمان بنالیا ہے۔''

(ناول ''پنجر''، ص۴۸)

ملک کی آزادی میں پنجابیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا اور جان کی قربانیاں دی تھیں۔ ناول ''سفید خون'' کے بچن سنگھ نے بھی آزادی کی اس لڑائی میں حصّہ لیا اور جلیاں والے باغ میں ہو رہے ایک جلسہ میں یہ نظم پڑھی۔ جس کو خوب سراہا گیا۔

تیرے چرناں دی سوں اے ہند ماتا

تیری سیوا وِچ زندگی لگا دِیاں گا

پھر کے دیس دی گلی محلیاں وچ

میں کُریتیاں سب مٹا دیاں گا

مطلب: اے بھارت ماں۔ میں تیرے چرنوں کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں کہ میں

تیری خدمت میں ساری زندگی صرف کردوں گا اور ملک کے گلی گلی کوچے میں

گھوم کر سب برائیوں کو مٹا کر رکھ دوں گا۔

(ناول ''سفید خون''، ص۵۴)

پنجاب کی عورتیں عجیب وغریب قسم کے وہم و برہم میں الجھی ہوئی ہیں۔ ناول ''پنجر'' میں امریتا پریتم نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں کی عورتیں بیٹا پانے کے لئے بدھو ماتا کی پوجا کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہر بچے کو جنم دینے کے لئے بدھو ماتا آتی ہے۔ اگر بدھو ماتا اپنے پتی سے ہنستی کھیلتی چلی آئے تو اُسے جانے کی جلدی ہوتی ہے اور وہ جلدی میں بیٹی بنا کر چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے شوہر سے جھگڑا کر آئے تو اُسے واپس جانے کی جلدی نہیں ہوتی اور وہ آرام سے یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہے اور بیٹا بناتی ہے۔ اِسی وجہ سے بچے کی پیدائش سے پہلے یہاں کی عورتیں بدھو ماتا کی پوجا کرتی ہیں۔

نشے کا زہر پنجاب کے ہر کس و ناکس ماضی میں بھی پیوست تھا اور آج بھی ہے کہتے ہیں کہ پنجابیوں کی کوئی بھی خوشی شراب کے بغیر ادھوری ہوتی ناول ''سفید خون'' کا پالا سنگھ اور اس کے ساتھی گوروادے میں بیٹھ کر بھائی جی کے ساتھ شراب پیتے ہیں۔

پنجاب کے لوگ بڑے مذہبی مانے جاتے ہیں۔ سکھ حضرات روزانہ گوروارے، مسلمان مسجد میں اور ہندو مندر میں جاتے ہیں۔ اسی طرح سکھ اور ہندو شادی کے وقت پھیرے لیتے ہیں جبکہ مسلمان نکاح کرتے

ہیں۔ ناول ’’پنجر‘‘ میں جب رشید پارو کو اٹھا لاتا ہے تو وہ اُس سے نکاح کرتا ہے۔ اسی طرح ناول ’’سفید خون‘‘ میں بچن سنگھ سندری کو پھیرے لے کر اپنے گھر لانے کی بات کرتا ہے۔ بلا وجہ کوئی کسی کے مذہبی عقائد کی مخالفت نہیں کرتا۔

پنجاب کا سماج ذات پات میں بٹا ہوا ہے اور اونچ نیچ کا شکار ہے۔ ناول ’’سفید خون‘‘ میں سندری ایک مداری روڈو کی لڑکی ہے جس کی وجہ سے اُس کو گوروارے کے اسکول میں پڑھنے نہیں دیا جاتا۔ اس کے علاوہ اُس کو گوروادے میں بھی داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسی طرح ناول ’’پنجر‘‘ میں پگلی غریب گھر کی بیٹی ہے۔ جو حالات کی ستائی ہوئی اور ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ پگلی در در ماری پھرتی ہے۔ اسی بیچ کوئی شیطان پگلی کی لاچاری کا فائدہ اٹھا کر اُسے حاملہ کر دیتا ہے۔ لیکن کوئی اس کی مدد نہیں کرتا صرف پارو واحد فرد ہے جس کو پگلی کی فکر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پنجاب کے انسانوں میں انسانیت ختم ہو گئی ہے۔

جب پنجابی بہت خوش ہوتے ہیں تو وہ خوشی میں ناچتے ہیں۔ اس موقعہ پر لڑکیاں گِدھا اور لڑکے بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ ناول ’’پنجر‘‘ میں بیساکھی کے تہوار کے موقع پر لڑکیاں گِدھا ڈال کر اور لڑکے بھنگڑا پا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں لکھتے ہیں:

پنجابی سے اردو میں درآمد ناولوں میں اجیت کور کے ناول ’’گوری‘‘ کو انفرادیت حاصل ہے۔ اس ناول میں انہوں نے ہندوستان کے دو مختلف علاقوں کے تہذیبی و ثقافتی عناصر پیش کئے ہیں۔ اس ناول کی کہانی کا آغاز وسط ہندوستان کے ایک بنجر، ریتلے اور انتہائی پسماندہ علاقے میں ہوتا ہے۔ جو بڑودہ اور نرمدا ندی کے درمیان آباد ہے۔ یہ علاقہ انتہائی غربت کا شکار ہے۔ یہاں کی زمین ریتلی اور بنجر ہونے کی وجہ سے یہاں پر کوئی فصل نہیں ہوتی۔ لوگ گھروں میں بکریاں پالتے ہیں اور یہاں پر صرف ایک ہی قسم کا درخت ہی اگتا ہے جس

کے تنوں سے عجیب قسم کا پانی نکلتا ہے۔ جو کھٹا میٹھا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ ان درختوں پر برتن باندھ دیتے ہیں اور اس طرح یہ کھٹا میٹھا پانی پیتے رہتے ہیں جسے ناول میں تاڑی کا نام دیا گیا ہے۔ کھانے کے لئے صرف ابلے ہوئے چاول ہیں جو نمک ڈال کر کھائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کے کچھ لوگ باہر دوسری جگہوں پر کام کرتے ہیں۔ انہی کی کمائی سے ان لوگوں کی زندگی چلتی ہے۔ اس خطّے کی عورتوں کی حالت بد سے بتر ہے۔ عورتوں کی قیمت بکری کے برابر ہے۔ لوگ ایک بکری کے بدلے اپنی بیٹی بیچ دیتے ہیں۔ بیٹی کی پیدائش پر گھر میں ماتم چھا جاتا ہے اور بیٹی کی پیدائش کا ذمہ دار صرف اور صرف عورت کو سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے بیشتر مرد بے کار ہیں جو شراب پیتے ہیں اور عورتوں پر ظلم کرتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کے پاس کوئی زیور وغیرہ کچھ نہیں۔ جسم ڈھکنے کے لئے ایک دو ساڑھیاں ہیں۔ اس علاقے میں کوئی سڑک بھی نہیں ہے۔ اس طرح یہ علاقہ زندگی سے پوری طرح کٹا ہوا ہے۔ یہاں کے سبھی لوگ انپڑھ ہیں۔ دور دور تک کوئی اسکول نہیں ہے۔ اجیت کور نے ناول ''گوری'' کا آغاز ایسے خطّے سے کیا ہے جہاں زندگی نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی زندگی جنگلی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول ''گوری'' کے پہلے حصّے میں تہذیب وثقافت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ناول ''گوری'' کے دوسرے حصّے میں اجیت کور نے کلکتہ جیسے مہانگر کی رنگارنگی دنیا کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں پر بھی اجیت کور نے کلکتہ کے تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کو نہیں ابھارا۔ ناول ایک گھر کی چادر دیوار میں جا کر سمٹ گیا ہے اور گوری کی زندگی کے نشیب وفراز کے اردگرد گھومتا ہے۔ اجیت کور نے بنگالی تہذیب کی عورت کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے لکھتے ہیں:

> ''عورتیں چھ چھ گز کی ساڑیوں میں لپٹی سر ڈھانک کر پیشانی پر بڑا سا کم کم کا ٹیکہ لگا کر اندر والے کمروں میں پان سپاری چباتی رہتی ہیں اور گھر کا کام کرتی ہیں، آنے

جانے والوں کے سامنے آنے کا کیا کام۔ بس بیوی کو گھر کی چابیوں کا گچھا تھما دو
جسے وہ اپنی ساڑھی کے پلو سے باندھ کر کندھے سے پیٹھ پیچھے جھلا سکے۔ اس کی
ساری تسلی ساری خودی سارا غرور اسی گچھے میں سما جاتا ہے باقی تو جو مرضی ہے کرتے
رہو۔''

(ناول ''گوری''، ص ٦٧)

ناول میں بنگالیوں کی زبان کا ذکر تو کیا ہے لیکن کوئی جملہ پیش نہیں کیا۔ اجیت کور لکھتی ہیں کہ گوری کو ان کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ ہی بنگالیوں کے رہن سہن پر کچھ لکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی سے اردو میں درآمد ناول اپنے اندر تہذیبی وثقافتی عناصر سموئے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ پنجابی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلاشبہ ہم ان ناولوں کی مدد سے ان خطوں کے تہذیبی وثقافتی عناصر سے رو برو ہو سکتے ہیں۔ پنجابی ناول نگاروں نے نہایت ہی ایمانداری اور حقیقت نگاری سے اپنے ناولوں کے منظر نامے کو ابھارا ہے۔ جس سے ان تہذیبوں کی اچھائیوں اور برائیوں سے ہم رو برو ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

۳۔ زبان و بیان کے حوالے سے

زبان و بیان ناول نگاری کا اہم ترین جز ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ زبان و بیان ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

ناول کو کامیاب بنانے کے لئے اس کے اندازِ بیان کا فطری ہونا بہت ضروری ہے۔

عام طور پر ناول میں سادہ، سلیس اور دل نشین اندازِ بیان کو پسند کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سادگی میں پُر کاری، سلاست میں لطافت اور ادبی چاشنی کا ہونا لازم وملزوم ہے۔ ناول کی زبان ایسی ہو کہ عام قاری کی سمجھ میں آجائے اِسی صورت میں قاری ناول سے لطف اندوز ہوسکتا ہے اور اُسے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ بقول عظیم الشان صدیقی:

> ''اگر یہ درست ہے کہ ناول کی کامیابی کا راز کہانی کہنے کے گر میں مضمر ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ اس گر میں حسن اور تاثرات کہنے کے ڈھنگ اور اسلوبِ بیان ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت کچھ تو خداداد ہوتی ہے اور کچھ خانہ ساز جو مشق سے حاصل ہوتی ہے۔ اسلوبِ بیان ہمارے تابع ہے۔ خیالات کا انحصار مواد قوتِ مشاہدہ وسعت مطالعہ اور مہارت فن پر مبنی ہے۔ چنانچہ مواد جس قدر بہتر ہوگا اور کسی فنکار کا مشاہدہ عمیق مطالعہ جس قدر وسیع اور فن، زبان و بیان پر جس قدر قدرت ہوگی اسی قدر اس کے خیال و بیان میں ندرت جملوں کی نشست و برخواست پر قدرت، ساخت میں دلکشی کلام میں معانی اور الفاظ کے استعمال میں دلآویزی ہوگی اور اس کا فن پارہ ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکے گا۔''

(اردو ناول آغاز وارتقاء (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)، ص ۲۸)

کسی بھی ناول کا مواد چاہے کتنا ہی دلچسپ اور اس کی ترتیب کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو جب تک ناول میں زبان و بیان کی باریکیوں کا خیال نہ رکھا جائے اُس وقت تک ناول نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ پائے گا۔ زبان و بیان کی دلکشی ہی قاری کو ناول سے جوڑے رکھتی ہے۔ ناول نگار واقعات و حادثات سے جو اثر قبول کرتا ہے وہ لفظوں

اور جملوں کے وسیلے سے ہی قارئین تک پہنچتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشاء پردازی ناول نگاری کا بہت اہم اور ضروری جز ہے۔

ناول نگار کو چاہیئے کہ وہ ناول کے واقعات کو ترتیب دینے کے بعد اُس کے فنی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرے۔ وہ یہ دیکھے کہ ناول کی زبان صحیح ہے اور موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ کردار اپنی زبان بولتے ہیں یا اُن کے منہ میں اُس نے اپنے مکالمے تو نہیں رکھ دیئے دوسرے الفاظ میں کرداروں کے مکالمے کرداروں کی خصوصیات کی مناسب سے ہونے چاہیئے ۔یعنی اگر کوئی کسان بولے تو اُس کے منہ سے دیہاتی جملے ہی ادا ہوں۔

پنجابی سے اردو میں درآمد ناولوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پنجابی ناول فنی طور پر ہر پہلو سے مکمل ہیں۔ان ناولوں کی زبان نہایت سلیس،آسان اور پنجابی لہجے سے پُر ہے۔ پنجابی زبان کے ناول نگاروں نے پنجاب کے معاشرتی نظام کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنے کرداروں کی زبان سے پنجابی کے مکالمے ادا کروائے ہیں جس سے ان ناولوں میں پنجاب کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سما گئی ہے۔

یہاں پر یہ بات واضح ہونی ضروری ہے کہ یہ ناول ہمارے پاس اصل پنجابی روپ میں نہیں آئے بلکہ ترجمہ ہو کر اردو میں ہمارے تک پہنچے ہیں۔جس کی بنا پر ان ناولوں کے لب و لہجے اور زبان و بیان میں ترجمہ نگار کی زبان اور اسلوبِ بیان شامل ہے۔مثال کے طور پر نانک سنگھ کے دو پنجابی ناول، پنجابی سے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔جن میں نانک سنگھ کے ناول ''چٹّا خون'' کا ترجمہ اردو کے نامور فکشن نگار رتن سنگھ نے کیا ہے جبکہ نانک سنگھ کے ناول ''پوتر پاپی'' کا ترجمہ پنجاب کے طنز و مزاح نگار رام لعل نابھوی نے کیا ہے۔ دونوں ناولوں کے تراجم کی زبان اور اسلوبِ بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ناول ''سفید خون'' میں رتن سنگھ نے نانک سنگھ کا پنجابی لہجہ برقرار رکھا ہے۔اس ناول کے کرداروں کی زبان میں ٹھیٹ پنجابی الفاظ شامل ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ان کے لہجے میں پنجابی پن برقرار رکھا گیا ہے۔ چند مکالمے پیش خدمت ہیں:

''آیئے جی۔جی آئیاں نوں (خوش آمدید) مہارا کیا بتائیں آن کر کر کے....ہم کو تو سردار جیوا سنگھ کے لڑکے نے مصیبت پا وتی ہے آن کر کر کے....جس دن کا آیا ہے۔ جس دن کا آیا ہے۔ ہمارا کھون سوکھ گیا ہے۔ڈر کے کچھ کہہ بھی نہیں سکدے آن کر کر کے۔کیا کریں۔طاقت والے سات بیس کا سو گنوا لیتے ہیں۔''

(ناول ''سفید خون'' ص۵۹)

اسی طرح یہ جملے بھی ملاحظہ فرمائیں:

''بڑے بزرگوں کا کہنا ہے۔

سُکھا گھوٹن سین میں جیتا کرو بلنبھ
تیتا ہی بہو گُن کرے، کہے شو شمبھو آپ ''

(ناول ''سفید خون'' ص۶۳)

جبکہ ناول ''پوتر پاپی'' کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول پنجابی کا نہیں اردو کا ہے یعنی مترجم نے ترجمہ کرتے وقت ناول کا پنجابی لہجہ اور زبان بالکل ختم کر دی ہے۔ چند مکالمے پیش خدمت ہیں:

''وینا'' اس نے دل مضبوط کر کے کہا۔

''ہاں جی''

ایک بات مانو گی''

''بتائیں۔''اور دینا نے خوف اور شک بھری نظر سے ایک دفعہ پھر اس کے منہ کی

طرف دیکھا۔

''وعدہ کرو دینی''

''کس بات کا وعدہ''

''پتا جی کی بیماری کا حال ابھی بے جی کو نہیں بتاؤ گی۔''

(ناول ''پوتر پاپی''،ص۱۳۶)

جب کوئی غیر فکشن نگار کسی ناول کا ترجمہ کرتا ہے تو وہ اُس ناول کے مکالموں اور اسلوب بیان سے انصاف نہیں کر پاتا۔جس سے ناول کی زبان اور اسلوب بیان متاثر ہوتا ہے۔اس لئے کسی بھی ناول کا ترجمہ کرتے وقت اُس کے مکالمے کو ویسے ہی لکھا جائے جیسا اصل میں ہیں۔

نانک سنگھ کا تحریر کردہ ناول ''سفید خون'' پنجابی ادب کا ایک شاہکار ناول ہے۔نانک سنگھ کو ناول نگاری کی صنف پر بلا کا کمال حاصل تھا۔اس ناول کی زبان آسان اور عام فہم ہے اور اسلوبِ بیان نہایت ہی دلکش ہے۔ناول کے کردار اپنی دیہاتی زندگی کے بہترین عکاس ہیں۔مکالمے چست اور جاندار ہیں۔ناول کے کردار اپنی حقیقی زبان بولتے ہیں۔انہوں نے ناول کے ہندو،مسلم اور سکھ کرداروں کے مکالمے اس بخوبی سے قلم بند کئے ہیں کہ کردار کا خاکہ خود بخود آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

خوشی کے موقعوں پر تحریر ہلکی پھلکی اور غمی کے اظہار کے لئے سنجیدہ ،پُر جوش اور درد بھری ہو جاتی ہے۔ نانک سنگھ کے اندازِ بیان کی ایک اہم خوبی اُن کا ڈراماٹک ایرانی یا ڈھکے چھپے طنز کا باکمال استعمال ہے۔ناول میں ایک ساتھ کئی کہانیاں چل رہی ہیں لیکن ناول کے واقعات کو اس طرح لڑی میں پرو دیا گیا ہے کہ کہیں بھی قاری کو مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔لیکن ناول کے مطالعہ کے دوران کئی پہلو غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مثلاً بچن سنگھ

اور سندری ایک دوسرے کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ ناول میں کئی صفحات کے تقریباً دس خطوط شامل کئے ہیں جن کی وجہ سے ناول میں بوجھل پن اور بوریت محسوس ہونے لگتی ہے۔

امریتا پریتم کا ناول ''پنجر'' ہر پہلو سے کامیاب ترین ناول ہے۔ موصوفہ ناول نگاری میں اختصار کی قائل نظر آتی ہے۔ امریتا ناول کو طویل کرنے کی غرض سے اس پر بلا وجہ واقعات کا بوجھ نہیں ڈالتی۔ وہ ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے کو نہایت سوچ سمجھ کر کاغذ پر اُتارتی ہے اور جوہری کی طرح موتیوں کی طرح سجانے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔ بقول خورشید احمد سوڈھی:

> ''امریتا پریتم کا شمار دنیا کی بہترین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ یوں تو وہ بے حد زود نویس رائٹر تھیں، جن سب کا احاطہ تو کسی کتاب ہی میں ممکن ہے۔ میں ذکر کر رہا ہوں اُن کے عالمی معیار کے ناول ''پنجر'' کا جو درد میں ڈوبی ایک ایسی دل گداز تحریر ہے جسے پڑھنے والا اپنی جنس سے قطع نظر فراموش نہیں کر سکتا۔ ''پنجر'' ناول میں ایک کمال امرتا پریتم کی اختصار پسندی کا بھی ہے۔''
>
> (ماہنامہ روزن انٹرنیشنل، لاہور۔ امرتا پریتم نمبر، ص ۲۵۱)

امریتا بڑی سے بڑی بات کو علامتوں اور استعاروں کی مدد سے چند ہی جملوں کے ذریعے پیش کرنے کا ہنر رکھتی ہے۔ یوں تو ناول ''پنجر'' کی ایک ایک سطر قابل مطالعہ ہے۔ چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جن میں امریتا کا اسلوبِ بیان آسمان کو چھوتا نظر آتا ہے۔

> ''پارو کو ایسا محسوس ہوا کہ سر سے پاؤں تک اُس کا جسم مٹر کی پھلی کی طرح تھا جس کے اندر مٹروں کے صاف ستھرے دانوں کی طرف ایک غلیظ کیڑا اپل رہا ہو۔''
>
> (ناول ''پنجر''، ص ۳۷)

''دن کے دن گزرتے چلے گئے۔ ہر صبح سر اُٹھاتی رہی۔ ہر شام سر جھکاتی رہی۔''

(ناول ''پنجر''، ص۵۳)

''بچہ پارو کا دودھ پیتا رہا۔ پارو کا دل ہٹ کی بالٹی کی طرح بھرتا رہا اور خالی ہوتا رہا۔''

(ناول ''پنجر''، ص۷۰)

''پارو دن کی روشنی میں حمیدہ بن جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں پارو ہوتی تھی۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ وہ اصل میں حمیدہ ہے نہ پارو......وہ صرف ایک ڈھانچہ ہے جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ کوئی نام....''

(ناول ''پنجر''، ص۸۳)

''پنجر'' بیانیہ کی تکنیک میں لکھا گیا ایک لازوال ناول ہے۔ جس کی زبان پنجاب کے دیہاتی ماحول کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ناول کا اسلوبِ بیان نہایت ہی دلکش ہے۔

اجیت کور پنجابی ادب میں بے باک اور منفرد لب و لہجے کی ناول نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اُن کے لہجے میں سختی اور سوچ میں بلا کی بے باکی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ناول ''گوری'' کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

''کتیا کنجرنی اندر آتی ہے سیدھی طرح یا توڑوں تیری ہڈیاں...'' گوری کو اپنے کمرے کی طرف گھسیٹا شنکر گرجا۔

گوری کی آنکھوں میں ذبح ہو رہے بکرے کی سی لاچاری اور سہا ہوا اٹھّٹھہ خوف تھا۔

اس کا پورا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا منہ دہشت سے کھلا رہ گیا تھا، حلق میں آواز پھنس گئی تھی۔

کچن کے دروازے کی چٹخنی کو پکڑ کر اس نے اپنے بچاؤ کی ناکام سی کوشش کی مگر شنکر کے ایک ہی جھٹکے سے اس کے ہاتھ میں کھرونچے آ گئے۔

(ناول ''گوری''، ص ۷)

ناول کے آغاز کے یہ جملے قاری کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور ناول کے کردار شنکر کے مکالمے قاری کو جہاں دہشت زدہ کر دیتے ہیں وہیں شنکر کا کردار پوری طرح اُس کے دماغ میں اپنا عکس بنالیتا ہے۔

اجیت کور کا اندازِ بیان بالکل جدا ہے۔ وہ اپنی بات کہتے ہوئے کسی طرح کی جھجک، ڈر اور شرم محسوس نہیں کرتی۔ اُس کے کردار گندی گندی گالیاں بکتے ہیں۔ چند جملے اور پیش خدمت ہیں۔

''ماں؟ کتیا حرام زادی ماں بتاتی ہے اپنے آپ کو میری۔ س لیے ماں بن بیٹھی ہے کیونکہ میرے باپ کا بستر گرم کرتی رہی ہے۔ رنڈی طوائف میرا باپ خرید کر لایا تھا تجھے۔ تیرے کمینے باپ سے میرے باپ نے خریدا تھا تجھے کتیا۔ تیرے ساتھ منہ کالا کرنے کے لیے۔ میرے نانا کے پیسوں سے خریدا تھا تجھے اور تو میری ماں کی چھاتی پر مونگ لیتی رہی اور وہ حرامی باپ رات کو تیرے کمرے میں جا گھستا تھا، چوروں کی طرح حرام زادہ میں نے خود دیکھا کئی بار۔ اور تو اسی ناطے میری ماں بن بیٹھی ہے۔ کنجرنی۔'' (ناول ''گوری''، ص ۸)

ناول ''گوری'' بیانیہ کی تکنیک میں لکھا گیا ناول ہے۔ ناول کا زیادہ تر حصّہ اجیت کور نے خود ہی بیان کیا ہے۔ کرداروں کی زبان سے مکالمے بہت کم ادا کروائے گئے ہیں۔ ناول میں کردار ''گوری'' پورے ناول میں صرف ایک جملہ ادا کرتی ہے۔ اسی طرح ناول کے اور بھی بہت سے کردار مکالمے نہیں ادا کرتے۔ لیکن ناول پڑھتے وقت مکالموں کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ ناول کا انداز بیان بہت عمدہ ہے۔

اجیت کور کی تحریر میں ڈراماٹک انداز پایا جاتا ہے۔ ناول کے زبردست آغاز کے بعد ناول کی کہانی میں دھیما پن آجاتا ہے۔ کہانی بیک گراؤنڈ میں چلی جاتی ہے اور اجیت کور تاریخی اور جغرافیائی پہلو سے جس خطّے کی

کہانی پیش کرتی ہے اُس کا تعارف کرتی ہے۔ ناول کا آغاز بڑودہ اور نرمدا ندی کے درمیان اجاڑ سنسان علاقہ میں آباد ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہوتا ہے۔ جس سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اجیت کور ناول لکھنے سے پہلے اپنے موضوع کو خوب جانچتی پرکھتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ناول لکھنے سے پہلے اس خطّے کا خوب اچھی طرح سے مشاہدہ کیا ہوگا۔ انھوں نے اُس علاقے کے ایک ایک پہلو کو بڑی باریکی سے نوٹ کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے اُن کے ناول کا اسلوب بیان دلکش ہی نہیں، تاریخی و جغرافیائی پہلو بھی ہے۔

امریتا پریتم کی مانند اجیت کور بھی اختصار کی قائل ہے۔ وہ جزئیات نگاری کا سہارا لے کر ناول کو طویل کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اُن کے ناول میں ایک بھی غیر ضروری جملہ نظر نہیں آتا۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار ناول کو طویل کرنے کی غرض سے بات کو ادھر سے ادھر، اُدھر سے اِدھر گھما رہا ہے۔ اجیت کور کو زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔ ناول ''گوری'' کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں عام فہم محاورے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ذبح ہو رہے بکرے کی سی لاچاری'' (ناول ''گوری''، ص ۷)

''چھاتی پر مونگ دلتی رہی۔'' (ناول ''گوری''، ص ۸)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں زبان و بیان کے لحاظ سے اجیت کور کا ناول ''گوری'' لاجواب ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی سے اردو میں درآمد ناول زبان و بیان کے لحاظ سے کامیاب ترین ناول ہیں۔ پنجابی کے ان ناول نگاروں نے اپنے موضوع کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان ناولوں کا اسلوبِ بیان فطری ہے۔ پنجابی کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں غیر ضروری عناصر کی

بجائے ضروری اور اہم عناصر کو توجہ دی ہے۔

☆☆☆

ماحصل

دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح پنجابی نے بھی ناول نگاری کی صنف انگریزی ادب سے اخذ کی ہے۔آج پنجابی ناول اپنے ابتدائی دور کے مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے بامِ عروج تک آ پہنچا ہے۔ بلاشبہ پنجابی ادب کے قلم کاروں کی جانب سے تحریر کردہ ناول عالمی سطح پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اُردو اور پنجابی کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔حافظ محمود شیرانی کے مطابق اردو کا جنم پنجابی زبان سے ہی ہوا ۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ محققین کو شیرانی کے اس نظریے سے اختلاف ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو نے پنجاب کی ہی پُر سکون فضا میں پرورش پائی ہے۔جس کی مثال اردو اور پنجابی کے بے شمار الفاظ ، تراکیب اور محاورے ہیں جو مشترکہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔اردو اور پنجابی کے آپسی میل جول کی ایک اہم مثال شاہ مکھی ہے۔ پاکستان میں آج بھی کروڑوں لوگ پنجابی اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں جسے شاہ مکھی کہا جاتا ہے۔

آزادی سے پہلے مشترکہ پنجاب کے حوالے سے بات کی جائے تو پنجاب اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور لاہور کو اردو کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ پنجابی ،اُردو ،عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔لیکن آزادی کے بعد پنجاب کی تقسیم نے اس خطّے کا سماجی ،معاشی اور ثقافتی نظام ہی درہم برہم

کر دیا۔ ہندوستان کے حصّے میں آئے پنجاب کو مشرقی پنجاب کا نام دیا گیا۔

مشرقی پنجاب میں اردو کی حالت قدر رحم ہے یہی نہیں بلکہ اردو کی مقبولیت مشرقی پنجاب میں ختم ہونا شروع ہوگئی ہے۔ علاوہ ازیں اردو اور پنجابی کا رشتہ بھی کمزور ہونا شروع ہوگیا ہے۔ لیکن دونوں زبانیں اپنی چال چلتی رہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اردو اور پنجابی کا شمار آج دنیا کی اہم ترین زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی اردو اور پنجابی کا ادب دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے مقابلے میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔

لیکن آج پنجابی والوں کے لئے اردو اور اردو والوں کے لئے پنجابی غیر زبان نہیں ہے۔ ان دونوں زبانوں کے ۹۹ فیصد قارئین ایک دوسرے کا ادب پڑھ رہے ہیں۔ اُردو کو مزید مقبولِ عام کرنے کے لئے ترجمہ نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی اردو کی شاہکار کتب کا پنجابی اور پنجابی کی شاہکار کتب کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ یہ ترجمہ نگاری کا کام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی کیا جارہا ہے۔ یہ ترجمہ نگاری کا کام کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ دونوں زبانوں کی ہر صنف کی شاہکار کتابوں کا ترجمہ ہورہا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو سے پنجابی، پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

بے شک انسان کی مصروفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب میں مختصر افسانہ اور افسانچہ نگاری کی صنف بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں آج بھی ناول نگاری کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ افسانے اور افسانچے نے کہانی کو بہت زیادہ محدود کر دیا ہے جب کہ اس کے برعکس ناول کی دنیا بہت وسیع ہے۔ ناول کسی بھی سماج، قوم کے کلچر، مذہب اور ثقافت کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے جبکہ افسانوی ادب کی دوسری اصناف طوالت

برداشت نہیں کر پاتیں۔ بہرحال ناول نثر کی اہم ترین صنف ہے۔اس تیز رفتار دور میں ناول کی مقبولیت میں ضرور کمی آئی ہے لیکن ناول کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے۔ جب بھی تخلیق کار کوئی ناول لکھتا ہے تو وہ اپنے سماج اور معاشرے کی مکمل عکاسی کرتا ہے اور اس طرح ایک جیتا جاگتا سماج ناول میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ناول نگار تاریخ داں سے آگے بڑھ کر کسی تہذیب کے حالات و واقعات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن، کھان پان، رنگ، ڈھنگ، قدرتی بناوٹ، فصلیں، اناج اور آب و ہوا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے ''اردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔اس مقالے کو مختلف موضوعات کے تحت پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

میرے اس مقالے کے پہلے باب کا عنوان ''اردو پنجابی ناول کا ارتقائی پس منظر'' ہے جس کو مزید دو ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس باب کے پہلے ضمنی حصّے میں اُردو ناول کے پس منظر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اسی طرح دوسرے ضمنی حصّے میں پنجابی ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کے مطالعے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کہانی افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ناول کی اہمیت و افادیت آج بھی برقرار ہے اور اردو اور پنجابی میں ناول نگاری کی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔

مقالے کے دوسرے باب کا عنوان'' اُردو سے پنجابی میں درآمد اہم ناول'' ہے۔اس باب میں اردو سے پنجابی میں ترجمہ شدہ تین شاہکار ناول جن میں قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی اور پریم چند کا گئو دان کا تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان ناولوں کا ترجمہ نہایت ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے مطالعہ کرتے وقت کہیں بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ترجمہ نگاروں نے یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا ہے۔

مقالہ کا تیسرا باب ''پنجابی سے اُردو میں درآمد اہم ناول'' ہے۔جس میں پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ تین شاہکار پنجابی ناول جن میں نانک سنگھ کا سفید خون، امرتا پریتم کا پنجر اور اجیت کور کے گوری کا تعارف وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تینوں پنجابی ناول مختلف ادوار میں لکھے گئے ہیں۔ ان ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب کے تک ہی محدود نہیں بلکہ پنجابی ناول نگاروں نے ہندوستان بھر کے مسائل کو اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔سفید خون میں جہاں اپنے علاقائی مسائل کو پیش کیا ہے وہیں امرتا پریتم نے پنجر میں تقسیم وطن کی منظرکشی پیش کی گئی ہے اجیت کور نے اپنے ناول گوری میں جنوبی ہندوستان کے ایک غریب علاقے کی عورتوں کی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ ان صفات کی بنا پر ان تینوں ناولوں کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے ناولوں کے مدمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقالے کے باب چہارم کا عنوان ''مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارنامے'' ہے جس میں پنجابی کے مشہور ومعروف ناول نگاروں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری کے میدان میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور پنجابی میں ناول نگاری کی صنف کو فروغ دیا ہے۔ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس باب میں پنجابی ناول کے تین اہم ناول نگاروں مثلاً نانک سنگھ، امرتا پریتم اور اجیت کور کا تفصیلی طور پر سوانح خاکہ اوان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ تینوں قلم کار ہندوستانی ادب کے عظیم معمار ہیں۔امرتا پریتم کی کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔موصوفہ کا شمار عالمی سطح کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔

مقالے کے پانچویں باب کا عنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔

اس باب کو تین مختلف عنوانات کے تحت ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے ضمنی باب بعنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ: موضوعات کے حوالے سے'' ہے۔ ابتدائی دور کے پنجابی ناولوں میں سکھ مذہب کا رنگ غالب محسوس ہو رہا ہے۔ ناول نگاروں نے سکھ مذہب کے مذہبی کرداروں کے کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔ نانک سنگھ نے پنجابی ناول میں موضوعات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے مذہبی موضوعات کے ساتھ سماجی اور سیاسی پہلو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس باب کے دوسرے ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے تہذیبی وثقافتی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نانک سنگھ کا ناول ''سفید خون'' مشترکہ پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ سماج کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ اسی طرح ناول ''پنجر'' میں جہاں امرتا پریتم نے تقسیم کے درد کو بیان کیا ہے وہیں مشترکہ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے یہاں کا تہذیبی وثقافتی منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے آخری ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے زبان وبیان پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان ناولوں کی زبان نہایت سلیس ہے۔ کردار زمینی حقائق سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کے انسان دیوتا تو نہیں ہیں مگر سادہ لوح ہیں وہ برے کام کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن برائی ان کے اندر زیادہ دیر تک ٹک نہیں پاتی آخر اچھائی کی جیت ہوتی ہے۔ ناول ''سفید خون'' اور ''پنجر'' کی کہانی کا اختتام برائی کے خاتمے پر ہی ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پنجابی ناول، ناول نگاری کے لوازمات پر پورے اُترتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دن بدن مطالعہ کا شوق کم ہوتا جارہا ہے۔ کہانی نے ہمیشہ انسان کی سہولت کے مطابق خود کو بدل ڈالا ہے۔ کہانی داستان، ناول، افسانے سے ہوتے ہوئے افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ان سب کے باوجود ناول نگاری کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ناول آج بھی لکھے جارہے ہیں یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعداد میں کمی آرہی ہے۔

افسانہ یا افسانچہ جہاں زندگی کا صرف ایک پہلو نہیں بلکہ ایک واقعہ پیش کرنے میں معاون و مددگار رہے وہیں ناول کسی ایک تہذیب کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے۔ ناول کسی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ اردو اور پنجابی کے ناول نگار ہمیشہ زندگی سے جڑے رہے ہیں۔ جہاں تک پنجابی ناول کا ذکر ہے تو یہ حقیقت ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر چہ ماضی میں پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب تک محدود تھا لیکن آج ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ وغیرہ تک پھیل گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر جہاں پنجابی ناول نے پوری دنیا کے مسائل کو اپنے اندر سمولیا ہے اور اس کے قارئین کا دائرہ بھی پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔

المختصر مجھے امید ہے کہ میرے اس مقالے سے جہاں ناول نگاری کی صنف کو تقویت ملے گی وہیں دوسری زبانوں کے شاہکار ادب سے دلچسپی رکھنے والے اردو قارئین کو پنجابی ناول نگاری سے واقفیت کا ایک اہم موقع فراہم ہوگا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ نگاری کے ذریعے ہم کسی کی زبان دوسری زبان کے ادب کو پڑھ سکتے ہیں۔ اردو اور پنجابی ترجمہ نگاروں نے اردو سے پنجابی اور پنجابی سے اردو میں شاہکار کتب کو ترجمہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہندوستان کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے مسائل، جذبات اور احساسات سے واقف ہونگی اور معلومات بھی فراہم ہونگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ ترجمہ نگاری کی صنف کو فروغ دینے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

ماحصل

دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح پنجابی نے بھی ناول نگاری کی صنف انگریزی ادب سے اخذ کی ہے۔آج پنجابی ناول اپنے ابتدائی دور کے مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے بامِ عروج تک آ پہنچا ہے۔ بلاشبہ پنجابی ادب کے قلم کاروں کی جانب سے تحریر کردہ ناول عالمی سطح پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اُردو اور پنجابی کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔حافظ محمود شیرانی کے مطابق اردو کا جنم پنجابی زبان سے ہی ہوا ۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ محققین کو شیرانی کے اس نظریے سے اختلاف ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو نے پنجاب کی ہی پُرسکون فضا میں پرورش پائی ہے۔جس کی مثال اردو اور پنجابی کے بے شمار الفاظ ،ترا کیب اور محاورے ہیں جو مشترکہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔اردو اور پنجابی کے آپسی میل جول کی ایک اہم مثال شاہ مکھی ہے۔پاکستان میں آج بھی کروڑوں لوگ پنجابی اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں جسے شاہ مکھی کہا جاتا ہے۔

آزادی سے پہلے مشترکہ پنجاب کے حوالے سے بات کی جائے تو پنجاب اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور لاہور کو اردو کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ پنجابی ،اُردو ،عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔لیکن آزادی کے بعد پنجاب کی تقسیم نے اس خطّے کا سماجی ،معاشی اور ثقافتی نظام ہی درہم برہم کر دیا۔ ہندوستان کے حصّے میں آئے پنجاب کو مشرقی پنجاب کا نام دیا گیا۔

مشرقی پنجاب میں اردو کی حالت قدر رحم ہے یہی نہیں بلکہ اردو کی مقبولیت مشرقی پنجاب میں ختم ہونا شروع ہوگئی ہے۔علاوہ ازیں اردو اور پنجابی کا رشتہ بھی کمزور ہونا شروع ہو گیا ہے۔لیکن دونوں زبانیں اپنی چال چلتی رہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔اردو اور پنجابی کا شمار آج دنیا کی اہم ترین زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی اردو اور پنجابی کا ادب دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے مقابلے

میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔

لیکن آج پنجابی والوں کے لئے اردو اور اردو والوں کے لئے پنجابی غیر زبان نہیں ہے۔ ان دونوں زبانوں کے ۹۹ فیصد قارئین ایک دوسرے کا ادب پڑھ رہے ہیں۔ اُردو کو مزید مقبولِ عام کرنے کے لئے ترجمہ نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی اردو کی شاہکار کتب کا پنجابی اور پنجابی کی شاہکار کتب کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ یہ ترجمہ نگاری کا کام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ نگاری کا کام کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ دونوں زبانوں کی ہر صنف کی شاہکار کتابوں کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو سے پنجابی، پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

بے شک انسان کی مصروفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب میں مختصر افسانہ اور افسانچہ نگاری کی صنف بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں آج بھی ناول نگاری کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ افسانے اور افسانچے نے کہانی کو بہت زیادہ محدود کر دیا ہے جب کہ اس کے برعکس ناول کی دنیا بہت وسیع ہے۔ ناول کسی بھی سماج، قوم کے کلچر، مذہب اور ثقافت کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے جبکہ افسانوی ادب کی دوسری اصناف طوالت برداشت نہیں کر پاتیں۔ بہر حال ناول نثر کی اہم ترین صنف ہے۔ اس تیز رفتار دور میں ناول کی مقبولیت میں ضرور کمی آئی ہے لیکن ناول کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے۔ جب بھی تخلیق کار کوئی ناول لکھتا ہے تو وہ اپنے سماج اور معاشرے کی مکمل عکاسی کرتا ہے اور اس طرح ایک جیتا جاگتا سماج ناول میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ناول نگار تاریخ داں سے آگے بڑھ کر کسی تہذیب کے حالات و واقعات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن، کھان پان، رنگ، ڈھنگ، قدرتی بناوٹ، فصلیں، اناج اور آب و ہوا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے ''اردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔اس مقالے کومختلف موضوعات کے تحت پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

میرے اس مقالے کے پہلے باب کا عنوان ''اردو پنجابی ناول کا ارتقائی پس منظر'' ہے جس کو مزید دو ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس باب کے پہلے ضمنی حصّے میں اُردو ناول کے پس منظر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اسی طرح دوسرے ضمنی حصّے میں پنجابی ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کے مطالعے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کہانی افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ناول کی اہمیت وافادیت آج بھی برقرار ہے اور اردو اور پنجابی میں ناول نگاری کی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔

مقالے کے دوسرے باب کا عنوان ''اُردو سے پنجابی میں درآمد اہم ناول'' ہے۔اس باب میں اردو سے پنجابی میں ترجمہ شدہ تین شاہکار ناول جن میں قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی اور پریم چند کا گئو دان کا تعارف وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان ناولوں کا ترجمہ نہایت ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے مطالعہ کرتے وقت کہیں بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ترجمہ نگاروں نے یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا ہے۔

مقالہ کا تیسرا باب ''پنجابی سے اُردو میں درآمد اہم ناول'' ہے۔جس میں پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ تین شاہکار پنجابی ناول جن میں نانک سنگھ کا سفید خون، امرتا پریتم کا پنجر اور اجیت کور کے گوری کا تعارف وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تینوں پنجابی ناول مختلف ادوار میں لکھے گئے ہیں۔ان ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب کے تک ہی محدود نہیں بلکہ پنجابی ناول نگاروں نے ہندوستان بھر کے مسائل کو اپنے ناولوں کے

ذریعے پیش کیا گیا ہے۔سفید خون میں جہاں اپنے علاقائی مسائل کو پیش کیا ہے وہیں امرتا پریتم نے پنجر میں تقسیم وطن کی منظر کشی پیش کی گئی ہے اجیت کور نے اپنے ناول گوری میں جنوبی ہندوستان کے ایک غریب علاقے کی عورتوں کی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ بلا شبہ ان صفات کی بنا پر ان تینوں ناولوں کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے ناولوں کے مدمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقالے کے باب چہارم کا عنوان ''مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارنامے'' ہے جس میں پنجابی کے مشہور ومعروف ناول نگاروں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری کے میدان میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور پنجابی میں ناول نگاری کی صنف کو فروغ دیا ہے۔ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس باب میں پنجابی ناول کے تین اہم ناول نگاروں مثلاً نانک سنگھ، امرتا پریتم اور اجیت کور کا تفصیلی طور پر سوانح خاکہ اوان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔بلاشبہ یہ تینوں قلم کار ہندوستانی ادب کے عظیم معمار ہیں۔امرتا پریتم کی کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔موصوفہ کا شمار عالمی سطح کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔

مقالے کے پانچویں باب کا عنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ اس باب کو تین مختلف عنوانات کے تحت ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے ضمنی باب بعنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ: موضوعات کے حوالے سے'' ہے۔ابتدائی دور کے پنجابی ناولوں میں سکھ مذہب کا رنگ غالب محسوس ہورہا ہے۔ناول نگاروں نے سکھ مذہب کے مذہبی کرداروں کے کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔نانک سنگھ نے پنجابی ناول میں موضوعات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے مذہبی موضوعات کے ساتھ سماجی اور سیاسی پہلو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس باب کے دوسرے ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے تہذیبی وثقافتی

پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نانک سنگھ کا ناول ''سفید خون'' مشترکہ پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ سماج کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ اسی طرح ناول ''پنجر'' میں جہاں امرتا پریتم نے تقسیم کے درد کو بیان کیا ہے وہیں مشترکہ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے یہاں کا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے آخری ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے زبان و بیان پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان ناولوں کی زبان نہایت سلیس ہے۔ کردار زمینی حقائق سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کے انسان دیوتا تو نہیں ہیں مگر سادہ لوح ہیں وہ برے کام کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن برائی ان کے اندر زیادہ دیر تک ٹک نہیں پاتی آخر اچھائی کی جیت ہوتی ہے۔ ناول ''سفید خون'' اور ''پنجر'' کی کہانی کا اختتام برائی کے خاتمے پر ہی ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پنجابی ناول، ناول نگاری کے لوازمات پر پورے اُترتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دن بدن مطالعہ کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ کہانی نے ہمیشہ انسان کی سہولت کے مطابق خود کو بدل ڈالا ہے۔ کہانی داستان، ناول، افسانے سے ہوتے ہوئے افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ان سب کے باوجود ناول نگاری کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ناول آج بھی لکھے جا رہے ہیں یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعداد میں کمی آ رہی ہے۔

افسانہ یا افسانچہ جہاں زندگی کا صرف ایک پہلو نہیں بلکہ ایک واقعہ پیش کرنے میں معاون و مددگار رہے وہیں ناول کسی ایک تہذیب کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے۔ ناول کسی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ اردو اور پنجابی کے ناول نگار ہمیشہ زندگی سے جڑے رہے ہیں۔ جہاں تک پنجابی ناول کا ذکر ہے تو یہ حقیقت ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ ماضی میں پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب تک محدود تھا لیکن آج ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ وغیرہ تک پھیل گیا ہے۔ نتیجے کے طور

پر جہاں پنجابی ناول نے پوری دنیا کے مسائل کو اپنے اندر سمولیا ہے اور اس کے قارئین کا دائرہ بھی پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔

المختصر مجھے امید ہے کہ میرے اس مقالے سے جہاں ناول نگاری کی صنف کو تقویت ملے گی وہیں دوسری زبانوں کے شاہکار ادب سے دلچسپی رکھنے والے اردو قارئین کو پنجابی ناول نگاری سے واقفیت کا ایک اہم موقع فراہم ہوگا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ نگاری کے ذریعے ہم کسی کی زبان دوسری زبان کے ادب کو پڑھ سکتے ہیں۔ اردو اور پنجابی ترجمہ نگاروں نے اردو سے پنجابی اور پنجابی سے اردو میں شاہکار کتب کو ترجمہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہندوستان کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے مسائل، جذبات اور احساسات سے واقف ہونگی اور معلومات بھی فراہم ہونگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ ترجمہ نگاری کی صنف کو فروغ دینے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

کتابیات

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	پبلیشر	سن
۱	اشرفی وہاب	تاریخ اُردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۱۹۹۵ء
۲	پریتم امرتا	پنجر	سیمانت پرکاشن، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۳	زیدی شمع افروز	اُردو ناول میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۱۹۸۷ء
۴	رئیس، ڈاکٹر قمر	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	
۵	حیدر، قراۃ العین	آگ کا دریا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علیگڑھ	۲۰۱۴ء
۶	عارف صبا ڈاکٹر	اُردو میں ناولٹ نگاری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۰ء
۷	علوی وارث	راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	
۸	سرمست، پروفیسر یوسف	بیسویں صدی میں اُرردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علیگڑھ	۲۰۱۶ء
۹	حسینی علی عباس	اُردو ناول کی تاریخ و تنقید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علیگڑھ	۲۰۱۱ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
۱۰	سنگھ 'نانک	سفید خون	ساہتیہ اکیڈمی' نئی دہلی	۱۹۷۱ء
۱۱	سنگھ 'نانک	پوتر پاپی	بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ	۲۰۰۸ء
۱۲	کور'اجیت	گوری	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۱۳	کُھلر کے کے	اردو ناول کا نگار خانہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۱۴	اختر ڈاکٹر رحمٰن	پنجاب کی نمائندگی (اُردو پنجابی ناول میں)	صاصبر بک ڈپو' مالیر کوٹلہ	۲۰۰۶ء
۱۵	چند گیان	تحقیق کا فن	این سے پی یو ایل' نئی دہلی	۲۰۰۸ء
۱۶	جالبی' ڈاکٹر محمد جمیل	تاریخ اُردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۱۷	اختر ڈاا کٹر رحمٰن	ادبِ تحقیق	تخلیق کار پبلیشرز' دہلی	۲۰۱۳ء
۱۸	سکسینہ، رام بابو	تاریخ اُردو ادب	خاتون مشرق، اُردو بازار، دہلی	۱۹۴۴ء
۱۹	چند پریم	گئودان	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۲۰۱۳ء
۲۰	بیدی راجندر سنگھ	ایک چادر میلی سی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۲۰۱۵ء
۲۱	شیرانی محمود	پنجاب میں اردو	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۱۹۸۲ء
۲۲	رئیس قمر ڈاکٹر	پریم چند شخصیت اور کارنامے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۶۲ء
۲۳	یٰسین محمد ڈاکٹر	ناول کا فن اور نظریہ	خُدا بخش پبلیشرز' پٹنہ	۱۹۸۲ء
۲۴	علی ارشد اعجاز	نظیر احمد کی ناول نگاری	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۲۵	اقبال' ڈاکٹر محمد	تنقید و تاثر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۱ء
۲۹	جمیل' ڈاکٹر محمد	قدیم شعرائے مالیر کوٹلہ	نواب شیر محمد خاں انسٹی چیوٹ' مالیر کوٹلہ	
۳۰	محمد حبیب، انسپکٹر	گلدستہ ءادب مالیر کوٹلہ حصّہ نظم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء

۳۱ محمد حبیب، انسپکٹر گلدستہءادب مالیرکوٹلہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۵ء

حصّہ نثر

۳۲ مالیرکوٹلوی، محمد بشیر افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۵ء

۳۳ سکسینہ، رام بابو تاریخ اُردو ادب خاتون مشرق، اُردو بازار، دہلی ۱۹۴۴ء

پنجابی کتب

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	پبلیشر	سن
۱۔	راہی، جوگیندر سنگھ	پنجابی ناول	امرتسر	۲۰۰۶ء
۲۔	کور، ڈاکٹر بے انت	اجیت کور دا گلپ	چیتنا پرکاشن، لدھیانہ	۲۰۰۹ء
۳۔	کور، اجیت	خانہ بدوش	نویوگ پرکاشن، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۴۔	سنگھ، برہم جوگیندر	نانک سنگھ دی ناول رچنا	روہی پرکاشن، امرتسر	۲۰۱۶ء

رسائل

نمبر	رسالہ	ایڈیٹر/ مدیر/ مدیر اعلیٰ	پبلیشر	سن
۱۔	پروازِ ادب دوماہی	مدیر اعلیٰ: رجنیش کمار	بھاشا وبھاگ، پٹیالہ	مارچ ۱۹۷۹ء
۲۔	پروازِ ادب دوماہی (سلور جبلی نمبر)	مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر مدن لال	بھاشا وبھاگ، پٹیالہ	جنوری۔جون ۲۰۰۴ء
۳۔	پروازِ ادب دوماہی (گولڈن جوبلی نمبر)	مدیر اعلیٰ: اشرف محمود نندن	بھاشا وبھاگ، پٹیالہ	نومبر۔دسمبر ۱۹۹۹ء
۴۔	پروازِ ادب (ناشر نقوی نمبر)	مدیر اعلیٰ: اشرف محمود نندن	بھاشا وبھاگ، پٹیالہ	جولائی۔اگست ۲۰۰۹ء
۵۔	فکر و تحقیق۔جلد ۱۹، شمارہ ۲	پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)	نئی دہلی	۱۱ اپریل۔جون ۲۰۱۶
۶۔	ماہنامہ اُردو دُنیا	مدیر: کریم ارتضیٰ	قومی کونسل، نئی دہلی	۲۰۱۵ء
۷۔	تحریک اُردب	مدیر: انور جاوید (خصوصی شمارہ)	وارانسی	اکتوبر ۲۰۱۷
۸۔	مجلّہ پنجاب میں اُردو ادب	پروفیسر زینت اللہ جاوید	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۲۰۰۲۔۲۰۰۱
۹۔	مجلّہ تحقیق نمبر ا	پروفیسر زینت اللہ جاوید	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۱۹۹۴ء

۱۰۔ مجلّہ جدید شعراء مالیرکوٹلہ۔ شخصیت اور فن نمبر	ڈاکٹر زینت اللہ جاوید	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۱۹۹۸ء
۱۱۔ مجلّہ قدیم شعراء مالیرکوٹلہ۔ شخصیت اور فن نمبر	ڈاکٹر محمد جمیل	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۱۹۹۹ء
۱۲۔ مجلّہ مالیرکوٹلہ ماضی حال اور مستقبل نمبر	ڈاکٹر طارق کفایت اللہ	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۲۰۰۹۔۱۰
۱۳۔ مجلّہ نثر نگارانِ مالیرکوٹلہ شخصیت اور فن نمبر	ڈاکٹر طارق کفایت اللہ	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۲۰۰۸۔۰۹
۱۴۔ مجلّہ ہندوستانی فارسی ادب	ڈاکٹر طارق کفایت اللہ	نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ	۲۰۰۶۔۰۷
۱۵۔ ماہنامہ ''روزن'' انٹرنیشنل	(امرتا پریتم نمبر)	گجرات	۲۰۰۶

اردو
تحریک بقائے اُردو
خصوصی شمارہ اکتوبر ۲۰۱۷ء
تحریک ادب
ISSN 2322-0341
گوشۂ
پروفیسر شہاب عنایت ملک
اور
جموں و کشمیر نئی نسل ادب نمبر
مدیر
جاوید انور
A UGC Approved
Urdu Journal S.No. 41078

ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں سماجی شعور

تبسم بانو شاہ (ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، پنجاب)

اُردو فکشن میں مرزا رسوا، پریم چند، عصمت چغتائی، سعادت حُسین منٹو کے ساتھ ساتھ راجندر سنگھ بیدی کا نام سرفہرست ہے۔ جہاں تک بیدی کا سوال ہے وہ ایک عظیم افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے ناول نگار بھی ہیں۔ بحیثیت ناول نگار بیدی نے واحد ناول ''ایک چادر میلی سی'' لکھا جو ۱۳۶ صفحات اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۰ء میں لاہور سے نکلنے والے مشہور ادبی رسالے ''نقوش'' میں شائع ہوا۔ اس ناول کے تعلق سے ہندوستان میں ''ایک چادر میلی سی'' اور پاکستان میں ''مٹھی بھر چاول'' کے نام سے فلمیں بنیں اور انگریزی میں خشونت سنگھ نے I Take this women کے نام سے ترجمہ کیا۔

اس ناول میں ابتدائی سات ابواب میں ہجر کا احوال بیان کیا ہے اور آخری چار ابواب میں وصل کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں زندگی کے جگمگاتے ہوئے جذبات وخیالات کی ترجمانی ہوتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس بیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیدی چیخوف کی طرح بڑی آسانی کے ساتھ بظاہر معمولی اور بے رنگ واقعات کے پیچھے ہوتے بڑے نتیجہ خیز جذباتی اور ذہنی حقائق کو دیکھ لیتے ہیں ان کی کہانیوں میں ان کی ظاہری غیر جانبداری کے پس پردہ ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ اور تصور (vision) ہر لحاظ سے متحرک رہتا ہے۔''

(تاریخ اُردو ادب، وہاب اشرفی، ص ۸۸۴)

بیدی کا یہ ناول اُردو ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں پنجاب کے علاقائی رسم ورواج کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں کم عمر میں عورت کے بیوہ ہونے کے بعد اس کو سہارا دینے کے لیے چادر ڈالنے کی روایت ہے۔ اسی رسم ورواج کو بنیاد بنا کر بیدی نے یہ ناول لکھا۔ چادر ڈالنے کا

مطلب ایسی شادی جس میں عورت کے شوہر کی موت ہونے کے بعد اُس عورت کی شادی شوہر کے بھائی سے کردی جاتی ہے۔ چادر ڈالنے کی رسم پنجاب میں پہلے عام تھی، بیدی نے اس رسم کو سماجی ضرورت بنا کر پیش کیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان کچھ سماجی رشتے ایسے بھی ہیں جنہیں مرد و زن کو اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ جس کی بہترین مثال ناول ''ایک چادر میلی سی'' ہے ڈاکٹر عبات بریلوی یوں رقمطراز ہیں:

''راجندر سنگھ بیدی کا فن اس لحاظ سے اُردو کے لیے مایہ ناز ہے کہ وہ ہماری زندگی کے سارے خدوخال نمایاں کر کے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز، اس کی نگاہ دوررس، دوربین اور اس کا ہر اشارہ معنی خیز اور خیال انگیز ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ اس کا مجموعہ ایک ہی تاثر کے گرد گھومتا ہے اور وہ ہے سماجی بدحالی۔''

(اُردو دُنیا، نئی دہلی، شمارہ نمبر ۹۰، ۲۰۱۵ ص ۲۹)

بیدی نے اس ناول میں پنجاب کے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی کی تصویر کشی کی ہے جس میں ایک طرف انتقام، نفرت اور رقابت کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اور دوسری طرف محبت، ایثار اور ہمدردی کے باہمی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول پنجاب کی دیہی زندگی کا مختصر لیکن بڑا موثر نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں پنجاب کی دیہاتی فضا، منظر نگاری، سماجی رشتوں کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے پنجاب اور پنجابیت کی تصویر اُبھر آتی ہے اس ناول کے آغاز میں بیدی یوں رقمطراز ہیں کہ:

''وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے وہ اچھا دوست اور بُرا دشمن............... جہاں بھی لوگ تمھیں ایک بلند آواز سے ہنستے، قہقہ لگاتے ہوئے سُنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا کیونکہ وہ دُنیا قائم کرنے نہیں آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے۔ جو اندر سے ہے، وہی باہر ہے۔''

(ایک چادر میلی سی۔ ص ۸)

بیدی نے اس ناول کا آغاز گاؤں کے ایک تاریخی مندر کی یاترا پر عقیدت مندوں کے آنے سے کیا ہے۔ یہ ناول پٹھان کوٹ اور جموں کے سرحدی گاؤں کوٹلہ سے شروع ہوتا ہے۔ کوٹلہ

ہندوستان کے دوسرے گاؤں کی مانند ایک غریب، پسماندہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیوی کے مندر کے سبب اس میں یاتریوں کی چہل پہل رہتی ہے لیکن گاؤں کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی جو بنیادی طور پر افلاس زدہ افسردگی لیے ہوئے ہیں:

> ''کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی۔ چوہدری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیروں کے چنگل سے بچتی بچاتی اس گاؤں میں آنکلتی تھی اور اس جگہ جہاں ایک مندر کھڑا تھا گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیالکوٹ، جموں وغیرہ کی پہاڑوں میں گم ہوگئی تھی اب بھی ڈھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دورِ اُفق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے وہی وشنو دیوی کا پہاڑ ہے۔''

(ایک چادر میلی سی، ص ۸)

رانو اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کو ماں باپ افلاس سے تنگ آ کر روٹی کپڑے کے عوض تلو کے سے شادی کراتے ہیں۔ تلو کا یکہّ چلاتا ہے۔ تلو کا ایک جاہل، جابر، اور بداخلاق انسان ہے جو بات بات پر رانو کو مارتا پیٹتا ہے۔ رانو کا سُسر حضور سنگھ نیک سیرت انسان ہے اور جنداں روایتی ساس کی طرح بات بات پر رانو کو کوستی ہے اور منگل جو رانو کا دیور ہے۔ رانو کی عمر سے کافی چھوٹا ہے، رانو اُسے اپنی بڑی اولاد کی طرح سمجھتی۔ چودھری دھرم داس اور اس کے بھائی گھنشام نے تلو کے کو بد معاشی اور بداخلاق کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اکثر فکشن میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جاگیردار لوگ ظالم ہوتے ہیں اور غریب لوگ مظلوم۔ ان لوگوں نے تلو کے کو غلط راہ پر گامزن کیا۔ ان بدمعاشیوں کے سبب تلو کا قتل ہو جاتا ہے۔ اور پھر رانو کو اپنے دیور جس کو وہ اپنی اولاد کا درجہ دیتی ہے یعنی ''منگل'' سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ وہ آنگن میں پسینی کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے.........
ایک طرف پُرانی سی میلی ٹھلیا پڑی تھی ان سب پر سندور مچل رہا تھا رانو کو جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ مرنے والے آ دیکھ تیری رانی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

آخر منگل ایک ذمہ دار شوہر ثابت ہوتا ہے۔ بیدی نے اپنے تخلیقی فن کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول دیوندر اثر:

> ''ایک چادر میلی سی میں بیدی نے انسانی کرداروں کی پیچ در پیچ شخصیت جذبات اور زندگی کے اقدار کی شکست و ریخت اور لاشعوری قوّت کو زندہ کردار نگاری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا مرقع ہے.......

روزمرہ کے معمولی واقعات اوراحساسات کوفن کی بلندی تک لے جانا انسانی
دُکھ درد کی منھ بولتی تصویر پیش کرنا بیدی کے فن کا کمال ہے۔''

(اُردو ناول میں طنز ومزاح' ص ۳۳۷)

رانو کا کردار بے حد موثر' بلند پایہ' ہمہ گیر ہے رانو کو بیدی نے ایک ایسی صبر وتحمل کی صورت بنا کر پیش کیا ہے کہ ہر طرح کے ظلم و جبر سہنے کے بعد بھی خاموش رہتی ہے اور تلوکا کے مارنے پیٹنے کے بعد بھی موم ہوجاتی ہے۔اس کردار کا تاثر تادیر تک قاری کے دل ودماغ پر قائم رہتا ہے۔بطور بہو، بیوی، ماں، سہیلی کے ایک مثالی کردار ہے اور رانو صفحۂ قرطاس پر جی اُٹھتی ہے۔رانو کے دل میں خوشی کی لہر تب اُٹھتی ہے جب وہ منگل کے بچے کی ماں بنتی ہے۔اب اس کا رشتہ کچے دھاگے سے بندھا رشتہ نہیں تھا۔رانو پورے وقار کے ساتھ مالکن بن جاتی ہے۔ڈاکٹر شمیم نکہت بیدی کے امر کردار کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''رانو ہندوستان کے ہر صوبے، ہر گاؤں، ہر شہر میں اپنی پوری شہنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔اس کا لباس اسکی زبان چاہے مختلف ہو لیکن برکھارت کی قوس قزح کا انت ہمیشہ چھکاؤ کی طرف ہوتا ہے جس پر پابندیوں' محبتوں خلوص' ارمان اور زندگی کی چاہت کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں وہ اپنے رنگوں کی چمک کے پیچھے دھواں چھوڑ جاتی ہے۔''

(اُردو میں ناولٹ نگاری' ص ۱۰۰)

بیدی کے فن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کردار کی ضد پیش کی ہے۔ہر کردار بھر پور اور جاندار نظر آتا ہے اور ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے اور اپنی دلچسپی سے ہمیں جکڑ لیتا ہے۔ اس طرح ہر کردار تقابل سے پوری طرح منفرد انداز میں سامنے آتا ہے۔مختصر الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنداں بدگفتار' سنگدل' بے حس اور بے ضمیر عورت ہے اور اپنی اسی بدکرداری کے سبب ہمیں متاثر کرتی ہے۔لیکن بیدی نے ساتھ ہی تقابل کی غرض سے اس کی مکمل ضد حضور سنگھ خلق کیا ہے جو بے حد نیک سیرت' عاقبت اندیش انسان ہے۔ہم اس کی طرف بے ساختہ کھنچتے چلے جاتے ہیں۔بیدی نے ہمیں تلوکا دیا جو بے حد ترش' اکھڑ' جابر' بداخلاق لیکن بیدی نے تلوکے کی ضد منگل پیش کیا ہے' ہوش مند' دردمند اور اپنے فرائض کے تئیں چوکس اور ذمہ دار' اچھا شوہر' اچھا والد' اچھا بیٹا اور اچھا انسان ثابت ہوتا ہے۔اگر چنوں اور پورن دئی پر نظر ڈالیں تو چنوں اور پورن دئی دوستی' ایثار' خلوص سے دوستی کے معنی عطا کرتی ہیں اور دوستی کے نام پر قاری پر گہری چھاپ چھوڑ جاتی ہیں۔وہیں پورن دئی پُرخلوص تو

ہے لیکن ساتھ ہی منہ پھٹ ہے۔ چودھری ہرنام داس اور اس کا بھائی گھنشام زناکار، بدمعاش ہیں جو مذہب کی آڑ میں معصوم یاتریوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی ضد میں بیدی نے ہمیں وہ بے نام لڑکا یاترن کا بھائی دیا جو دیوی کا بھگت ہے اور گناہ کی تلافی تلوکے کی بیٹی ''بڑی'' سے شادی کر کے کرتا ہے گویا بیدی نے نہ صرف ہر کردار کی ضد پیش کی ہے بلکہ تمام کردار اپنے اپنے مخصوص دائرے میں بھی توانا اور موثر ہیں اور ان سب سے منفرد اس ناول کا مرکزی کردار رانو ہے جو اس فن پارے کی جان ہے، جو از اول تا آخر اس ناول پر چھائی ہے اور اپنی موجودگی کا بار بار احساس دلاتی ہے۔ جب رانو کو منگل سے شادی کرنے پر آمادہ کر لیا جاتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی زہر پی لیتی ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اُسے میکے کی پشت پناہی حاصل نہ تھی رانو کو اس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ آگے تو جیسا تیسا بھی لیکن پیچھے کوئی نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رانو کی آنکھوں میں اپنے معصوم بچوں بالخصوص بالغ ہوئی بیٹی ''بڑی'' کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔

'بیدی نے اس ناول کو پنجاب کے رنگ میں رنگ دیا۔ پنجاب کے لوک گیت' بولیاں' کہاوتیں' شادی بیاہ کے گیت' وارث شاہ اور بلے شاہ کا کلام اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کے رہن سہن' رسومات بھی پنجابی کلچر کی الگ پہچان ہے. جس کی زندہ مثال رانو کی سہیلی چنوں رانو کو جب منگل سے شادی کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور بلے شاہ کا کلام پیش کرتی ہے کہ کہا نہیں بلے شاہ نے:

بلیا رب دا کی ہے پاؤنا ایدھروں پٹنا....اُدھر لاؤنا

پنجاب کے مرد اکھڑ اور عورتیں جھگڑ ہیں۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور خود ہی قانون توڑتے ہیں اور نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ جب رانو اپنی بیٹی بڑی کو پھٹے پرانے کپڑوں میں رکھتی تا کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا ہے تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکار اُٹھتی ہے....

گورا رنگ نہ دئیں وے ربّا

سارا پنڈ ویر پے گیا''

(گورا رنگ نہ دیجو پرماتما! سارا گاؤں بیری ہو گیا)

جہاں بیدی نے کرداروں کی مناسبت سے خوبصورت انداز سے پنجابی جملوں اور کہاوتوں کا استعمال کیا ہے وہیں انھوں نے پنجابی اشعار سے ناول کا سجایا ہے

نشے دی پے بند بوتلے تینوں پین گے نصیباں والے

(ایک چادر میلی سی' ص ۳۵)

اس ناول میں بیدی نے حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ٹھیٹھ پنجابی الفاظ کا استعمال بھی بڑی کثرت سے کیا ہے جیسے اڑیا (ارے) نجروں (نظروں) کھوب شورت (خوب صورت) وغیرہ کا استعمال بڑی کثرت سے کیا ہے اور پھر بیدی نے کرداراں کی بات چیت۔لب ولہجہ، لڑنے جھگڑنے اور ہنسی مزاق کا انداز بھی وہی ہے جو ہم پنجاب کی دیہی عوام کے یہاں پاتے ہیں۔غرضیکہ پنجاب کی دیہی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جسے بیدی نے اس ناول میں اُجاگر نہ کیا ہو۔ڈاکٹر انور سید اس بارے میں بیدی اور پریم چند سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بیدی کے دیہاتی افسانوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تاہم دیہات اس تجربے کا ایک اہم جز نظر آتا ہے۔اس کے افسانوں میں جو پُر خلوص سادگی ہے، وہ دیہاتی معاشرے کی عطا ہے۔وہ انسانی مسائل کو سادہ لوح دیہاتی کی نظر سے دیکھتا ہے۔اس زاویے سے دیکھیے تو بیدی ہمیں پریم چند کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔''

(راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن، ص ۴۰۹)

بیدی کے فن کا کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس ناول میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔فکشن کے تعلق سے تشبیہ ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔تشبیہ سے اظہار کو معنویت، وسعت اور رفعت ملتی ہے۔تشبیہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ موزوں اور مناسب ہو اور اپنے سیاق وسباق میں یوں فٹ بیٹھے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔یہی وجہ ہے کہ بیدی نے تشبیہات کا استعمال کر کے ناول کو دلچسپ دلکش اور موثر بنا دیا۔مثالیں پیش ہیں۔

۱۔منگل کی آنکھیں، اندھیروں کے باوجود ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

(ایک چادر میلی سی۔ص ۵۷)

۲۔وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی کو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔

(ایک چادر میلی۔ص ۴۵)

مختصر اس ناول میں بیدی نے پنجاب، پنجابی اور پنجابیت کو مرکزی تحریر بنا کر سرزمین پنجاب کی شان میں چار چاند لگا دئے۔انہوں نے جس فنکاری سے عصری، سماجی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے ان کی فنکاری کا پتہ چلتا ہے۔ایک چادر میلی سی ایک منفرد حقیقت نگاری کی وجہ سے اُردو ناول کی تاریخ میں ایک مقام کا حامل ہے۔ناول میں بیدی کے خلوص اور اخلاق کا رنگ

نمایاں ہے۔ منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور بیدی بلاشبہ صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔ ایک چادر میلی سی منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس ضمن میں وہ اپنی تخلیقی قوت کو کام میں لاتے تو اُردو کو کئی بلند پایہ ناول بھی دے سکتے تھے۔

کتابیات

نمبر شمار	نام مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سال اشاعت
۱	اشرف وہاب	تاریخ اُردو ادب	نئی دہلی	۱۹۸۰ء
۲	بیدی راجندر سنگھ	ایک چادر میلی سی	نئی دہلی	۱۹۸۶ء
۳	زیدی شمع افراز (ڈاکٹر)	اُردو ناول میں طنز و مزاح	دہلی	۱۹۸۷ء
۴	عارف صبا (ڈاکٹر)	اُردو میں ناولٹ نگاری	دہلی	۲۰۰۰ء
۵	ودھاون جگدیش چندر	راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن	دہلی	۲۰۰۶ء
۶	کریم ارتضیٰ	اُردو دُنیا	دہلی	۲۰۱۵ء

حوالہ جات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مرتب	سنہ اشاعت، ناشر	صفحہ نمبر
۱	اقبالؔ (جامع کے مصنفین کی نظر میں)	گوپی چند نارنگ	۱۹۷۹، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۶۴
۲	اقبالؔ (جامع کے مصنفین کی نظر میں)	گوپی چند نارنگ	۱۹۷۹، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۶۳
۳	ہفتہ رار مومن	.	۲۳ نومبر ۲۰۱۲	۱۰
۴	روزنامہ کشمیر عظمیٰ	پروفیسر بشیر احمد نحوی		
۵	اقبالؔ (جامع کے مصنفین کی نظر میں)	گوپی چند نارنگ	۱۹۷۹، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۶۷
۶	ماہنامہ ترجمان القرآن	پروفیسر خورشید احمد	مئی ۲۰۱۵	۱۰۵
۷	جدید اردو نظم پر یوری اثرات	پروفیسر حامد کشمیری	مارچ ۱۹۶۸ موڈرن پبلکیشن ہاوس	۳۴۴
۸	کشمیر عظمیٰ	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۱۲ اکتوبر ۲۰۱۶	۵

ناول اطالوی زبان کا لفظ 'ناویلا' سے نکلا ہے جس کے معنی نیا کے ہیں۔ یہ ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسانی امنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں۔ گویا ناول حقیقی زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"داستان، افسانے اور ڈرامے کی طرح اس صنف کے مزاج کی تکمیل قصہ پن یا افسانویت سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی معاشرتی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ یعنی ناول نگار کے ذہن میں جو تصویر ہوتی ہے وہ ہوبہو لفظوں میں اتر جاتی ہے"

(اردو ناول آزادی کے بعد: ڈاکٹر اسلم آزاد، ص 9)

جہاں تک پنجابی ناول کے آغاز و ارتقا کا تعلق ہے اس میں دو نظریے سامنے آتے ہیں۔ پہلے نظریے کے مطابق پنجابی ناول بھی دوسری اصناف کی طرح یورپ کی دین ہے۔ دوسرے نظریے کے مطابق پنجابی ناول پنجابی ادب میں صدیوں سے رائج قصہ، جنگ نامہ اور ساکھیوں کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ ان دونوں نظریات کو لے کر پنجابی محققین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال پنجابی ناول کی جدید روپ میں یورپ کے ادب سے متاثر ہو کر وجود میں آیا۔ گوردیال سنگھ سندھو اپنی کتاب 'پنجابی ناول کا اتہاس' میں اس نظریے کے متعلق لکھتے ہیں:

"پنجابی ناول کے جنم کے بارے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ اس کا آغاز انگریزوں کے پنجاب پر قبضہ کرنے اور یہاں اپنا انظام قائم کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے پنجابی ناول کے آغاز کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ اس کا یورپ میں جنم لینے والے ناول کے روپ اور شکل کے ساتھ رشتہ قائم ہوتا ہے۔"

(پنجابی ناول کا اتہاس: گوردیال سنگھ سندھو، ص 12)

پنجابی کا پہلا ناول عیسائی مشنریوں کی جانب سے شائع کیا گیا، جس کا نام 'جیوتر دیو' ہے۔ یہ ناول 1982 میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے 1859 میں ایک ناول نما ترجمہ کردہ تخلیق 'مسیحی مسافر دی یاترا' شائع ہو چکا تھا۔

پنجابی ناول کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جس وقت پنجابی ناول نے آنکھ کھولی اس زمانے میں والٹر سکاٹ کے تاریخی ناول، دیونندن کھتری کی رومانس کتھا 'چندر کانتا' رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے ناول پڑھے جاتے تھے۔

ناول کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر چرن سنگھ کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے 'شراب کور' اور "منڈولی" ناول لکھے۔ بھائی موہن سنگھ نے اپنے ناولوں میں سکھ کرداروں کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ بھائی موہن سنگھ وید نے سماجی ناول تحریر کیے اور نانک سنگھ کا نام بھی ابتدائی ناول نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے انھوں نے پنجابی ناول کو کامیابی کی بلندیوں پر لا کھڑا کیا۔ پنجابی ناول کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پنجابی ناول کا باقاعدہ آغاز بھائی ویر سنگھ کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کے مقابلے میں پنجابی تہذیب و کلچر اور سکھ دھرم کو پیش کرنا تھا۔ بھائی ویر سنگھ نے 17 ویں اور 18 ویں صدی کے سکھوں کی تاریخ کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ بھائی ویر سنگھ کا پہلا ناول 'سندری' ہے اس ناول میں ایک عورت کی کہانی کو بیان کیا ہے گیا جو ہندو دھرم کو چھوڑ کر سکھ دھرم کو اپناتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول 'ستونت کور'، 'بجے سنگھ' مشہور ناول ہیں۔ بھائی موہن سنگھ وید پنجابی ناول کے ابتدائی دور کا دوسرا اہم ناول نگار ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجاب کے زمینی حقائق اور قدروں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر مان سنگھ اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

"وید کے ہاتھوں میں پنجابی ناول دھرم میدان سے سکھ سماج کے ذریعے سماجی مسائل میں داخل ہوتا ہے۔ کرداروں کے روپ میں بھی تبدیلی نمودار ہوتی ہے کیونکہ وید کے کردار عام سکھ اور سماجک کمزوریوں والے کردار ہیں۔ یہ ناول کہانی کی جانب سے رومانس کتھا والے اور پیغام دینے والے ہیں"

(جیت سنگھ سیتل: آدھونک پنجابی ساہت دا آلوچناتمک اتہاس، ص 278)

اس کے علاوہ ہرچرن سنگھ شہید کا پنجابی ناول نگاری

کی دنیا میں اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کس طرح انگریز ہندوستان پر قبضہ جماتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔

پنجابی ناول کے دوسرے دور کو اس کا سنہری دور کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس دور میں پنجابی ناول حقیقت نگاری کی طرف راغب ہوا۔ اس دور کے ناول نگاروں نے روایتی موضوعات کو چھوڑ کر دنیائے ادب کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ دنیا بھر میں تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ پوری دنیا میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان خلیج بڑھ گئی تھی۔ اس دور کے پنجابی ناول نگاروں نے اردو کے ناول نگار پریم چند کی طرح دیہاتیوں اور کمزور و مظلوم کسانوں اور مزدوروں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سب سے اہم نام نانک سنگھ کا ہے۔ نانک سنگھ پنجابی کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کو اپنایا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عصری مسائل مثلاً بے روزگاری، بیوہ کی شادی، چھوت چھات، کم عمر میں شادی وغیرہ کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اس کے علاوہ نانک سنگھ نے پنجاب کی تقسیم پر بھی کئی ناول تحریر کیے جن میں 'آگ کی کھیڈ'، 'منجدھار' اور 'آدم خور' وغیرہ ناول لکھے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں 'کٹی ہوئی پتنگ'، 'ناسور'، 'چٹا لہو'، 'پویتر پاپی'، 'سنگم'، 'خون دے شولے'، 'جیون سنگرام'، 'غریب دی دُنیا'، وغیرہ اہم ناول ہیں۔ 'چٹا لہو' (1932) نانک سنگھ کا مشہور ناول ہے۔ پرنسپل سنت سنگھ سیکھوں (1908-1997) پنجابی کا دوسرا ناول ہے جس نے کسانوں کے مسائل کے لیے آواز بلند کی۔ اس موضوع پر ان کے دو ناول 'لہو مٹی' اور 'بابا آسمان' جیسے ناول منظر عام پر آئے۔ سریندر سنگھ نرولہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مذہبی اور سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔ جن میں 'رنگ محل'، 'دین تے دنیا'، 'جگ راتا'، 'اپنے پرائے'، 'نیلی وار'، 'دِل دریا'، 'اپنے پرائے' وغیرہ ناول ہیں۔ اس کے علاوہ جسونت سنگھ کے نام کو دوسرے ناول نگاروں میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجابی کلچر اور دیہاتیوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح کرنل نریندر پال نے بھی اپنے ناولوں میں زندگی کے تمام مسائل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخی، سماجی اور جنسیات جیسے موضوعات کو قلمبند کیا۔

کرنل نریندر پال سنگھ کا نام بھی اس دور کے اہم ناول نگاروں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے تحریر کردہ تاریخی ناولوں کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ناول 'ملاح'، 'سیناپتی' اور انتالی اہم ناول ہیں۔

پنجابی ناول کے دوسرے دور کے ناول نگاروں میں جنھوں نے پنجابی ناول کو بلندیوں تک پہنچایا ان میں گورچرن سنگھ، گور بخش سنگھ، ایشور چندر نندہ، سنت ایندر سنگھ چکرورتی وغیرہ ہیں۔ گورچرن سنگھ کا اہم ناول 'وگدی سی راوی' اور گور بخش سنگھ کے دو ناول 'ان بیاہی'، 'رُخاں دی جی راند' عصری مسائل کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے دور کے پنجابی ناول نگاروں میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اور تاریخی و مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی اور پنجابی ناول نے ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھائے ہیں۔

> "پنجابی نلول کے موسرے مور کے نلول نگاروں میں جنھوں نے پنجابی نلول کو بلندیوں تک پھنچایا ان میں گورچرن سنگھ، گور بخش سنگھ، ایشور چندر نندہ، سنت ایندرسنگھ چکرورتی وغیرہ ھیں۔ گورچرن سنگھ کا اھم نلول 'وگدی سی راوی' اورگور بخش سنگھ کے دو نلول 'ان بیاھی'، 'رُخاں دی جی راند' عصری مسائل کے موضوعات پرمبنی ھیں۔ اس طرح ھم کھہ سکتے ھیں کہ موسرے دور کے پنجابی نلول نگاروں میں موضوعات کا دائرہ وسیع ھے۔ اور نلریخی ومذھبی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو اپنے نلولوں میں جگہ دی اور پنجابی نلول نے ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھائے ھیں۔"

پنجابی ناول کے تیسرے دور کو ترقی یافتہ دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں پنجابی ناول نے حقیقی دُنیا میں سانس لینی شروع کی۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سوہن سنگھ سیتل کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ماجھے کے دیہاتیوں سے جڑے مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کے ناول 'دیوے دی لو'، 'پت بنتے قاتل'، 'جگ بدل گیا' وغیرہ اہم ناول ہیں۔ جگ بدل گیا پر سوہن سنگھ سیتل کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ناول حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ کرتار سنگھ دوگل کا نام ترقی پسند ناول نگاروں میں سرفہرست ہے۔ کرتار سنگھ کو پنجابی ناول کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار پنجابی ناول میں فرائڈ کے نظریات کو پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع انسانی زندگی کے مسائل ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'اُس دیاں چوڑیاں'، 'ایک دل بکاؤ ہے'، 'دل دریا'، 'پھولاں دا ساتھ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح گردیال سنگھ کے چند مشہور ناولوں میں 'مڑھی دا دیوا'، 'ان ہونی'، 'ریتے دی اک مٹھی' اور 'پرسا' وغیرہ پنجابی ناول کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سرجیت سنگھ سیٹھی بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں لیکن ناول نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کے ناولوں میں 'ریت دا پہاڑ'، 'اک شہر دی گل'، 'ایک خالی پیالہ' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔ سیٹھی کا ناول 'کل سورج چڑھے گا' پنجابی کا شاہکار ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں جلیانوالہ باغ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ موہن کا ہلے پنجابی ناول کے منفرد ناول نگار ہیں۔ ان کے موضوعات میں تازگی ہے۔ ان کے ناولوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار راوی دریا کے کنارے مشرقی پنجاب کے ضلع گرداسپور کے ملاحوں [illegible] اور دوسری جاتیوں کے واقعات و حادثات کو پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں 'مچھلی ایک دریا دی'، 'پردیسی رُکھ'، 'گوری ندی دا گیت' جیسے ناول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ سکھ ویر بھی پنجابی ناول نگاری میں ایک اہم نام ہے۔ ان کے قابل ذکر ناولوں میں 'پانی کا پل'، 'رات دا چہرہ'، 'سڑک تے کمرے'، 'گردش' وغیرہ مشہور ناول ہیں۔

امرتا پریتم کا نام پنجابی ناول میں ہی نہیں بلکہ پورے پنجابی ادب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ موصوفہ نے ناولوں کے علاوہ کہانیاں، شاعری، مضمون نگاری وغیرہ میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ امرتا نے اپنے ابتدائی ناول 'پنجر' میں 1947 کی تقسیم کے دُکھ کو بیان کیا ہے اور بعد میں انھوں نے اپنے ناولوں میں عورت کے مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کے مشہور ناولوں میں 'جے شری'، 'پنجر'، 'آنسو'، 'دلی دیاں گلیاں'، 'جیب کترے'، 'پکی حویلی'، 'اک سوال'، 'بند دروازہ'، 'جلاوطن'، 'آلنھا'، 'کورے کاغذ' وغیرہ شمار کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں

[illegible] خوبصورت انداز میں پیش کیا
[illegible] ناول 'پنجر' ہے۔ تقسیم کے موضوع
[illegible] ہے۔ جو تقسیم وطن کے
[illegible] ہے۔ اس ناول میں امرتا
[illegible] عورت پورو کی داستان کو بیان
[illegible] قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ اس
[illegible] عورت پر مظالم کو اجاگر کیا
[illegible] بن کر رہ جاتی
[illegible] 'پنجر' کے بارے میں خورشید احمد
[illegible]

[illegible] تقسیم کے حوالے سے بہت سے ادبا کی
[illegible] لکھی گئی ہیں لیکن جو مزا اس
[illegible] کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قدرت اللہ
[illegible] پڑھنے پر کرشن چندر کا 'ان داتا'، [illegible]
[illegible] کا ناول 'پنجر' سو فیصد اور حقیقی اور
[illegible] ہے۔ کسی بڑے شاہکار یا عالمی ادب
[illegible] تخلیق کی سب سے بڑی نشانی ہوا کرتی
[illegible] (ص ۲۵۱)

خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے اجیت کور کا
[illegible] ناول نگاری میں بہت اہم مانا جاتا ہے۔ انھوں
نے دوسری خواتین پنجابی ناول نگاروں کی طرح اپنے
ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو پیش کیا۔ لیکن ان کا انداز
دوسری خواتین قلم کاروں سے جدا ہے۔
[illegible] بے باک ناول
[illegible] واقع ہوئی ہیں۔ انھوں
نے اپنے ناولوں میں مرد
[illegible] پر بھرپور چوٹ کی
ہے۔ ان کے مشہور
ناولوں میں 'پوسٹ مارٹم'،
[illegible] 'دھوپ
[illegible]'، 'گوری'، 'اپنے اپنے
[illegible]' اہم ناول ہیں۔ 'گوری'
اجیت کور کا مشہور ناول ہے اس ناول
میں انھوں نے ایک بے بس و لاچار عورت کی
[illegible] کو قلمبند کیا ہے جو ایک بے زبان جانور کی طرح
[illegible] ظلم کو برداشت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی ناول
نگاری کی دنیا میں دلیپ کور ٹیوانا کا نام بھی کافی مقبول
ہے۔ انھوں نے بھی امریتا پریتم اور اجیت کور کی طرح
اپنے ناولوں میں عورت کے جذبات، دکھ درد کو پیش کیا
ہے۔ انھوں نے عورت کے دو روپ پیش کیے ہیں۔ پہلے

روپ میں عورت غلامی کی زنجیروں میں بندھی ہے اور دوسرے روپ میں عورت پڑھی لکھی ہے، جو سماج کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے لگی ہے۔ ان کے ناولوں میں 'ایہو ہمارا جیونا'، 'دوسری سیتا'، 'ہستاخر'، 'لنگ گئے دریا' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بلجیت کور بلی کا شمار بھی پنجابی کے ترقی یافتہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجابی کسانوں کی آپسی دشمنی کو دکھایا ہے۔ ان کا ناول 'تھری رات' بہت مقبول ناول ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ناولوں میں 'اپنے چھاویں'، 'دھوپ کی بات'، 'کوا چے سورج' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہرنام داس سہرائی کا نام پنجابی ناول نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں 'سفید پوش'، 'انوپ کور'، 'ڈاچی'، 'شہادت'، 'بیگم حضور'، 'بابا صاحب سنگھ بیدی'، 'ستلج' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

ہری دلبر نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ تاریخی موضوعات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ ان کے ناولوں میں 'ساون جھل نہ جانا'، 'باری آپو اپنی'، 'حلوار' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے پنجابی ناول نگار ہیں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری میں اہم رول ادا کیا۔ ان میں کرم جیت، ایل گرگ، سریندر سنگھ جوہر، گرکھ سنگھ جیت، بوٹا سنگھ، اوم پرکاش شرما، ایس ساقی، سریندر سنگھ جوہر، گرکھ سنگھ، پریتم سینی، امر سنگھ پٹیل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں بہت سے پنجابی لوگ بہتر روزگار کی جستجو میں اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ممالک میں آباد ہو گئے اور آج پوری دنیا میں خاص کر انگلینڈ، کینیڈا اور امریکہ میں پنجابی لوگ آباد ہیں لیکن انھوں نے اپنی مادری پنجابی زبان کو فراموش نہیں کیا۔ ان دیشوں میں آباد یہ پنجابی لوگ صرف پنجابی بولتے ہی نہیں بلکہ پنجابی لکھتے بھی ہیں۔ ان پرواسی قلم کاروں میں کیلاش پوری کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں انگلینڈ کے مرد اور عورت کے رشتوں کو پیش کیا ہے۔ 'میں ایک عورت ہوں'، 'سوچی روتی رہی' وغیرہ پرواسی زندگی کی بہترین مثال ہیں۔ درشن سنگھ دھیر پرواسی ناول کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا موازنہ کیا۔ ان کے ناول 'گھر تے کمرے' اور 'پیڑاں دے آر پار'، 'اجنبی چہرے'، 'رن بھومی' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پرواسی ناول نگاروں میں سوشیل کور، ندیم پرمار، سورن چندن، سردار نقش دیپ پنج کوہاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں پرواسی پنجابی ناول نگاری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نئے نئے موضوعات کو پنجابی ناولوں میں جگہ دی گئی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہندوستانی پنجاب کے پنجابی ناول کا سرسری طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی ناول مختلف ادوار سے ہوتا ہوا ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آج اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ پنجابی ناولوں کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے مدمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ پنجابی ناول اپنے اندر پنجاب کی تہذیب و ثقافت، یہاں کی زندہ دلی، پنجابیوں کی جوان مردی اور یہاں کے میٹھے پانی کے دریاؤں کی مٹھاس کو اپنے اندر سمائے ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

■

Tabassum Bano Shah
Research Scholar, Dept of Persian, Urdu & Arabi
Punjabi University
NH 64, Urban Estate Phase II, Patiala District
Patiala - 147002 (Punjab)

اُردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، فیکلٹی آف لینگویجز میں پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) اُردو

2018

مقالہ نگار

Tabassum

تبسم بانو شاہ

نگران

ڈاکٹر محمد جمیل

پروفیسر و صدر

شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (پنجاب)

ماحصل

دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح پنجابی نے بھی ناول نگاری کی صنف انگریزی ادب سے اخذ کی ہے۔آج پنجابی ناول اپنے ابتدائی دور کے مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے بامِ عروج تک آ پہنچا ہے۔ بلاشبہ پنجابی ادب کے قلم کاروں کی جانب سے تحریر کردہ ناول عالمی سطح پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اُردو اور پنجابی کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔حافظ محمود شیرانی کے مطابق اردو کا جنم پنجابی زبان سے ہی ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ محققین کو شیرانی کے اس نظریے سے اختلاف ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو نے پنجاب کی ہی پُرسکون فضا میں پرورش پائی ہے۔جس کی مثال اردو اور پنجابی کے بے شمار الفاظ ،تراکیب اور محاورے ہیں جو مشترکہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔اردو اور پنجابی کے آپسی میل جول کی ایک اہم مثال شاہ مکھی ہے۔پاکستان میں آج بھی کروڑوں لوگ پنجابی اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں جسے شاہ مکھی کہا جاتا ہے۔

آزادی سے پہلے مشترکہ پنجاب کے حوالے سے بات کی جائے تو پنجاب اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور لاہور کو اردو کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ پنجابی ،اُردو ،عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔لیکن آزادی کے بعد پنجاب کی تقسیم نے اس خطّے کا سماجی ،معاشی اور ثقافتی نظام ہی درہم برہم کر دیا۔ ہندوستان کے حصّے میں آئے پنجاب کو مشرقی پنجاب کا نام دیا گیا۔

مشرقی پنجاب میں اردو کی حالت قدر رحم ہے یہی نہیں بلکہ اردو کی مقبولیت مشرقی پنجاب میں ختم ہونا شروع ہوگئی ہے۔علاوہ ازیں اردو اور پنجابی کا رشتہ بھی کمزور ہونا شروع ہو گیا ہے۔لیکن دونوں زبانیں اپنی چال چلتی رہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔اردو اور پنجابی کا شمار آج دنیا کی اہم ترین زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی اردو اور پنجابی کا ادب دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے مقابلے

میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔

لیکن آج پنجابی والوں کے لئے اردو اور اردو والوں کے لئے پنجابی غیر زبان نہیں ہے۔ ان دونوں زبانوں کے ۹۹ فیصد قارئین ایک دوسرے کا ادب پڑھ رہے ہیں۔ اُردو کو مزید مقبولِ عام کرنے کے لئے ترجمہ نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی اردو کی شاہکار کتب کا پنجابی اور پنجابی کی شاہکار کتب کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ یہ ترجمہ نگاری کا کام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ نگاری کا کام کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ دونوں زبانوں کی ہر صنف کی شاہکار کتابوں کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو سے پنجابی، پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

بے شک انسان کی مصروفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب میں مختصر افسانہ اور افسانچہ نگاری کی صنف بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں آج بھی ناول نگاری کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ افسانے اور افسانچے نے کہانی کو بہت زیادہ محدود کر دیا ہے جب کہ اس کے برعکس ناول کی دنیا بہت وسیع ہے۔ ناول کسی بھی سماج، قوم کے کلچر، مذہب اور ثقافت کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے جبکہ افسانوی ادب کی دوسری اصناف طوالت برداشت نہیں کر پاتیں۔ بہر حال ناول نثر کی اہم ترین صنف ہے۔ اس تیز رفتار دور میں ناول کی مقبولیت میں ضرور کمی آئی ہے لیکن ناول کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے۔ جب بھی تخلیق کار کوئی ناول لکھتا ہے تو وہ اپنے سماج اور معاشرے کی مکمل عکاسی کرتا ہے اور اس طرح ایک جیتا جاگتا سماج ناول میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ناول نگار تاریخ داں سے آگے بڑھ کر کسی تہذیب کے حالات و واقعات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن، کھان پان، رنگ، ڈھنگ، قدرتی بناوٹ، فصلیں، اناج اور آب و ہوا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے ''اردو میں پنجابی سے درآمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔اس مقالے کو مختلف موضوعات کے تحت پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

میرے اس مقالے کے پہلے باب کا عنوان ''اردو پنجابی ناول کا ارتقائی پس منظر'' ہے جس کو مزید دو ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس باب کے پہلے ضمنی حصے میں اُردو ناول کے پس منظر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اسی طرح دوسرے ضمنی حصے میں پنجابی ناول کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کے مطالعے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کہانی افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ناول کی اہمیت وافادیت آج بھی برقرار ہے اور اردو اور پنجابی میں ناول نگاری کی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔

مقالے کے دوسرے باب کا عنوان ''اُردو سے پنجابی میں درآمد اہم ناول'' ہے۔اس باب میں اردو سے پنجابی میں ترجمہ شدہ تین شاہکار ناول جن میں قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی اور پریم چند کا گئو دان کا تعارف وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان ناولوں کا ترجمہ نہایت ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے مطالعہ کرتے وقت کہیں بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ترجمہ نگاروں نے یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا ہے۔

مقالہ کا تیسرا باب ''پنجابی سے اُردو میں درآمد اہم ناول'' ہے۔جس میں پنجابی سے اردو میں ترجمہ شدہ تین شاہکار پنجابی ناول جن میں نانک سنگھ کا سفید خون، امرتا پریتم کا پنجر اور اجیت کور کے گوری کا تعارف وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تینوں پنجابی ناول مختلف ادوار میں لکھے گئے ہیں۔ان ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب کے تک ہی محدود نہیں بلکہ پنجابی ناول نگاروں نے ہندوستان بھر کے مسائل کو اپنے ناولوں کے

ذریعے پیش کیا گیا ہے۔سفید خون میں جہاں اپنے علاقائی مسائل کو پیش کیا ہے وہیں امرتا پریتم نے پنجر میں تقسیم وطن کی منظر کشی پیش کی گئی ہے اجیت کور نے اپنے ناول گوری میں جنوبی ہندوستان کے ایک غریب علاقے کی عورتوں کی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ ان صفات کی بنا پر ان تینوں ناولوں کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے ناولوں کے مدمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقالے کے باب چہارم کا عنوان ''مشاہیر پنجابی ناول نگاروں کی حیات اور کارنامے'' ہے جس میں پنجابی کے مشہور و معروف ناول نگاروں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری کے میدان میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور پنجابی میں ناول نگاری کی صنف کو فروغ دیا ہے۔ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس باب میں پنجابی ناول کے تین اہم ناول نگاروں مثلاً نانک سنگھ، امرتا پریتم اور اجیت کور کا تفصیلی طور پر سوانح خاکہ اوان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔بلاشبہ یہ تینوں قلم کار ہندوستانی ادب کے عظیم معمار ہیں۔امرتا پریتم کی کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔موصوفہ کا شمار عالمی سطح کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔

مقالے کے پانچویں باب کا عنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ اس باب کو تین مختلف عنوانات کے تحت ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے ضمنی باب بعنوان ''پنجابی سے اُردو میں ترجمہ شدہ اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ: موضوعات کے حوالے سے'' ہے۔ابتدائی دور کے پنجابی ناولوں میں سکھ مذہب کا رنگ غالب محسوس ہورہا ہے۔ناول نگاروں نے سکھ مذہب کے مذہبی کرداروں کے کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔نانک سنگھ نے پنجابی ناول میں موضوعات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے مذہبی موضوعات کے ساتھ سماجی اور سیاسی پہلو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس باب کے دوسرے ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے تہذیبی وثقافتی

پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نانک سنگھ کا ناول ''سفید خون'' مشترکہ پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ سماج کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ اسی طرح ناول ''پنجر'' میں جہاں امرتا پریتم نے تقسیم کے درد کو بیان کیا ہے وہیں مشترکہ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے یہاں کا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے آخری ضمنی باب میں پنجابی ناولوں کے زبان و بیان پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان ناولوں کی زبان نہایت سلیس ہے۔ کردار زمینی حقائق سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کے انسان دیوتا تو نہیں ہیں مگر سادہ لوح ہیں وہ برے کام کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن برائی ان کے اندر زیادہ دیر تک ٹک نہیں پاتی آخر اچھائی کی جیت ہوتی ہے۔ ناول ''سفید خون'' اور ''پنجر'' کی کہانی کا اختتام برائی کے خاتمے پر ہی ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پنجابی ناول، ناول نگاری کے لوازمات پر پورے اُترتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دن بدن مطالعہ کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ کہانی نے ہمیشہ انسان کی سہولت کے مطابق خود کو بدل ڈالا ہے۔ کہانی داستان، ناول، افسانے سے ہوتے ہوئے افسانچے تک پہنچ چکی ہے لیکن ان سب کے باوجود ناول نگاری کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ناول آج بھی لکھے جا رہے ہیں یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعداد میں کمی آ رہی ہے۔

افسانہ یا افسانچہ جہاں زندگی کا صرف ایک پہلو نہیں بلکہ ایک واقعہ پیش کرنے میں معاون و مددگار رہے وہیں ناول کسی ایک تہذیب کو اپنے اندر سمونے کی وسعت رکھتا ہے۔ ناول کسی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ اردو اور پنجابی کے ناول نگار ہمیشہ زندگی سے جڑے رہے ہیں۔ جہاں تک پنجابی ناول کا ذکر ہے تو یہ حقیقت ہے کہ پنجابی ناول کا دائرہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ ماضی میں پنجابی ناول کا دائرہ پنجاب تک محدود تھا لیکن آج ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ وغیرہ تک پھیل گیا ہے۔ نتیجے کے طور

پر جہاں پنجابی ناول نے پوری دنیا کے مسائل کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور اس کے قارئین کا دائرہ بھی پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔

المختصر مجھے امید ہے کہ میرے اس مقالے سے جہاں ناول نگاری کی صنف کو تقویت ملے گی وہیں دوسری زبانوں کے شاہکار ادب سے دلچسپی رکھنے والے اردو قارئین کو پنجابی ناول نگاری سے واقفیت کا ایک اہم موقع فراہم ہوگا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ نگاری کے ذریعے ہم کسی کی زبان دوسری زبان کے ادب کو پڑھ سکتے ہیں۔ اردو اور پنجابی ترجمہ نگاروں نے اردو سے پنجابی اور پنجابی سے اردو میں شاہکار کتب کو ترجمہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہندوستان کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے مسائل، جذبات اور احساسات سے واقف ہونگی اور معلومات بھی فراہم ہونگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ ترجمہ نگاری کی صنف کو فروغ دینے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔